

ہر کسی کے لئے اس کا مذہب مقدس ہوتا ہے۔ تلاش حق کے سفر کی ایک عمدہ داستان



# سفر



ہاشم ندیم

A Gift From:

[www.bookshook.tk](http://www.bookshook.tk)





قارئین کرام!! ہاشم ندیم کے ناول ”عبداللہ“ کی سنڈے میگزین میں اشاعت وحد درجہ مقبولیت کے بعد، ہم نے آپ سے وعدہ کیا کہ اب یہ سلسلہ موقوف نہیں ہوگا، اس ضمن میں متعدد ناولز کے اسکرپٹس زیر غور بھی رہے، لیکن حتمی فیصلے سے قبل ہاشم ندیم ہی کا ایک نیا ناول ”مقدس“ موصول ہوا، جو اپنے بہترین پلاٹ، اہم موضوع اور کرداروں کی بہت کے اعتبار سے بروقت اشاعت کا متقاضی تھا۔ سو، حاضر خدمت ہے، ایک ایک سر منفرد و اچھوتے، لیکن وقت کے اہم ترین موضوع پر مبنی پُر فکر و پُر اثر ناول کی پہلی قسط۔ ہم نے آپ سے کیا وعدہ، آج پورا کیا۔ امید ہے، اب سب گلے شکوے دور ہو گئے ہوں گے۔ آپ کو ہمارا یہ ”سرپرائز“ کیسا لگا، اپنی قیمتی آراء سے بہ ذریعہ خطوط اور ای میلز (سنڈے میگزین کے پتے اور آئی ڈی پر) آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیں گے۔ نیز، ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے بھی ایک آئی ڈی پیش خدمت ہے۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk

(انچارج، جنگ، سنڈے میگزین)

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Scared“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دہمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔

کہتے ہیں شہنشاہ روم نیرو کو جب سزائے موت دی جا رہی تھی تو اس وقت اس نے حسرت زدہ انداز میں تمام مجھے کو دیکھتے ہوئے صرف تین لفظ کہے تھے۔ ”Qualis arlifex perco“ (افسوس دنیا نے مجھ جیسا نایاب صفت کھودیا) کچھ اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار ای انالین لڑکے نے بھی کیا تھا، جسے کچھ دیر پہلے اس کے ساتھی اس کی بیوی بایک سمیت ٹوٹی پھوٹی حالت میں ایک ٹیکرو کی ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ ہم سب اسے وقت نیویارک شہر کے علاقے، مین ہٹن میں قائم دیو قامت کمرشل عمارتوں کے عقب میں موجود ایک سنسان اور اندھیری گلی میں موجود تھے۔ موسم سرد تھا اور دور کسی گھڑیال نے ابھی کچھ دیر پہلے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا تھا۔ تیز بارش نے ہم سبھی کو شرابور کر رکھا تھا اور سنسان ہوا کی وجہ سے سب نے اپنی اپنی جیکٹ اور کوٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔ ہم سب یہاں اس سنسان سی گلی میں ایک کھیل کھیلنے کے لیے جمع ہوئے تھے، جس کا نام تھا ”The Last Survivor“ (آخری فاتح) پہلے یہ کھیل ہم تیرہویں گلی میں اپنے رہائشی پارٹمنٹس کے پیچھے والی گلی میں کھیلنا کرتے تھے، لیکن پھر جب ہمارے بھاری اور طاقت ور موٹر سائیکلز کے پھٹے ہوئے سائیلنڈروں کے بے ہنگم شور نے علاقے کے مکینوں کو آدھی آدھی رات تک جاگنے پر مجبور کر دیا، تو آخر کار ہماری شکایت ہوگئی۔ نتیجتاً ”NYPD“ والوں نے ہمارے سرپرستوں سے بھاری ضمانتیں طلب کر کے ہمیں گھر جانے کی اجازت دی اور اس دن کے بعد سے ہمیں مجبوراً مین ہٹن کی یہ ویران گلیاں چھاننا پڑ رہی تھیں۔ تجارتی علاقہ ہونے کے باعث یہاں سرشام ہی ویرانی چھا جاتی تھی، لہذا یہاں ہماری رات بھر کی ہلڑ بازی کو روکنے یا اس کی شکایت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہاں، البتہ رات دیر گئے گھر لوٹتے وقت، علاقے کے کالے لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اس لیے ہم عموماً چار پانچ کی ٹولیوں میں سفر کرتے۔ اپنے نام کی طرح ہمارا یہ کھیل بھی بہت عجیب و غریب اور جان لیوا تھا۔ ہمیں یہ کھیل کھیلنے کے لیے کسی ایسی جگہ گلی کی ضرورت ہوتی تھی، جہاں سے بہ یک وقت صرف دو ہائیکس ایک ساتھ گزر سکیں، تنگ گلی کے اس آخری سرے کو، جو باہر کھلی سڑک پر کھلتا تھا، ایک آہنی دروازے یا پھر اسی قسم کی کسی مضبوط رکاوٹ کے ذریعے آدھا بند کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح گلی کے سرے سے صرف ایک ہی بایک کے گزرنے کی جگہ باقی رہ جاتی تھی۔ کھیل یہ تھا کہ دو موٹر سائیکل سوار اپنی بیوی ہائیکس کی تمام تر رفتار کے ساتھ، گولی کی سی تیزی سے گلی کے تنگ کونے سے پہلے باہر نکلنے کے لیے ریس لگاتے تھے، ایک سوسٹر یا ایک سواتی کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے، جب یہ جاں باز گلی کے سرے کی طرف سفر کرتے، تو ان میں سے کوئی ایک ہی گلی سے سلامت نکل پاتا تھا، جب کہ متوازن چلنے والا حریف دیوار یا آہنی دروازے سے ٹکرانے کے بعد سیدھا اسپتال پہنچتا اور پھر ہفتوں، اس گریٹر نیو یارک اسپتال کا بل بھرا کرتا، جو ہمارے اس ”میدان جنگ“ سے قریب تر تھا۔ رات گیارہ بجے سے اب تک انالین رومیو اپنی ہڈی پھلی تڑوانے والا تیسرا گھماکھل تھا اور اب آخری فاتح میں دوڑ کی باری میری تھی۔ میرے مقابل جسمی لڑکا ٹم تھا، جو میرے انتظار میں اپنی بایک پر بیٹھا اسے ریس دے کر گول دائرے میں ایک ٹائر پر گھمائے جا رہا تھا۔ اس نے پیش کیا جانے والا ہیلمٹ اٹھا کر دور پھینک دیا۔ مطلب یہ کہ اب مجھے بھی پنا کسی حفاظتی خول کے، یہ مقابلہ لڑنا تھا۔ آس پاس کھڑے دونوں طرف کے حمایتیوں کا شور اور نعرے تیز ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے جیکٹ کی زپ کھینچ کر بند کر دی۔ بارش کی وجہ سے موٹر سائیکل کی تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے باوجود چند فٹ آگے کا منظر بھی دھندلا یا ہوا تھا۔ میں نے اپنی بایک کی چین اور گیمز درست کرتے ہوئے بسام کو ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود جا کر بایک کی سیٹ سنبھال لی۔

میں آیان احمد، امریکن نژاد پاکستانی، جو اپنے بڑے بھائی بسام کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ امریکا منتقل ہونے کے بعد گزشتہ بیس برس میں بہ مشکل بیس دن کے لیے بھی اپنے ملک واپس نہیں گیا تھا۔ ہاں چار سال پہلے جب ممی اور ڈیڈی کا ہائی وے پر کار کے حادثے میں ایک ساتھ انتقال ہوا، تو میں اور بسام ان کی وصیت پوری کرنے کے لیے، ان کے جسدِ خاکی ضرور پاکستان لے گئے تھے، بسام مجھ سے عمر میں یوں تو ایک سال بڑا تھا، لیکن زیادہ تر وہ ہی میرے رعب میں رہتا تھا یا مجھ سے ڈانٹ کھاتا رہتا۔ ممی اور ڈیڈ کے ٹھکانے کے بعد نیویارک میں صرف عارفین ماموں ہی ایک ہمارے بچے تھے، جو گراؤنڈ زیرو کے علاقے میں تنہا رہتے تھے، ماموں، امی کے سب سے بڑے بھائی تھے اور ہم دو بھائیوں سے بہت پیار کرتے تھے، لیکن دنیا کے اس تیز ترین شہر کی برق رفتار زندگی کو بھاتے، ہمیں ان سے بھی ملے، ہفتوں گزر جایا کرتے۔ میں اور بسام شہر کی مرکزی یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رہے تھے۔ بسام شام کو ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتا اور میں آوارہ گردی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کے سارے خرچے اور اگلے تلووں سمیت تقریباً تمام خرچے بھی بسام ہی اٹھاتا تھا۔ محنت کرنا بچپن ہی سے میری سرشت میں شامل نہیں تھا اور ان گوروں کی الٹی سیدھی باتیں تو میں بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے بچپن سے لے کر اب تک بسام کی آدھی زندگی میرے جھگڑے پنپاتے ہی گزری۔ بسام میرا اور اپنا خرچہ اٹھانے کے لیے رات دن محنت کرتا، لیکن مجھے اس کے دیے پیسے ہمیشہ کم ہی لگتے تھے، تو مجبوراً مجھے ایسی الٹی سیدھی شرطیں لگانی اور کھیل کھیلنا پڑتے کہ جن سے میں لمحوں میں ہفتوں کا



خرچہ نکال سکوں اور اس وقت بھی ہم سب اس اندھیری گلی میں ایک ایسی ہی شرط کی پاداش میں جمع تھے۔ یونیورسٹی میں ایک ہم جماعت نے جب مجھے ”لاسٹ سروائیور“ نامی اس کھیل کی شرط اور اسے جیتنے کی صورت میں ملنے والی رقم کا بتایا تو میں نے فوراً ہاں کر دی تھی۔

میں نے بایک کا کھلچ دبا کر اوداعی نظروں سے بسام کی جانب دیکھا۔ بسام نے آخری مرتبہ التجا کی ”اٹو یا رہنے دو..... یہ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ میں اگلے ہفتے اور نائم لگا کر تمہیں کچھ ڈالر مزید دے دوں گا۔“ میں نے مسکرا کر اپنے بھولے بھیا کو منہ چڑایا، اسے بھلا کیا پتا کہ اپنی ”منت کی کمائی“ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے بسام کو مشورہ دیا۔ ”تم سے نہیں دیکھا جا رہا تو آنکھیں بند کر لو۔ آیان اپنی شرط سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ اور بایک کو گیزر میں ڈالے رکھا۔ میں جھنڈی ہلانے والے لڑکے کے اشارے کے انتظار میں بایک کو زور زور سے ایکسی لیٹر دے رہا تھا۔ اس وقت ہم سب نسبتاً ایک کھلی گلی میں موجود تھے اور ٹھیک ہمارے سامنے دو سو گز کے فاصلے پر وہ تنگ گلی شروع ہوتی تھی، جس کے اختتام پر لوہے کی چادریں لگا کر اسے نصف بند کر دیا گیا تھا۔ جو ٹیگروں یہ مقابلے منعقد کرواتے تھے، وہ اپنے پرانے کٹھارا بیڈ فورڈ ٹرک میں یہ تمام سامان لے کر آتے تھے اور علاقہ کا تعین اور باقی تمام انتظامات انہی کے ذمے تھے۔ ہر شرط لگانے والے کو بیس ڈالر کی فیس ان کے پاس پیشگی بھرتا ہوتی تھی۔ تم یہ کہ میں نے اپنی فیس بھی بسام کی جیب سے بھروائی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے ایسے کاموں سے منع کرتا اور آخری لمحے تک میری مدد سے انکار کرتا رہتا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتا، لہذا آخری لمحوں میں ہمیشہ اسے میرے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ آج شام بھی ٹھیک ایسا ہی ہوا اور جب میں بسام سے لڑنے کے بعد اس کے کام والی جگہ سے روٹھ کر مین ہیشن لوٹا تو گھٹنے پھر بعد ہی وہ بھی اس جگہ پہنچ چکا تھا اور ناراض سا کھڑا ٹیگرو کے پاس میری فیس جمع کروا رہا تھا۔

ٹیگرو پارٹی نے کچھ دیر مزید بارش تھمنے کا انتظار کیا، لیکن اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اب تو باقاعدہ گلی میں پانی جمع ہونے لگا تھا اور گلی کے دونوں طرف پچھی لوہے کی جالیوں کے نیچے بنی نالیوں میں سے تیز پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔ آخر کار، فیصلہ ہوا کہ اب مزید انتظار بے سود ہے، لہذا مقابلہ شروع کیا جائے۔ ہمارے سامنے کھڑے نو جوانوں کا ہجوم تیزی سے چھٹ گیا اور سب دیوار کے ساتھ دونوں جانب بنے فٹ پاتھ پر چڑھ گئے۔ جھنڈی دکھانے والا لڑکا چلایا ”تین، دو، ایک.....“ میری اور میرے حریف کی بالیکس یوں اچھل کر تیزی سے آگے کو دوڑیں، جیسے کسی توپ کے دھانے سے دو گولے نکلے ہوں۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی سپر 180 بایک تھی، جب کہ میری بایک کچھ پرانی تھی اور اس کی دیکھ بھال میں اور بسام خود ہی کیا کرتے تھے، دراصل ہم ہی اپنی بایک کے مکینک بھی تھے اور بسام تو اپنی اب تک کی پڑھی تمام مکینیکل انجینئرنگ اس بایک کی رفتار اور کارکردگی بہتر کرنے پر صرف کر چکا تھا۔ چند لمحوں ہی میں میری اور ٹم کی بایک سو کی رفتار کے ہندسے کو چھوٹنے لگی، لیکن اس وقت میں اپنی بایک کے ڈسٹیکٹل میٹر پر جگمگاتے اور تیزی سے بڑھتے نمبر دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، کیوں کہ تنگ گلی میرے بالکل سامنے تھی۔ بہت سے اناڑی سوار تو اس گلی کے آغاز ہی پر دیوار سے ٹکرا کر مقابلے سے باہر ہو جاتے تھے، کیوں کہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اس تنگ گلی میں سیدھے داخل ہونا بھی نہایت مہارت کا کام تھا، خاص طور پر اس وقت، جب آپ کی بایک سے بالکل جڑی دوسری متوازی بایک بھی ٹھیک اسی رفتار سے اڑی چلی آرہی ہو۔ ٹم ایسے مقابلوں کا پرانا اور شاطر کھلاڑی تھا اور اس نے گلی میں داخلے سے قبل مجھے ”جھاکا“ دینے کے لیے اپنی بایک کا اگلا پیہ ذرا ساموڑ کر تیزی سے سیدھا کر لیا تھا، تاکہ میں ڈر کر اس سے چند انچ پیچھے رہ جاؤں، لیکن میں جانتا تھا کہ ٹم ایک دو سیکنڈ سے زیادہ اپنے بایک کے پیسے کو موڑے نہیں رکھ پائے گا، کیوں کہ اس صورت میں وہ خود بھی دیوار سے ٹکرا سکتا تھا، لہذا میں نے بریک پر دباؤ نہیں بڑھایا اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں اس سرگ نما گلی میں ایک ساتھ یوں داخل ہوئے کہ گلی کے فرش پر نائروں کی رگڑ سے فضا میں کئی چنگاریاں لپکیں۔ گلی اس قدر تنگ تھی کہ ہم دونوں کے مخالف شانے تقریباً دیوار کو چھو رہے تھے۔ اس مرحلے پر سوار کا سب سے مشکل امتحان اپنی بایک کو ناک کی سیدھ میں سیدھا رکھ کر آخری گنجائش کی حد تک تیزی سے دوڑانا ہوتا ہے۔ ذرا سی بھی لاپرواہی ہم دونوں کو موت کے منہ میں لے جاسکتی تھی، کیوں کہ ایک بھی سوار گرنے کی صورت میں، دوسرا خود بخود اس کی لپیٹ میں آجاتا اور دیوار سے ٹکرا کر یا موٹر سائیکلوں تلے روندے جانے کے بعد ہمارے پیچھے بھی شاید لوگوں کو نہ ملنے لگی، کا بند کونا ہماری طرف بڑھنے والے کسی میزائل کی طرح لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا، اچانک میں بے خیالی میں ذرا سا بائیں جانب جھکا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بائیں کاندھے پر سے اپنی لیڈر جیکٹ کا ایک ٹکڑا دیوار کی رگڑ سے جھل کر فضا میں اڑتے دیکھا۔ ایک پل ہی میں مجھے اپنے بائیں شانے میں مرجھیں سی بھرتی محسوس ہوئیں اور ٹھیک یہی لمحہ تھا، جب ٹم نے اپنی بایک کی پوری رفتار ایک جھٹکے سے کھول لی۔ اس کی بایک کا اگلا پیہ میری بایک سے چند انچ آگے بڑھ چکا تھا اور ٹم نے کمال مہارت سے اپنی بایک کو گلی سے باہر نکلنے والے سرگ نما راستے کی جانب دھکیلے رکھا۔ سرگ کے دھانے سے باہر کی جانب سے آتی نیلگوں روشنی کا مستطیل ٹکڑا غلا میں بھٹکتے کسی شہاب ثاقب کی طرح ہمارا وجود اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور پھر ٹم کی مہارت نے اثر دکھایا اور اس نے اپنا جسم سکیڑ کر خود کو کسی پیراک کی طرح بایک کی سیٹ پر لٹا لیا اور جس طرح ماہر غوطہ خور اونچائی سے چھلانگ لگا کر پانی کی سطح چیرتے ہوئے اپنے جسم اندر داخل کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح گلی کے سرے سے باہر نیلی روشنی کے سمندر میں پار ہو گیا۔ میں نے پوری قوت سے اگلے اور پچھلے پیہوں کی بریک کو جکڑ لیا، لیکن پھر بھی بایک کو سنبھال نہ سکا، میری بایک ترچھی اڑتی ہوئی بے پناہ طاقت کے ساتھ لوہے کی چادر سے ٹکرائی اور ٹھیک اگلے لمحے میرا جسم بھی اس فولادی رکاوٹ سے متصادم تھا، لیکن میری خوش قسمتی رہی کہ میرے بے توازن جسم کے ٹکرانے سے پہلے ہی میری ہیوی بایک کا تمام تروزن اس فولادی چادر کو صرف ایک سیکنڈ پہلے کافی حد تک ترچھا کر چکا تھا، لہذا میرے ٹکراتے ہی وہ آہنی دروازہ بھی فضا میں اچھلا اور دوسرے ہی لمحے میں فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا، کچی سڑک پر گر کر بے سدھ ہو چکا تھا۔ میری بایک گیلی سڑک پر پھسلتی جانے کس رخ جا کر گئی تھی اور میں زخموں سے پُور بدن کے ساتھ برستی بارش میں نیچے زمین پر پڑا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو سبھی لڑکے میرے ارد گرد جمع تھے اور مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا سر بسام کی گود میں تھا اور وہ پریشانی سے میرے گال تھپتھپا رہا تھا ”آیاں! ہوش میں آؤ، تم ٹھیک تو ہو، بولتے کیوں نہیں.....؟“ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو آسمان سے برستے قطرے میرے آنسو بن گئے۔ ”ہاں ٹھیک ہوں۔ بس کچھ ہڈیاں اپنی جگہ سے سرک گئی ہیں۔“ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دائیں گھٹنے سے بھی خون بہہ رہا ہے اور میری نیلی جینز سرخ ہو چکی ہے، ٹیگرو نے اپنے نام نہاد فرسٹ ایڈ کے کپسے سے میری حتی الامکان مرہم پٹی کر دی تھی، لیکن میرا سارا جسم اب بھی کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، فاتح ٹم نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ”Well Played، تم خوب کھیلے لڑکے، لیکن جانتے ہو، تم آج مجھ سے کیوں ہارے ہو؟“ میں نے سوالیہ انداز میں ٹم کی جانب دیکھا ”کیوں کہ میری بایک کا ماڈل تم سے تین سال پر پرانا ہے۔“ ٹم مسکرایا ”نہیں، بایک کا ماڈل اتنے معنی نہیں رکھتا۔ اصل چیز ہے، Killer Instinct (مارنے کی جہلت) جب تک تمہارے اندر مخالف کو ختم کر دینے کی یہ فطری جہلت پیدا نہیں ہوگی، تب تک تم ادھورے ہی رہو گے۔ جس طرح



جنگل کے درندوں میں اپنے بچاؤ اور بقا کے لیے دوسرے جانور کو چیر پھاڑ دینے کا نظام رائج ہے، ٹھیک اسی طرح ہماری اس نام نہاد تہذیب یافتہ دنیا کا بھی کچھ ایسا ہی اصول ہے۔ میں نے پوری ریس کے دوران یہ محسوس کیا کہ تم اپنے ساتھ ساتھ میری بچت کا بھی سوچ رہے ہو اور یہی تمہاری بنیادی غلطی تھی۔ جیتنے کے لیے دوسرے کو کچل دینے کا جذبہ سب سے ضروری ہوتا ہے۔ اگلی بار جب میرے مقابلے پر آؤ، تو اس حیوانی جبلت کے بغیر نہ آنا۔ شہنشاہ جب اپنی تفریح کے لیے گلیڈ پیٹرز کو اکھاڑے میں بھوکے شیروں کے سامنے اتارتے تھے، تو تب یہی فطری جبلت گلیڈ پیٹرز کو بچاتی تھی، ورنہ اس کی ادھ ٹچی لاش ہی میدان سے باہر جاتی تھی۔“ میں غور سے ٹم کی بات سن رہا تھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ”مارو..... یا مر جاؤ۔“ کا اصول ہی ہمیں فتح کے قریب رکھتا ہے۔ میری بائیک مڑی تڑی سی ایک جانب پڑی تھی اور اس کے ریڈی ایٹر کی گرم بھاپ فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ بسام جب مجھ سمیت بچی کچھی بائیک کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر پارٹمنٹ کی عمارت تک پہنچا، تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے اور بارش تھم چکی تھی۔

اگلے تین دن بسام نے میرے جسم کی سینکائی اور مجھے ڈانٹنے میں گزارے، میری وجہ سے اس کی کلاسز اور شام کے اوور ٹائم کا بھی بہت حرج ہو رہا تھا، لہذا چوتھے دن میں نے اسے زبردستی یونیورسٹی بھجوا دیا، لیکن خود یونیورسٹی واپسی میں مجھے دو ہفتے لگ گئے۔ میری بائیک ابھی تک زیر مرمت تھی، لہذا مجھے یونیورسٹی کے لیے زیر زمین ریل کے سب وے اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی پڑی اور جب میں باہر کھلی فضا میں پہنچا تو چمکیلی دھوپ سے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ یونیورسٹی میں حسب معمول مجھے، میرا گروپ کلاس روم کے بجائے کیفے میں اودھم مچاتا ملا۔ میرے گروپ میں امریکن ایرک اور جم، ایرانی نژاد فرہاد اور کینیڈین جینی شامل تھی اور ہم سب کی قدر مشترک صرف ہل بازی اور زندگی کے ہل پل گزرتے لمحوں کا لطف لینا تھا۔ ”باقی دنیا جائے بھاڑ میں۔“ ہمارا اصول اور ”آئیل..... مجھے مار۔“ ہمارا آئین تھا۔ مجھے دیکھ کر ایرک زور سے چلایا ”ہے آیان..... کہاں رہ گئے تھے میں۔ ہم صبح سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ سب درمیانی عرصے میری عیادت کے لیے لگا تار ہمارے فلیٹ آتے رہے تھے اور میں نے ہی دو دن پہلے انہیں، اپنی آج یونیورسٹی آمد کا بتایا تھا۔ ”بائیک ٹھیک نہیں ہوئی ابھی تک..... ٹرین میں دھکے کھاتا پہنچا ہوں۔“ جم کو اپنے شہر کی کسی چیز کی بھی برائی سخت ناگوار گزرتی تھی، وہ جلدی سے بولا۔ ”نیو یارک کی سب وے ٹرینیں دنیا میں بہترین مانی جاتی ہیں۔“ فرہاد نے اسے جھاڑا۔ ”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ زیادہ طرف داری کرنے کی ضرورت نہیں ہے، امریکن کہیں کے۔“ ہم سب ہنس پڑے۔ جم کو غصہ آ گیا۔ ”تم تو خاموش ہی رہو۔ ہمارا بس چلے تو ہم تمہارے ایران کو پھر سے فارس بنادیں۔“ جینی نے لقمہ دیا۔ ”بس یہیں تو تم امریکن مار کھا جاتے ہو، تم لوگوں کا بس ہی تو نہیں چلتا۔“ ابھی یہ نوک جھونک جاری تھی کہ اچانک یونیورسٹی کے مرکزی احاطے میں کچھ طلباء کی نعرے بازی کا شور گونجا۔ میں نے کیفے کی دوسری منزل سے جھانک کر ڈور مچن میں کھڑے طلبہ کو بینراٹھائے اور نعرے لگاتے دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے؟“ جینی نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ ”تم کیسے پاکستانی ہو، یہ سب تمہارے ہی ملک کی کسی ڈاکٹر کی امریکیوں کے ہاتھ گرفتاری کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ سنا ہے، چند ہفتوں میں اُسے سزا سنائی جانے والی ہے۔“ میں نے بے زاری سے سر ہلایا۔ ”مجھے اپنا ملک چھوڑے بیس سال ہو چکے۔ بھلا میرا وہاں کی روزمرہ خبروں سے اب کیا تعلق؟“ جینی نے اپنے سنہرے بال یوں جھٹکائے، جیسے اُسے بہت افسوس ہوا ہو۔ فرہاد نے فوراً فتویٰ جاری کر دیا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ تم مسلمان بھی ہو یا نہیں۔ اس قدر بے زاری.....“ میں نے فرہاد کو جھاڑ دیا۔ ”اچھا، اب میرا بزرگ بننے کی کوشش نہ کرو۔ اس کام کے لیے میرے عرفی ماموں ہی کافی ہیں۔ چلو، جلدی سے کچھ آرڈر کرو۔ دو ہفتوں سے بسام کی ہاتھ کی بد مزہ کافی پی پی کر میرا تو حلق بھی کڑوا ہو چکا ہے۔“

ابھی ہم کیفے میریا سے ٹکے ہی تھے کہ سامنے سے مسلمان طلبہ کے کاؤنسلر اسٹوڈنٹ عامر بن حبیب کا گروپ یونیورسٹی کے کسی مسئلے کی کاؤنسلنگ کرتا نظر آیا۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر مذہب کے طلبہ کا ایک نمائندہ مقرر تھا، جو خود بھی طالب علم ہوتا اور دیگر طلبہ کے ووٹ سے ہر سال اس کا چناؤ ہوتا۔ اس کاؤنسلر کی ذمہ داری یہ ہوتی کہ وہ اپنے ہم مذہب طلبہ کے مسائل یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کرے اور ان سے مل کر کچھ ایسا حل نکالے، جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ مسلم کاؤنسلر کی طرح عیسائی کاؤنسلر اور یہودی کاؤنسلر بھی یونیورسٹی کے طلبہ ہی میں سے چنے جاتے، لیکن نہ جانے کیوں مجھے انسانوں کو ان مذہبی گروہ بند یوں میں تقسیم کرنا شروع ہی سے بہت بُر لگتا تھا۔ میں ہمیشہ سوچتا کہ انسان کو صرف انسان کی پہچان سے کیوں نہیں جانا جاتا۔ کیا مذہب اور نسل کی یہ تقسیم واقعی اتنی ضروری ہوتی ہے کہ انسانیت کہیں پس منظر میں چلی جائے۔ شاید یہ میری امریکا میں ہوئی پرورش کا اثر تھا کہ میں بھی لاکھوں نوجوانوں کی طرح مذہب کو صرف ایک پابندی کے طور پر نہت رہا تھا۔

آج کل ہماری یونیورسٹی کا مسلم کاؤنسلر معاشیات ڈپارٹمنٹ کے سال آخر کا طالب علم عامر بن حبیب تھا، جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جب ہم اس عرب شیخ کو یوں مختصر قریبی سردیوں یا کڑک دھوپ تلے باقی مسلمان طلبہ کے مسائل حل کروانے کے لیے در بدر جھٹکتے دیکھتے تو ہمیں بہت حیرت ہوتی کہ یہ امیر زادہ کن چکروں میں پڑا ہے۔ میں اور بسام تو ہمیشہ یہی آہیں بھرتے کہ کاش ہمارے پاس اتنا پیسا ہوتا تو ہم ہیوی بائیکس کا ایک شوروم کھول لیتے اور باقی تمام عمر عیش کی زندگی جیتے۔ شاید قدرت جب کسی کو کوئی نعمت بخشی ہے، تو ٹھیک اُسی لمحے اس انسان کے دل سے اس نعمت کی قدر بھی جھین لیتی ہے یا شاید کچھ لوگوں کو ہمیشہ تب ملتا ہے، جب وہ اہمیت کھو چکا ہوتا ہے۔ میری عامر سے یونہی ایک آدھ بار سرسری سی ملاقات ہوئی تھی اور آج بھی میں نے اس کے گروپ کو دیکھ کر رستہ بدل کر نکلنے ہی کی کوشش کی، لیکن عامر نے مجھے دور ہی سے دیکھ کر اپنے مخصوص عربی لہجے میں پکارا۔ ”ہے آیان..... بس دو منٹ.....“ میں بادل نہ خواستہ رک گیا اور عامر سمیت اس کے چار ساتھی میری سمت بڑھے، جن میں فلسطینی لڑکا بابر بھی شامل تھا۔ جانے کیوں، میری اور بابر کی پہلے دن ہی سے نہیں بنی تھی اور ہماری اب تک تین چار جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ وہ بھی میری طرح تیز مزاج اور حساب نہ رکھنے والا انسان تھا۔ عامر نے قریب آ کر مجھے سلام کیا۔ ”ہم مسلمان طلبہ کے خلاف نیویارک پولیس کے کریک ڈاؤن پر بہ طور احتجاج کل سے شہر بھر میں مظاہرے شروع کر رہے ہیں، تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟“ میں نے فوراً طنز یہ کہا۔ ”یہ تم لوگوں کو بے گانی شادی میں عبداللہ بن کرنا چنے کی کیا عادت پڑ گئی ہے۔ نیویارک پولیس کو اپنا کام کرنے دو، جو بے گناہ ہوگا، خود چھوٹ جائے گا۔“ میرا کرار جواب سن کر بابر سے صبر نہیں ہو سکا۔ ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس سے بات کرنا فضول ہے، لیکن تم لوگوں نے میری نہیں سنی۔“ میں نے بابر کو گھورا۔ ”تمہارے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنے گھر کی فکر کرو، دوسروں کے غم میں دہلا ہونا چھوڑ دو۔“ بابر سینہ تان کر آگے بڑھا، لیکن عامر نے جلدی سے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، کوئی زبردستی نہیں ہے، لیکن آیان، جانے میرا دل کیوں کہتا ہے کہ ایک دن تم ضرور ہمارے ساتھ چلو گے۔“ وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور میں اپنے راستے ہولیا۔

اس رات بسام کو واپس آنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ شاید میری ٹوٹی بائیک اور شرط کا نقصان بھرنے کے لیے اس نے اوور ٹائم لے لیا تھا۔ میں کچھ دیر ٹی وی کے چینل بدلتا رہا اور پھر مجھے سستی نے آگھیرا۔ میں وہیں لاؤنچ کے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اچانک ایک گزرے چینل نے مجھے جھٹکے سے دوبارہ اٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے فوراً وہی چینل لگایا۔ بسام جس ریستوران میں کام کرتا تھا، وہ ”کیفے نیولی“ کے علاقے میں تھا اور اس وقت ٹی وی پر وہاں نیو یارک پولیس کے چھاپوں کے بارے میں رپورٹ چل رہی تھی اور پھر میں نے دیگر لڑکوں کے ساتھ بسام کو بھی پولیس کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا، تو میرے ہاتھ سے ریوٹ گر گیا۔ میرے ذہن میں آج عامر کی کہی ہوئی بات گونجی ”ناپڈ والے مسلمانوں کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہے ہیں۔“ ٹھیک اسی وقت کسی نے جیجانی انداز میں بابر کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑاتا شروع کر دیا۔

(جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Scared“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سائے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک ثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk

جس انداز میں دروازہ پینا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید ہمارے اپارٹمنٹ پر بھی پولیس نے چھاپہ مار دیا ہے، لیکن مجھے خود سے زیادہ بسام کی فکر تھی۔ جسے میں نے ابھی ابھی نیوز چینل پر پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے چند لمبے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باہر فزینکلن کھڑا تھا، جسے ہم سب پیار سے انکل فرینکی کہتے تھے، وہ ہمارے اپارٹمنٹس کی یونین کا صدر تھا، اور میرا اور بسام کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ ”ہے آیان..... تم نے ابھی نیوز دیکھیں۔ کینے نیوی کے علاقے میں تمام چھوٹے ریسٹورنٹس پر ریڈ کر کے پولیس نے کئی مسلمانوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اور خدا کے لیے تم لوگ اپنی گھنٹی ٹھیک کراؤ۔ کب سے دروازہ پیٹ رہا ہوں۔“ شاید فرینکی نے بسام کو گرفتار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے یہ نئی خبر سنا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جلدی سے اپنی جینٹ پہنی ”ہاں، میں وہیں جا رہا ہوں، دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔“ فرینکی شدید غصے میں تھا، ”تماشا بنا رکھا ہے، ان پولیس والوں نے، ہم امریکی ایسے تو کبھی نہیں تھے۔“ انکل فرینک کو ہمیشہ ہی امریکیوں کی اقدار اور اخلاقیات کی فکر لگی رہتی تھی، لیکن فرینکی، جس سنہرے دور کو یاد کرتا رہتا تھا، وہ امریکا اب صرف کتابوں ہی میں ملتا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر مل بیرئسٹریٹ کے لیے ٹیکسی پکڑی اور اسے پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔

میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کافی بھیڑ اکٹھی ہو چلی تھی، کافی لمبی بحث کے بعد مجھے بسام سے ملاقات کی اجازت ملی، وہ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ مئی ڈیڈی کا لاڈ لاناچہ ہونے کی وجہ سے بسام اندر سے کافی نازک اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے زور سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ”ہمت کرو یار! آخر یہ ماجرا کیا ہے.....؟“ بسام نے رونی صورت کے ساتھ جواب دیا ”پتا نہیں، کسی پاکستانی لڑکے کو گرفتار کیا ہے، آج نیویارک پولیس نے۔ سنا ہے ٹائمز اسکوائر پر کسی گاڑی میں بم نصب کیا تھا اس نے، بم تو نہیں پھٹا، پر ہمارے مقدر پھوٹ گئے کہ ہم سب ایشیائی اور مسلمان ہونے کے جرم میں دھریے گئے۔“ میں نے غصے سے کچھ دور بیٹھے آفسرز کی طرف دیکھا ”لیکن کسی دوسرے ایشیائی یا مسلمان ہونے کے جرم میں یہ لوگ باقی گناہوں کو کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ ہم نے سب کا ٹھیک لے رکھا ہے کیا، اور تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم گزشتہ بیس برس سے امریکی شہریت رکھتے ہو، تو پھر یہ لوگ تمہیں ایشیائی ہونے کا الزام کیوں دے رہے ہیں۔ اب ہم بھی انہی کی طرح امریکی شہری ہیں.....“ بسام نے گہری سانس لی۔ ”بھائی! ایشیائی ہونا اتنا بڑا جرم نہیں ہے، ان لوگوں کی نظر میں، ہمارا اصل جرم مسلمان ہونا ہے۔ یہ لوگ اب ہر مسلمان کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“ اتنی دیر میں بسام کے ریسٹوران کا مالک بھی اپنے وکیل کے ساتھ لاک اپ پہنچ گیا، لیکن پتا چلا کہ اب ان سب کی ضمانتیں صبح عدالت ہی سے ہو سکیں گی۔ میں بسام کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن رات بارہ بجے کے بعد ہم سب کو مرکزی ہال خالی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بسام نے ضد کر کے مجھے واپس اپارٹمنٹ بھجوا دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میں ساری رات وہیں پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑے رہ کر گزار دوں گا، لیکن گھر واپس پہنچ کر بھی مجھے ایک پل کے لیے قرار نصیب نہیں ہوا۔ بار بار میری نظر بسام کے خالی کمرے اور بستر کی طرف جاتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب بسام گھر میں ہوتا تھا، تو میں تمام وقت اس سے مختلف چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتا رہتا تھا اور آج جب وہ یہاں نہیں تھا، تو مجھے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ شاید خون کے سب ہی رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں، دور یا جدا ہونے کے بعد بے تحاشا یاد آنے والے، شدید اداس کر دینے والے۔ مئی ڈیڈی کے انتقال کے بعد یہ پہلا موقع تھا، جب میں اور بسام الگ ہوئے تھے۔ ہمارے والدین نے اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال امریکا کے نیویارک شہر ہی میں گزارے تھے، مگر ڈیڈی کی تمام عمر جدوجہد میں گزر گئی۔ وہ بھی بہت سے رنگین سپنے لے کر اپنے ملک سے یہاں آئے تھے، مگر نیویارک کی تیز زندگی انہیں کبھی راس نہیں آئی اور اسی تیز رفتار زمانے نے ایک دن ان دونوں کی جان لے لی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اور بسام چھوٹے تھے، تو ہمارے اسکول کی فیس بھرنے کے لیے ڈیڈی کو تین تین جگہ نوکری کرنی پڑتی تھی۔ مئی سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں اور انہیں اس نئی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیں ہمارے ملک کی کہانیاں سنایا کرتیں، جو کہ ہمیشہ پریوں کے دیس ہی کی باتیں لگا کرتیں کہ جہاں پندرہ بیس افراد کا کنبہ بھی ایک چھت تلے گزارہ کر لیتا تھا۔ ڈیڈی اپنی تمام تر کوشش اور ان تھک محنت کے باوجود اس کرائے کے اپارٹمنٹ سے آگے نہ بڑھ سکے، جس میں اب میں اور بسام تنہا رہتے تھے اور انہی کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں اور بسام اب تک جیسے تیسے کر کے اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے، ورنہ یونیورسٹی کی آسمان کو چھوٹی فیس اور دیگر اخراجات ہمیں اس ”عیاشی“ کی اجازت ہر گز نہیں دیتے تھے کہ ہم دونوں ایک سمسٹر بھی آگے پڑھ سکیں، لیکن بسام نے ڈیڈی کی آخری خواہش اور وصیت نبھانے کا عزم کر رکھا تھا اور اب تو اس کا آخری سمسٹر تھا، مجھے البتہ ابھی تین سمسٹر درکار تھے، پھر ڈیڑھ سال بعد مجھے بھی معاشیات میں ڈگری مل جانی تھی۔ میں تمام رات اپنی سوچوں میں گم کرو نہیں لیتا رہا اور صبح ہوتے ہی پھر پولیس اسٹیشن جا پہنچا، تب تک وہ لوگ بسام سمیت سب ہی لڑکوں کو عدالت لے جا چکے تھے، مجھے بسام کے مالک کا وکیل عدالت کی سیڑھیوں پر مل گیا، وہاں دیگر متاثرین، رشتے دار بھی موجود تھے۔ وکیل نے ہم سب کو اطمینان دلایا کہ دن بارہ بجے تک وہ سب کی ضمانتیں کروالے گا۔ ہمیں کمرۂ عدالت میں جانے کی اجازت نہیں ملی، کیوں کہ جج اپنے ذاتی جیپ میں یہ کیس سن رہا تھا۔ میں وہیں عدالت کے باہر سنگ مرمر کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور پھر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے بسام مجھے باہر نکلتا ہوا نظر آیا، مجھے یوں لگا، جیسے میں اسے نہ جانے کتنے برسوں بعد دیکھ رہا ہوں۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”کیا بنا.....؟“ بسام رات بھر کی تھکن کا شکار لگ رہا تھا، ”میری ضمانت ہو گئی ہے یار، لیکن کچھ لڑکوں کو انہوں نے شے میں روک لیا ہے۔ زیادہ تر پاکستانی شک کا شکار ہیں، کیوں کہ ٹائمز اسکوائر پر بم لگانے والا بھی کوئی پاکستانی



طالب علم ہی ہے۔“ لیکن میں نے بسام کی آدمی بات ان سنی کر دی۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ میرا بے قصور بھائی رہا ہو گیا تھا، لیکن شاید میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عارضی رہائی ہم دونوں کے لیے کسی مستقل قید کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ بسام کی آخری کلاس کا وقت ابھی باقی تھا، لہذا وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر یونیورسٹی لے گیا، اس روز یونیورسٹی میں بھی چاروں طرف ٹائمز اسکوائر والے واقعے کی بازگشت ہی سنائی دے رہی تھی۔ فرہاد نے پریشانی سے میری جانب دیکھا ”مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ یہ کچھ عرصے سے آخر ہر بات کا نزہ مسلسل پاکستانیوں پر کیوں گر رہا ہے.....؟“ ایرک نے برا سامنہ بنایا ”کیوں کہ پاکستان کو پورے عالم کا خلیفہ بننے کی سوجھ گئی ہے۔“ فرہاد نے اسے حجاز ”بکومت، کل تک تمہارے یہی خیالات ہمارے ایران کے بارے میں تھے۔“ جم نے ایرک کی تائید کی ”ایرک ٹھیک کہہ رہا ہے، آخر کوئی تو وجہ ہوگی، ہر معاملے میں پاکستانیوں کے ملوث ہونے کی؟“ جینی نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”تم اپنے ملک کی صفائی میں کچھ نہیں کہو گے آیاں.....“ میں بسام کی پریشانی کی وجہ سے کچھ کھویا کھو یا تھا۔ ”بسام کہتا ہے کہ یہ معاملہ قوم کا نہیں، بلکہ مذہب کا ہے۔ ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دی جا رہی ہے، البتہ پاکستانی ہونا سونے پہ سہاگہ ہے۔“ ایرک نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ”سب بکواس ہے۔ اگر صرف مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا، تو یہاں سیکڑوں عرب، فلسطینی، ایرانی، سوڈانی، اور ملائیشین مسلمان بھی تو پڑھ رہے ہیں، حتیٰ کہ انڈین مسلمان طلبہ بھی بڑے آرام سے زندگی گزارتے ہیں ہمارے امریکا میں۔ تو پھر پاکستانیوں کے ساتھ عداوت کا التزام سراسر غلط ہے۔“ فرہاد کے سوا باقی سب نے ایرک کی تائید میں سر ہلایا۔ میں نے بے زاری سے بات ختم کی۔ ”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم جیو اور جینے دو کے قائل، نیویارک شہر کے باسی ہیں۔ ہمیں کسی کے بھی کیے کی سزا ملنا بہت نا انصافی ہوگی۔ کسی ملک میں پیدا ہونا ہمارے اختیار میں ہرگز نہیں ہوتا۔ ہاں، کسی ملک کی شہریت ہم اپنی پسند اور مرضی سے اختیار کرتے ہیں اور میں نے اور بسام نے یہ امریکی شہریت اپنی مرضی سے اختیار کی ہے۔ لہذا اب ہمیں بھی باقی امریکیوں کی طرح امریکی سمجھا جائے اور ہمارے حقوق کا خیال رکھا جائے۔“ فرہاد نے میری تقریر سن کر برا سامنہ بنایا۔ ”مسٹر آیاں، بہت جلد تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ امریکی حقوق کا رنگین پردہ بھی ہٹ جائے گا۔ یہاں اب وہی امریکی کہلائے گا، جو ابراہام لنکن کے دور کا ہوگا۔“ فرہاد کی بات سن کر ہم سب ہی ہنس پڑے۔ کچھ دیر ہی میں ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی اور ایرک اور جینی ہم سے بہانہ کر کے وہاں سے یونیورسٹی کے اس بڑے دالان کی طرف چل پڑے، جہاں زمین پر زرد آتش رنگت کے خشک پتوں کا قالین سا بچھا رہتا تھا۔ ایرک اور جینی پہلے سیسٹری سے ایک دوسرے کی چاہت کا شکار تھے اور یہ بات ہم میں سے کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی، مگر ایسے موسم میں وہ دو احمق ابھی تک ہم لوگوں سے کچھ ایسے ہی عجیب و غریب بہانے کر کے علیحدہ ہوتے تھے۔ پہلی بوند پڑتے ہی جینی کو یاد آتا کہ ”اوہو..... میں اپنے گلاسز لائبریری ہی میں بھول آئی ہوں.....“ ایرک بھی چند لمحوں بعد اپنی کار کی چابیاں ڈھونڈنے یا ایسے ہی کسی دوسرے ”اشد ضروری“ کام سے وہاں سے اٹھ جاتا اور پھر وہ دونوں شام گئے تک ان زرد پتوں کی چادر پر ایک دوسرے سے جانے کیا کھسر پھسر کر کے مسکراتے رہتے۔ یہ محبت بھی کیا بلا ہے، جو اچھے خاصے عقل مند انسان کو نرا احمق بنا کر رکھ دیتی ہے۔ محبت میں سب الٹا ہوتا ہے یا شاید سب ہی محبت کرنے والے سر کے بل کھڑے ہو کر اس دنیا کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، بہر حال سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان محبت کی بھول بھلیوں کی کبھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ فرہاد کہتا تھا کہ محبت سب پر وارد نہیں ہوتی، یہ اپنا شکار بہت دیکھ بھال کر اور نہایت اطمینان سے چنتی ہے اور محبت کا مرغوب ترین شکار وہ ہوتا ہے، جو درد سے زیادہ تر پے، جس کی جان نکلتے نکلتے نکلے اور جو مر مر کر جیے اور جی جی کر مرے..... ایک دم سے ٹھنڈے ہو جانے والے شکار محبت نام کے عفریت کو زیادہ نہیں بھاتے تھے۔ بقول فرہاد ”وہ عشق ہی کیا، جو اپنے خون سے دیواروں کا رنگ لال نہ کر دے۔“ لیکن مجھے یہ جذباتیت سخت ناپسند تھی یا شاید مجھے محبت کی کہانیوں ہی سے نفرت تھی۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگتا کہ جیسے محبت انسان سے اس کا سارا غرور، ساری انا جھپٹ کر اسے ایک بھکاری بنا دیتی ہے۔ عشق مرد سے اس کا گریس چھین لیتا ہے اور محبت عورت سے اس کے عورت پن کو جدا کر دیتی ہے، بلکہ مجھے تو یوں لگتا، جیسے اس محبت نامی بیماری میں عورت، مردوں جیسا اور مرد، عورتوں کی طرح برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ شاید محبت ہم سے ساری جنس چھین لیتی ہے۔ اسی لیے میں اس روگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا، لیکن بسام شاید دو سال پہلے ہی کیو پڈ کے اس ان دیکھے تیر کا شکار ہو چکا تھا۔ فائن آرٹس کے آخری سال کی ایرانی نژاد صنم کبیر اس کی توجہ کا خاص مرکز تھی، لیکن دوسرے محبت کرنے والے احمقوں کی طرح بسام بھی مجھ سے یہ بات چھپانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔

کچھ ہی دیر میں بارش تیز ہو گئی اور ہم کینے میریا سے نکل کر اپنی آخری کلاس لینے اکیڈمک بلاک کی طرف چل دیے۔ اگلی صبح میری بایک کو گیراج سے واپس لینے کا دن تھا، لہذا میں نے بسام کو عدالت میں حاضری لگوانے کے لیے کورٹ کے احاطے کے باہر چھوڑا اور خود سترہویں گلی میں واقع ڈیوڈ کے گیراج کی جانب چل پڑا۔ بسام کے وکیل نے آج ان سب کو ان کی ضمانت پکی کرنے کے لیے طلب کر رکھا تھا اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد بسام کو سیدھا یونیورسٹی ہی جانا تھا، کیوں کہ کل سے اس کی ”صرف ایک اچھی دوست“ صنم کبیر کے بیسیوں فون آپکے تھے کہ ضمانت پکی ہوتے ہی سب سے پہلے بسام اسے خبر کرے۔ صبح جب میں اور بسام گھر سے نکلے تو راستے میں کئی جگہ لوگ ہمیں اس ڈاکٹری رہائی کے لیے مظاہرے کرتے نظر آئے۔ میں نے چند تصویروں میں اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری وصول کرتے دیکھا تھا۔ بہ ظاہر تو وہ دھان پان ہی نظر آتی تھی، پھر نہ جانے پورے امریکا کو اس کے خوف کا بخار کیوں چڑھا تھا۔ راستے ہی میں ہم نے کئی جگہ گزشتہ شام گرفتار ہونے والے پاکستانی لڑکے کی ٹائم اسکوائر کو بم سے اڑانے کی کہانی بھی مختلف نیوز اسٹاٹز پر اور ہا کروں کے ہاتھوں بھی دھڑا دھڑکتی دیکھی۔ بسام جو پہلے ہی اس جیل یا تراسے اکتایا ہوا اور عدالت کے چکروں سے بے زار ہو چکا تھا، سب دیکھ کر غصے میں آ گیا ”یہ سارا کیا دھڑا اس ٹائم اسکوائر والے ہی کا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہماری شناخت تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ساکھ تو پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی۔“

بسام کو عدالت چھوڑ کر جب میں ڈیوڈ کے گیراج پہنچا تو میری بایک کے ساتھ ہی جٹا ہوا تھا۔ آخر دو گھنٹے بعد مطمئن ہو کر اس نے مجھے بایک لے جانے کی اجازت دے دی، لیکن ساتھ ہی خبردار بھی کیا ”اور خدا کے لیے لڑکے، اب ایک ہفتے تک اسے ایک سوے اوپر ہرگز نہ چلانا۔ اب کی بار چین ٹوٹی تو تمہاری یہ بایک صرف کباڑیے کی دکان کے قابل رہ جائے گی۔“ لہذا میں ڈیوڈ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ٹھیک ایک سو کی اسپینڈ سے بروکلین ایونیو سے اپنی بایک اڑاتا یونیورسٹی کی لین میں مڑ گیا۔ مجھے نیویارک کی ان کشادہ سڑکوں پر بایک دوڑانا ہمیشہ ہی سے اچھا لگتا تھا۔ زندگی میں رفتار نہ ہو تو زندگی رک سی جاتی ہے اور مکمل جمود تو بس موت کا دوسرا نام ہے۔ زندوں کو کبھی سست اور ساکت نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یونیورسٹی کے پارکنگ لاٹ میں بایک روک کر اپنا سیاہ ہیلیمٹ سر سے اتارا ہی تھا کہ ٹھیک اسی وقت صنم کبیر پریشان سی مجھے اپنی جانب آتی نظر آئی ”آیاں! آج بسام تمہارے ساتھ نہیں آیا۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ”تو کیا بسام ابھی تک یونیورسٹی نہیں پہنچا؟ اس نے کہا تھا کہ عدالت میں صرف آدھے گھنٹے کی پیشی ہے۔ اسے تو دو گھنٹے قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ میں بھی پریشان ہو گیا اور میں نے فوراً بسام کا موبائل نمبر ڈائل کیا، لیکن اس کا فون بند ملا۔ صنم نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ ”فون تو میں بھی دو گھنٹوں سے ملا رہی ہوں، لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا۔“ میرے ذہن میں اچانک ہی بہت سے موسموں نے ایک دم سراٹھانا



شروع کر دیا۔ ”کہیں بسام کی ضمانت منسوخ تو نہیں ہوگئی؟ کہیں وہ کسی اور مصیبت کا شکار تو نہیں ہو گیا؟“ اتنے میں جینی نے مجھے اور صنم کو پارکنگ لاٹ سے نکلنے دیکھ کر جلدی سے آواز دی ”آیاں..... کہاں تھے تم، ہم سب کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں.....“ ”کیوں خیریت.....؟“ جینی کچھ ہچکچائی۔ ”وہ بسام اور بابر کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات زیادہ نہیں بڑھی، لیکن بسام کا سیل فون نوٹ گیا۔ ایرک اور جم اسے لے کر ہاسٹل کی طرف گئے ہیں۔“ بسام کا جھگڑا فلسطینی کے ساتھ، لیکن کیوں.....؟ ایک لمحے ہی میں میری کن پٹیاں سلگلے لگیں اور میں ہاسٹل کی جانب لپکا۔ صنم اور جینی بھی میرے پیچھے دوڑیں، جینی نے مجھے راستے ہی میں ہانپتے کانپتے بتایا کہ آج جب بسام یونیورسٹی پہنچا تو اس کی پہلی مڈ بھیڑی فلسطینی بابر کے ساتھ ہو گئی۔ بابر نے چھوٹے ہی اسے طعنہ دے مارا کہ ”دو دن پہلے اگر اس کے چھوٹے بھائی نے مسلم طلبہ کے گروپ کے ساتھ نیویارک پولیس کے چھاپوں کے خلاف احتجاج سے انکار نہ کیا ہوتا، تو آج پورا گروپ بسام کی حفاظت کے لیے سڑکوں پر نکل آتا۔“ جواب میں پہلے سے چڑے بسام نے اسے جھاڑ دیا کہ ”اصل میں یہ سب انہی مسلمان طلبہ کے خدائی خدمت گار بننے کا نتیجہ ہے کہ آج پورے نیویارک شہر میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔“ بات سے بات نکلی اور بڑھتی گئی اور آخر کار نوبت ہاتھ پائی تک پہنچ گئی، لیکن اسی لمحے مسلم کاؤنسلر عامر اور باقی لڑکے وہاں پہنچ گئے اور معاملہ رفع دفع کروا دیا گیا، لیکن اس سے پہلے بسام کی جیب میں رکھا اس کا سیل فون نیچے گر کر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ وہ فون صنم ہی نے بسام کی جھپٹی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس فون کی بسام کے نزدیک کتنی اہمیت ہے۔ ہاسٹل میں فرہاد کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے میری نظریں چاروں جانب بابر کو تلاش کرتی رہیں، لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ مجھے راستے میں کہیں نظر نہیں آیا، ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی اپنے پیروں پر چل کر واپس جاتا۔ میں نے ایک جھٹکے سے فرہاد کے کمرے کا دروازہ کھولا تو بسام اپنی شرٹ کے ٹوٹے ٹخن بند کر رہا تھا، میں نے اسے غور سے دیکھا ”تم ٹھیک تو ہو، چلو میرے ساتھ۔ ابھی اس فلسطینی سے حساب برابر کرتے ہیں۔“ فرہاد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کم آن آیاں! چھوٹی سی بات تھی، ختم ہو گئی ہے۔ اسے طول مت دو۔“ میں زور سے چیخا۔ ”یہ تم لوگوں کے لیے چھوٹی سی بات ہے۔ اس نے میرے بھائی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں جب تک اس کی حالت خراب نہ کر دوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ تم لوگوں نے نہیں آنا تو نہ سہی۔“ میں تیزی سے واپس جانے کے لیے پلٹا، لیکن بسام نے بھاگ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”جانے دو! تو یار! غلطی ہم دونوں ہی کی تھی۔ میں صبح ہی سے عدالت کی پیشی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی غصے میں تھا۔ عامر نے مجھ سے معافی مانگ لی ہے۔ اب ختم کرو یہ سب کچھ۔“ لیکن میرے اندر کا ابلتا لاوا اب بھی بھڑک رہا تھا، ”لیکن اس کی ہمت کیسے ہوئی، تم سے بھڑنے کی اور اس نے تمہارا فون بھی توڑ ڈالا۔ ایک بار مجھے کہیں مل جائے تو.....“ ایرک، جم اور فرہاد سب نے مل کر مجھے زبردستی وہیں روکے رکھا۔ صنم کبیر تو باقاعدہ رو پڑی۔ یہ ایشیائی لڑکیاں بھی کس قدر نازک ہوتی ہیں۔ فرہاد کے کمرے کے باہر دیگر طلبہ کا ہجوم جمع ہونے لگا تھا۔ مجبوراً ہم سب کو فرہاد کے کمرے سے نکل کر کیفے کی جانب آنا پڑا۔ بسام نے بچپن کی طرح مجھے کسی غلطی سے روکنے کے لیے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا، تاکہ میں اس کی گرفت سے نکل کر کچھ کر نہ بیٹھوں۔ صنم کبیر بھی میری وجہ سے بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی، آخر کار مجھے بسام کو کہنا پڑا کہ میں کہیں نہیں جاؤں گا، پہلے تم اپنی اس ”صرف اچھی دوست“ کو تو سنبھالو۔ صنم ایران کے شہر، تہران کے ایک متمول اور عزت دار پہلوی خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ اس کے والد کبیر پہلوی کا وہاں کپڑے کا بہت بڑا اور آباؤ اجداد کے دور سے کاروبار قائم تھا۔ جینی نے ماحول بدلنے کے لیے گرم کافی اور چیز سینڈویچ آرڈر کر دیے۔ وہ صنم کبیر کا بالکل الٹ تھی اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس وقت بابر سے جھگڑنے کے لیے نکلتا تو وہ ہم سب سے آگے ہوتی۔ ہم سب بمشکل اپنا موڈ بدل کر ابھی اس نئے ماحول کا حصہ بننے کی کوشش میں مصروف ہی تھے کہ اچانک مسلم کاؤنسلر عامر سمیت اس کا تمام گروپ کیفے میں داخل ہو گیا۔ ماحول پر تناؤ اور سنجیدگی سی چھا گئی، کیوں کہ کیفے میں موجود دوسرے تمام طلبہ کو بھی بسام اور بابر کے جھگڑے کی اطلاع مل چکی تھی۔ بابر چپ چاپ اپنے گروپ کے ساتھ دوسرے کونے میں پیچھی ایک میز کے گرد بیٹھ گیا۔ بسام نے نظروں نظروں میں مجھے اس پردھیان نہ دینے کا اشارہ کیا، لیکن میں اچانک ”ایکسکیوز می“ کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ سب مجھے اشارے کرتے رہ گئے اور میں عامر گروپ کی میز کے قریب پہنچ گیا، عامر نے حسب عادت خوش دلی سے مجھے سلام کیا ”آؤ آیاں، بیٹھو.....“ میں نے بابر کی جانب سر دلچھ میں دیکھتے ہوئے عامر کو جواب دیا ”میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں، بلکہ تم سب کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں، بسام میرا اکلوتا بھائی اور آخری رشتہ ہے، اس پوری دنیا میں۔ میں پہلے ہی سب کچھ کھو چکا ہوں، اب مزید کچھ نہیں کھو سکتا۔ اس لیے پہلی اور آخری بار تم سب یہ سمجھ لو کہ اگر کبھی بسام کو ہلکی سی خراش بھی آئی تو میں انسانیت کا آخری درس بھی بھول جاؤں گا۔“ عامر نے اطمینان سے میری بات سنی۔ ”جو کچھ ہوا، میں اس کے لیے پہلے بھی بابر کی طرف بسام سے معافی مانگ چکا ہوں۔ تم بھی اپنے دل سے تمام غبار نکال دو۔ چلو بابر، اٹھ کر آیاں سے ہاتھ ملا کر تم پہل کرو۔“ بابر نے بادل نہ خواستہ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور تمام کیفے ٹیریا میں شور مچا گیا۔ جینی نے وہیں بیٹھے بیٹھے کئی سیٹیاں بجا ڈالیں۔ میری نظریں چوں کہ عامر اور بابر پر جمی تھیں، اس لیے میں عامر بن حبیب کے ساتھ بیٹھی اس نئی لڑکی کو نہیں دیکھ سکا، جس نے اچانک اٹھ کر اپنا نازک ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھ دیا تھا۔ ”ہائے! آئی ایم پروا..... پروا ضمیر خان فرام دہلی۔ انڈیا.....“ میں کچھ سٹپٹا سا گیا، لیکن میں نے ہاتھ ملایا۔ پروانے روشن سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”امید ہے اب یہ دوستی نہیں ٹوٹے گی۔“ میں چند لمحوں بعد جب اپنی میز پر واپس آیا تو ایرک اور جم نے باقی سب کے ساتھ مل کر میرا جینا دو بھر کر دیا۔ ”اچھا جناب! یہاں سے تو بڑے غصے میں اٹھ کر گئے تھے اور وہاں لڑکیوں سے ہاتھ ملا کر واپس آرہے ہو، بہت خوب..... تم سے یہ امید نہ تھی ہمیں آیاں.....“ ”بکومت، میں تو اسے جانتا بھی نہیں..... شاید کوئی نئی مسلم اسٹوڈنٹ ہے، جس نے عامر بن حبیب کا گروپ جوائن کیا ہے۔“ فرہاد نے لمبی سی آہ بھری ”ہاں! میں اسے جانتا ہوں۔ ابھی دو دن پہلے ہی اس نے فزکس ڈپارٹمنٹ جوائن کیا ہے۔ سنا ہے جب سے پروا وہاں آئی ہے، تب سے پروائیاں ہی چل رہی ہیں فزکس کے ٹیکچر ہال میں۔“ میں نے فرہاد کو گھورا ”تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔ تمہارے نام ہی میں گز رہا ہے۔“ بات آئی گئی ہو گئی، لیکن میں اور بابر دونوں ہی شاید اس حقیقت سے واقف تھے کہ کبھی نہ کبھی ہمارا انکراؤ ضرور ہوگا۔ بسام لاک اپ سے آنے کے بعد ہی سے کچھ سستی کی شکایت کر رہا تھا، مگر شام تک اس کی طبیعت کی یہ کسل مندی باقاعدہ تیز بخار کی شکل اختیار کر گئی۔ رات گئے میں اپارٹمنٹس کے رہائشی ڈاکٹر سام کو لے آیا اور اس نے بسام کی حالت دیکھتے ہی اسے کسی اسپتال منتقل کرنے کی ہدایت کر دی۔ ڈاکٹر کے خیال میں ٹائی فائڈ کا حملہ تھا۔ بسام کے انکار کے باوجود میں صبح سویرے اسے قریبی اسپتال لے گیا۔ بسام نہ، نہ ہی کرتار ہا کہ اگلے مہینے ہم دونوں کی سمسٹر کی فیس بھرنا ضروری ہے، لہذا وہ نوکری سے چھٹی نہیں کرنا چاہتا، لیکن میں نے ڈانٹ کر اسے خاموش کروا دیا، البتہ فیس اور دیگر بلز کی فکر مجھے بھی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم میں یونیورسٹی پہنچا تو پارکنگ لاٹ میں یہودی لڑکوں کا گروپ اپنی پائیکس کے قریب کھڑا تھا۔ ”ہے آیاں..... سنو..... کیا خیال ہے..... کچھ پیسے کمانا چاہتے ہو۔ تقریباً ایک ہزار ڈالر مہینے کے.....“ میں نے حقارت سے مائیکل کی جانب دیکھا، جس نے یہ پیش کش کی تھی۔ ”کیوں، کیا تم لوگوں کا کوئی خزانہ نکل آیا ہے؟“ اس بارسم نے جواب دیا ”ہاں، بس یہی سمجھ لو۔ تم تو ویسے بھی پیسا کمانے کے لیے شرطیں لگاتے رہتے ہو۔ بس، یوں سمجھ لو کہ ہم نے بھی ایک شرط لگائی ہے۔“ ”مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ ”کام کچھ خاص نہیں ہے، بس تمہیں مسلم کاؤنسلر عامر بن حبیب کا گروپ توڑنا ہوگا۔ گروپ ٹوٹنے تک تم اس گروہ میں شامل ہو کر ہمارے لیے مخبری کرو گے کہ وہ لوگ اپنی میٹنگز میں کیا طے کرتے ہیں اور پھر تمہاری تو ویسے بھی اس گروپ کے بابر سیدی کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے۔ اس طرح سے تم ایک تیر سے دو شکار کر پاؤ گے..... ہمارا وعدہ ہے کہ وقت آنے پر ہم بابر کے خلاف تمہاری پوری مدد کریں گے، بولو..... منظور ہے ہماری پیش کش.....“ میں نے مائیکل کی طرف سے بڑھائے ہوئے دوستی کے ہاتھ کو غور سے دیکھا۔ شاید قدرت نے میری مشکلات کا حل تلاش کر لیا تھا۔

.....(جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk

کچھ دیر ہم سب ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ مائیکل نے پوچھا ”کس سوچ میں گم ہو۔ اتنی اچھی آفر تمہیں کوئی اور نہیں دے گا۔“ میں نے غور سے سب کے چہروں کی طرف دیکھا ”لیکن عامر بن حبیب سے تم لوگوں کی ایسی کیا پر خاش ہے کہ اس کی مخبری کی ضرورت پڑگئی، گھل کر بتاؤ،“ ہسم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ”بات کچھ ایسی خاص بھی نہیں، لیکن ہمیں اس عرب شیخ سے پرانے حساب چکانے ہیں۔ وہ آج تک ہر مرحلے پر ہمیں نچا دکھاتا آیا ہے۔ پہلے یونیورسٹی میں صرف ایک عیسائی لڑکا تمام طلبہ کا کاؤنسلر ہوتا تھا اور وہی ہم سب اسٹوڈنٹس کے مسائل کے حل کا ذمہ دار بھی تھا۔ تب اس یونیورسٹی کی فضا اتنی آلودہ نہیں تھی۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ عامر بن حبیب کا گروپ ہر مسئلے میں ٹانگ اڑاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اب یونیورسٹی کے لڑکوں کو بھی نیویارک پولیس شک کی نگاہ سے دیکھنے لگی ہے۔ اگر حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو تمہارے بھائی کی گرفتاری بھی دراصل عامر بن حبیب جیسے جنونیوں کی کارروائیوں کا شاخسانہ ہے، لیکن اب ہم سب نے مل کر عامر بن حبیب سمیت سب ہی انتہا پسندوں کا راستہ روکنے کی ٹھان لی ہے۔ اب بولو، دو گے ہمارا ساتھ، ہم تمہاری دی ہوئی خبروں سے ان کی حکمت عملی کا تو ذکر کریں گے اور اگر تم اس گروپ میں رہ کر عامر اور باہر کی منصوبہ بندی میں بگاڑ پیدا کرو تو ان کا گروپ ٹوٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، مگر تمہیں اس باہر سیدی سے ذرا ہوشیار رہنا ہوگا۔ عامر بن حبیب کی اصل طاقت دراصل وہی ہے۔“ میں نے کچھ دیر توقف کیا ”ٹھیک ہے، لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ جو تم کہہ رہے ہو، وہ سب اتنا آسان نہیں۔ تم لوگ ایک مضبوط اور منظم ریکٹ کو توڑنے کی بات کر رہے ہو۔“ مائیکل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا ”ٹھیک ہے، تم وقت لے سکتے ہو، لیکن یاد رہے کہ ہم یہ کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور تم نہیں، تو کوئی اور ہمارا یہ کام کر ہی دے گا۔“ وہ کچھ توقف کے بعد مسکرایا ”بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی ایجنٹ اب تک عامر کے گروپ میں شامل بھی ہو چکا ہو۔“ اور پھر وہ سب ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور میں اپنی کلاس کی جانب جاتے ہوئے اسی سوچ میں ڈوب رہا کہ مائیکل کس ایجنٹ کی بات کر رہا تھا، جہاں تک میری معلومات تھیں، عامر گروپ جو اُن کرنے والی آخری لڑکی، وہ انڈین ہی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے میرے عقب سے کسی نے مجھے اپنی ملائم آواز میں پکارا، ”ہے! غصیلے لڑکے، کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ تم اتنا تیز کیسے چل لیتے ہو؟“ وہ وہی تھی، پُر وا..... ڈھیلی ڈھالی سی نیلی شرٹ اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس..... سر پر بالوں کی پونی ٹیل بنائے اور چیونگم چباتی ہوئی، کسی اسکول کے گیٹ سے نکلی طالبہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ اُس نے حسب عادت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”پُر وا..... پُر وا ضمیر خان.....“ میں مسکرا دیا ”تمہارے انداز تعارف کا ایک فائدہ تو ضرور ہے کہ لوگوں کو تمہارا نام ازبر ہو جاتا ہوگا۔“ وہ بھی زور سے ہنس پڑی ”اوہ سوری، بس عادت سی پڑ گئی ہے، لیکن پُر وا ہر ایک کو یوں اپنا تعارف کراتی نہیں پھرتی۔ آئی ایم ویری سلیکٹو، دوست چننے میں، میں ہمیشہ سے بہت محتاط ہوں۔“ ”اچھا واقعی.....؟؟“ ہم دونوں اکیڈمک بلاک کی جانب جا رہے تھے۔ ”میں جانتی ہوں، تم اس بات پر یقین نہیں کرو گے، کیوں کہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ میں نے خود بڑھایا ہے، لہذا انا اور خود داری کے نمبر تو تم نے پہلے ہی کاٹ دیے ہوں گے۔“ مجھے اس کی یہ صاف گوئی پسند آئی۔ ”نہیں، میں انسان کو صرف انسان کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔ عورت یا مرد ہونا میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا، لہذا لڑکیوں والی روایتی انا اور خود داری کے نمبروں کے باقی رہنے یا کٹ جانے سے تمہارے مجموعی تاثر پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ پُر وا خوش ہو گئی۔ ”یہ ہوئی نا بات! اس کا مطلب ہے، میں نے تمہیں پہچاننے میں واقعی غلطی نہیں کی، تو کہو..... دوستی پکی“ وہ اپنی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی، جیسے اب مجھ سے ہاں کر دیا کر ہی ملے گی۔ ”لیکن تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ آخر تم نے مجھے اس ”اعزاز“ کے قابل کیوں سمجھا۔“ پُر وا اعزاز کا لفظ سُن کر مسکرائی۔ ”پتا نہیں، بس مجھے لگا کہ تم ایک بچے اور بہادر انسان ہو۔ اس روز، جس طرح تم نے پورے مسلم گروپ کو آکر لکا رکھا تھا اور تمہاری آنکھوں میں اپنے بھائی کے لیے جو محبت اور اس کی حفاظت کا جو عزم تھا، وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ اپنے خون کے رشتوں کے لیے اتنے مخلص ہوتے ہیں، وہی اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ تم خود بھی تو مسلمان ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستانی، پھر تم نے اپنے مسلم کاؤنسلر کو ووٹ کیوں نہیں دیا۔“ چلتے چلتے ہم دونوں اُس راہ داری تک پہنچ چکے تھے، جہاں سے میرے اور پُر وا کے ڈپارٹمنٹ کی راہیں الگ ہو جاتی تھیں۔ ہم دونوں رُک گئے۔ ”میرے والدین پاکستانی تھے لیکن میں گزشتہ بیس برس سے امریکن ہوں۔ رہی بات، مذہب کو نبھانے کی تو میں مذہب کو ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا ہوں۔ مسلمان تو کیا، میں کسی بھی کاؤنسلر کو صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں چن سکتا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے انا اور خود داری کے نمبروں کی بات کی تھی ناں، تو میں تمہیں تمہاری نمبروں کی زبان میں ہی سمجھاتا ہوں کہ میرے نزدیک مذہب اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اندرونی طور پر مذہب کو تم سو میں سے سو نمبر بھی دینا چاہو، تو دے سکتی ہو، لیکن بیرونی دنیا میں مذہب کے نمبر میرے نزدیک صرف 33 ہیں۔ پاس ہونے کی حد تک ضروری نمبر، باقی 77 نمبر اس کے برتاؤ، سچائی، ایمان داری اور انسانی اقدار کے ہیں۔ میں اس کاؤنسلر کو اپنا رہنما چنوں گا، جو ان سب کو ملا کر کم از کم 80 فی صد سے زیادہ نمبر حاصل کر سکے۔“ پُر وا غور سے میری بات سنتی رہی۔

”واہ! کمال فارمولا ہے، تمہارے چناؤ کا۔ لگتا ہے، پُر وا کو بھی اپنے معیارات پھر سے دہرانا پڑیں گے، لیکن کیا عامر بن حبیب بھی تمہارے اس چناؤ



کے معیار پر پورا نہیں اُترتا؟“ ”کچھ کہہ نہیں سکتا ابھی، میں نے اُسے اس نظریے سے پرکھا نہیں ہے۔ ہاں، تم پرکھ لو، تو مجھے بھی ضرور بتانا۔“ پُر وائے زور سے سر ہلایا ”ضرور..... میں ضرور تمہیں بتاؤں گی۔ آج تم سے بات کر کے واقعی بہت خوشی ہوئی آیان۔“ اس نے حسب عادت جاتے جاتے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ ملا کر زور سے کہا ”مجھے بھی، مس پُر وائے زور سے ہنس دی۔ فرہاد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی لے لوٹ ہنسی تو کسی پُر وائی کی طرح ہی تھی۔ ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب بڑھ گئے۔

شام تک میں یونیورسٹی کیفے میں بیٹھا مائیکل کی پیش کش پر غور کرتا رہا۔ میرے دوستوں میں جم، ایرک اور جینی امیر خاندانوں سے تھے اور وہ بہ آسانی میری اور بتام کی فیس بھر سکتے تھے، میں ان سے مہینوں، سالوں کے لیے بھی ادھار مانگ سکتا تھا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ زندگی بھر اُس رقم کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہیں لائیں گے، لیکن میرے اندر کا آیان اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اور بتام نے آج تک، جو بھی کیا، اپنے بل ہی پر کیا۔ شدید سخت حالات میں بھی ہم نے اپنے اندر کے آئینے کو کسی کی مالی مدد یا اعانت سے دھندلا نہیں ہونے دیا تھا۔ سو، میں نے اپنے کسی بھی دوست سے اپنی اس پریشانی کا ذکر تک نہیں کیا۔ شام کو وہ سب صنم کبیر سمیت بتام کی عیادت کے لیے اسپتال جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ میرے پاس بایک موجود تھی، لہذا ہم سب ایک ہی وقت میں الگ الگ سواریوں پر یونیورسٹی کے پارکنگ لٹ سے نکل پڑے۔ وہ سب جم کی بڑی وین میں سوار تھے۔ آج نیویارک شہر میں ایک تازہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی خالی جگہ، جسے اب گراؤنڈ زیرو کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہاں اسلامک سینٹر بنایا جائے یا ٹریڈ ٹاور کے حادثے میں مارے جانے والوں کی یادگار۔ پھر وہی مذہبی معیار، وہی پرانی پہچان کا جھگڑا اور وہی لا حاصل بحث۔ میں نے تو آج یونیورسٹی میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس بحث میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میری بلا سے اگر صدر اوہاما بھی مسجد کے حق میں تھا یا گرے کا حمایتی، مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گراؤنڈ زیرو پر گر جا اور یادگار بننے سے نیویارک کو کون سے سُرخاب کے پرلگ جانے تھے یا مسجد اور اسلامک سینٹر بننے سے نیویارک کی کون سی ایسی بڑی خدمت ہو جاتی۔ آخر ہم اپنے مذہبی رویوں میں اعتدال کا پیمانہ سدا قائم کیوں نہیں رکھ پاتے۔ ایسے مواقع پر مجھے فرہاد کا ہمیشہ کا دہرایا جانے والا اردو شعر یاد آ جاتا تھا

”مسجد تو بنالی شب بھر میں، ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پانی ہے، برسوں میں نمازی نہ بن سکا“

ذہلیقی شام میں ویسٹ اورینٹ کی سڑکیں پوری طرح جھگگنے لگی تھیں۔ نیویارک کی شام انسان کو خود میں جذب کر لینے والی ہوتی ہے۔ جلتے بجتے رنگین نیون سائن، چمکیلی اسٹریٹ لائٹس، فٹ پاتھ پر عارضی طور پر بڑھ آنے والے ریٹورنٹس سے انھنی کافی کی خوش بو، سبے سنورے مرد اور عورتیں ہوئی دکانوں کے بیرونی شیشوں سے اندر جھانکتی خوب صورت عورتیں۔ ہر کوئی اپنے جہاں میں مگن، سگاریوں سے نکلتے دھوئیں کی مہک اور پُختہ ہوا کا قاعدہ اپنے اندر کشید کرتے نوجوان جوڑے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ نیویارک جیسے شہر بستی بستی ہی بستی ہوں گے۔ شہر بسایا بسانا واقعی بڑا جو کھم ہے۔ شہر صرف اونچی عمارتیں کھڑی کر دینے یا چوڑی شفاف سڑکیں بچھانے سے نہیں بستی۔ انہیں بسانے کے لیے بھی کچھ الگ، بہت سوا چاہیے ہوتا ہے۔ شہر اپنے شہریوں کی سوک سنس کی وجہ سے جانا جاتا ہے اور یہی آداب معاشرت ایسی بستیاں بساتے ہیں۔ ہم سب بتام کو دیکھنے اسپتال پہنچے تو وہ بے زار سا اپنے بستر پر لیٹائی۔ وی چینل بدل رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر چہرے پر رونق آگئی، حالاں کہ مجھے یہ رونق اس کی ”صرف اچھی دوست“ صنم کبیر کی مہربانی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتام کو کم از کم دو ہفتے کا آرام تجویز کیا تھا، لہذا اس کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے دوستوں یا صنم کے سامنے اپنی بے چینی اور اسپتال سے جلد چھٹی کی اصل وجہ بیان نہیں کرے گا، لیکن میں اس کی پریشانی سے بھی خوب واقف تھا۔ اُسے خرچے کی فکر کھائے جاری ہوگی۔ صنم نے غیر محسوس انداز میں بتام سے کئی بار پوچھا بھی کہ اگر وہ سب لوگ بتام کے کسی کام آسکیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ خود مجھے بھی صنم کے خلوص پہ کوئی شک نہیں تھا، لیکن میں بتام کا جواب بھی جانتا تھا۔ ”بس تم سب مجھے دیکھنے آگئے، اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے ہوگا“

ہم لوگ جب بتام کے کمرے سے نکلے تو صنم کبیر کو باہر آنے میں چند لمحے زیادہ لگے۔ سچ ہے، محبت وقت کا خراج مانگتی ہے۔ جو برتاؤ سب کے لیے یکساں اور جو وقت سب رشتوں کو برابر بانٹا جائے، وہ محبت کی کتاب میں درج نہیں ہوتا۔ محبت اپنے لیے خصوصی برتاؤ اور سب سے الگ وقت کی بھیجٹ چاہتی ہے کہ ”انداز محبت“ سدا شاہانہ ہی رہے ہیں۔

اگلی صبح جب میں یونیورسٹی پہنچا تو بوند باندی تیز ہو چکی تھی۔ عامر بن حبیب کا گروپ پوری یونیورسٹی میں ایک سروے منعقد کروا رہا تھا اور چند لمحوں میں سروے فارم میرے ہاتھوں میں بھی تھما دیا گیا۔ سوال نامے پر بس ایک ہی سوال درج تھا۔ ”آپ گراؤنڈ زیرو پر کس تعمیر کے حق میں ہیں۔ (i) اسلامک سینٹر (ii) یادگار (iii) کچھ نہیں۔ میں نے نمبر (iii) پر تک کا نشان لگایا اور فارم بانٹنے والے لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ٹھیک اُسی وقت پُر وائے زور بارش سے خود کو بچاتی، سر پر اسکارف نما کوئی رومال لپیٹے وہاں نمودار ہوئی۔ میں اس وقت یونیورسٹی کے آڈیٹوریم کی شیشے والی دیوار کی سمت کھڑا تھا، جہاں سے باہر دور تک لان میں گرتی بوندوں کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ پُر وائے زور جلدی سے میرا بھرا ہوا فارم اُس لڑکے سے لے کر دیکھا ”ارے..... یہ کیا؟ تم گراؤنڈ زیرو پر اسلامک سینٹر بننے کے حق میں نہیں ہو؟“ ”میں کسی تنازعے کے حق میں نہیں ہوں۔ اگر شہر کی اکثریت اسلامک سینٹر بنانا چاہتی ہے، تو پھر سینٹر ہی بننا چاہیے اور اگر یہاں کے شہری کوئی یادگار وغیرہ بنانا چاہتے ہیں، تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی دوسرے کی رائے کو اکثریت ملنے پر اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ جس کے نظریے میں طاقت ہوگی، وہ اپنا آپ خود منوالے گا۔“ پُر وائے زور الجھی گئی ”پتا نہیں کیوں، میں جب بھی تمہارے نظریات سنتی ہوں، کچھ الجھی جاتی ہوں۔ کیا مذہب میں بھی اتنا کیلکولیٹو ہوا جاسکتا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مذہب ایسی اکائیوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔“ میں نے شیشے کی دیوار پر جمتی بھاپ میں اپنے نام کے حروف بنائے ”تو پھر یہ جان لو کہ تم بھی مذہب کے بارے میں کہیں نہ کہیں متعصب ہو رہی ہو۔ جب ہم دنیا کی ہر چیز کے لیے میرٹ کا معیار سامنے رکھتے ہیں، تو مذہب میں کیوں نہیں؟“ پُر وائے زور سوچ میں پڑ گئی ”شاید اس لیے کہ ہمیں پیدائش ہی سے ہمارے بڑے مذہبی تعصب کا تھوڑا بہت سبق ضرور پڑھا جاتا ہے“ میں نے پُر وائی طرف دیکھا۔ ”تم نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔“ میں آگے چل پڑا۔ پُر وائے زور جلدی سے میرے پیچھے لپکی ”لیکن ہمارا آبائی مذہب کم از کم اتنے تعصب کا تقاضا تو کرتا ہے نا؟“ میں چلتا رہا۔ پُر وائے زور قدموں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کر رہی تھی ”اچھا یہ بتاؤ، محبت کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟“ محبت نام سے بڑی حماقت، شاید ہی اس دنیا میں وارد ہوئی ہو۔ لیکن افسوس آج ساری دنیا اسی بخار میں مبتلا نظر آتی ہے۔ ”ہم باہر نکل آئے تھے اور بوندیں ہمارے چہروں پر پھیل رہی تھیں۔ پُر وائے زور قاعدہ بحث کے موڈ میں تھی۔“ ”ایسے نہیں، اگر یہ حماقت ہے تو کسی دلیل سے ثابت کرو۔“ میں رُک گیا۔ ہمارے آس پاس لان میں بارش کی وجہ سے دور دور تک سناٹا تھا اور صرف برستی بارش کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی ”سچ کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں تمہارے بھارت ہی کی مثال دیتا ہوں۔“ ”تاج محل، جسے آج ساری دنیا محبت کی نشانی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ شاعروں نے پورے پورے دیوان اس پر لکھ مارے۔ روزانہ ہزاروں محبت کے متوالے اُس سفید عمارت کی زیارت کو جاتے ہیں، لیکن کیا کسی نے تاریخ سے اس یادگار محبت کی اصل تصویر کھوجنے کی کوشش بھی



کی، شاہ جہاں نے جس ممتاز کے لیے یہ یادگار بنوائی تھی، وہ اس کی سات بیویوں میں سے چوتھے نمبر پر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے ممتاز کے شوہر کو قتل کروا کر ممتاز سے شادی رچائی تھی۔ ممتاز کی موت اپنے چودھویں بچے کی پیدائش کے دوران ہوئی اور اُس کی موت کے بعد شاہ جہاں نے ممتاز کی چھوٹی بہن سے شادی کر لی تھی۔ اتنا کافی ہے یا محبت کی ”آفاقیت اور لافانیّت“ کے لیے جو لیس سیزر، قلو پطرح یا روس کے راسپیوتین کی بدنام زمانہ داستانوں کا حوالہ بھی دوں؟“ پُر وائے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔ ”نہیں نہیں۔ بس اتنا ہی بہت ہے۔ شکر ہے کسی ایک معاملے میں تو ہمارے خیالات ملتے ہیں۔ میں خود بھی محبت کو بس چند ہارمونز کی اپنی جگہ سے غیر مستقل تبدیلی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ لیکن یہ چند ہفتوں کی ہارمونل چھینج انسان سے کیا کچھ نہیں کروا جاتا۔“ ہم دونوں پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا ”لیکن اگر ہم دونوں کچھ دیر مزید اس برستے موسم میں یہاں کھڑے رہے تو سردی کے مارے ہمارے سب ہی ہارمون اپنی جگہ جم کر ختم ہو جائیں گے۔ چلو، اب یہاں سے، ورنہ لوگ ہمارا تاج محل بنانے میں بھی دیر نہیں کریں گے۔“ میں آگے چل دیا اور پُر وائے قدموں کے نشانات پر اپنے کینوس شوز کے نشان بناتی میرے پیچھے چل پڑی۔

تین دن بعد یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر اگلے سیمسٹر کی فیس جمع کروانے کا آخری نوٹس بھی لگا دیا گیا۔ میں نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ تین دن کے اندر اپنی اور بستانم کی فیس کا انتظام کیسے کروں گا۔ نیویارک میں ہمارے واحد رشتے دار عارفین ماموں اپنے چھوٹے سے جنرل اسٹور کی خاطر لیے قرض کی اقتضا بھی بمشکل جمع کر پاتے تھے، بلکہ بستانم ہی گا ہے بگا ہے انہیں بھی تھوڑی بہت رقم بھجواتا رہتا تھا۔ گزشتہ شام وہ مجھے اسپتال میں بستانم کے کمرے میں ملے تو ان کے گلے شکوے انہار کی شکل اختیار کر چکے تھے ”اب ایسی بھی کیا مصروفیت آیاں میاں، کہ اپنے اکلوتے ماموں ہی کو بھلا دیا؟ حد ہوتی ہے لا پرواہی کی۔“ لیکن میں اور بستانم انہیں منانا خوب جانتے تھے، لہذا کچھ ہی دیر میں عارفین ماموں سب بھول بھال کر ہمیں اپنی جوانی کے چند آخری معاشقوں کا حال سنارہے تھے۔ میں نے کل شام جان بوجھ کر بستانم کے سامنے فیس کی آخری تاریخ کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت سامنے بورڈ پر لگا نوٹس میرے لیے ایک بہت بڑا سوال تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک بار پھر آخری بقا (Last-Survivor) کے کھیل میں قسمت آزمائوں، لیکن ابھی تک میں بچھلی باری ہوئی رقم کی بھی ادائیگی نہیں کر پایا تھا۔ میرے پاس بیچنے کے لیے صرف میری بانیگ ہی تھی لیکن آخری شرط میں ٹوٹ پھوٹ کے بعد، اس کی قیمت بھی برائے نام ہی ملتی۔ اچانک میرے ذہن میں اس رات مجھ سے جیتنے والے حریف ٹم کا جملہ گونجا ”جب تک دوسرے کو گچل کر آگے بڑھنے اور پانے کی جہلت اپنے اندر پیدا نہیں کرو گے، ہارتے ہی رہو گے۔ اس دنیا سے جیتنا ہے تو اپنے اندر کھرا انسٹنٹ پیدا کرو آیاں۔ یہ دنیا ایک جنگل ہے اور یہاں آخری درندہ وہی بچے گا، جو اپنے سب ہی حریفوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔“ ٹھیک اُسی وقت میرے، عقب سے بابر سیدی چند دیگر مسلم طلبہ کے ساتھ گُورا۔ جانے وہ سب کس بات پر زور سے ہنسے، مگر مجھے ایسا لگا جیسے بابر نے میرے متعلق کوئی بات کہی ہو۔ میں غصے میں تیزی سے پلٹا لیکن وہ لوگ آگے بڑھ چکے تھے اور مائیکل اپنے ساتھیوں سمیت راہ داری میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو زور سے بولا۔ ”تم یہاں ہو اور ہم تمہیں پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ وہ سب میرے قریب آگئے ”تو کیا فیصلہ کیا تم نے.....؟“ میں نے اندر کے درندے کو آخری بقا کے لیے چیر پھاڑ کرتے محسوس کیا اور پھر..... میں نے درندے کی مان لی ”ٹھیک ہے، مجھے تم لوگوں کی پیش کش منظور ہے لیکن مجھے تم لوگوں سے کچھ کیش وغیرہ نہیں چاہیے۔ تم لوگ میری اور بستانم کی ایک سیمسٹر کی فیس اور ٹیوشن کی رقم جمع کروادو۔ سیمسٹر چھ ماہ کا ہوتا ہے لیکن میں تین ماہ سے بھی کم عرصے میں تم لوگوں کا ٹارگٹ پورا کر دوں گا۔ فیس ادائیگی کی رسید جس وقت مجھے تک پہنچے گی، ٹھیک اس وقت سے ہمارے معاہدے کی گنتی شروع ہو جائے گی۔ کام پورا ہونے کے بعد ہم ایک دوسرے سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے۔ تم لوگ مجھے کوئی ہدایات نہیں دو گے، میں عامر بن حبیب کی کاؤنسلر شپ اپنے طریقے سے ختم کروں گا۔ بولو منظور ہے؟“ مائیکل نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ”بالکل منظور ہے، ہمیں تمہاری صلاحیتوں پر کوئی شبہ نہیں ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔ ایک آخری بات..... اس معاہدے کو ایک کاغذ پر اس کی تمام شتوں سمیت تحریر کر کے میں اور مائیکل دستخط کریں گے اور اس کی ایک ایک کاپی ہم اپنے پاس رکھیں گے تاکہ کل کوئی پیچیدگی ہونے کی صورت میں ہمارے پاس ثبوت موجود ہو۔“ انہیں میری اس شرط پر بھی کوئی تعرض نہ ہوا۔ ہم سب نے وہیں کھڑے کھڑے سب طے کیا اور اپنی اپنی سمت چل پڑے۔

اب مجھے کسی ایسے موقعے کا انتظار تھا، جب عامر بن حبیب خود اپنی کاؤنسلر شپ میں داخلے کی پیش کش کرتا۔ اور یہ موقع مجھے قدرت نے بہت جلد فراہم کر دیا۔ ٹائم اسکوائر دھماکا کیس میں نیویارک پولیس کی مسلمان طلبہ کے خلاف کارروائیاں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں۔ چار دن بعد پولیس نے یونیورسٹی کی سڑک کے بالکل مخالفت سمت میں واقع ایشیائی ورکنگ بوائز کے ہاسٹل پر ریڈ کی تو ہماری یونیورسٹی کے طلبہ بھی باہر نکل آئے۔ عامر کے گروپ نے وہیں سڑک پر ناہنڈ کے اقدامات کے خلاف جلسے کا فیصلہ کر لیا، لیکن نیویارک پولیس نے پورے علاقے کو اپنے مخصوص نیلے اور سرخ ربن سے سیل کر دیا، جس پر بڑے بڑے حروف میں ڈونٹ کر اس لکھا ہوا تھا۔ طلبہ کی پولیس افسر سے بحث شروع ہو گئی۔ میں نے بھیڑ سے نکل کر، زور سے چلا کر دوسری جانب کھڑے پولیس والے سے کہا ”میں مسلمان ہوں، لیکن امریکن ہوں، مجھے کسی بھی گرفتار شدہ سے کوئی ہم دردی بھی نہیں لیکن تم لوگ ایک ہی لاشی سے ہم سب مسلمان طلبہ کو ہانکتے رہے، تو صرف اسی یونیورسٹی سے کئی ٹائم اسکوائر جیسے حادثے جنم لیں گے۔ ہم ناہنڈ کی عزت کرتے ہیں اور بدلے میں عزت چاہتے ہیں، اور بس“ میری بات سُن کر دونوں جانب خاموشی سی چھا گئی۔ پولیس والوں نے آپس میں کچھ گھسّر گھسّر کی اور ان میں سے ایک ہماری طرف چل کر آیا ”ہمیں یونیورسٹی کے لڑکوں سے کچھ سروکار نہیں اور ہمارے جانے کے بعد تم لوگ اپنا احتجاج جاری رکھ سکتے ہو، لیکن اس وقت ہمیں اپنا کام کرنے دو۔“ دونوں جانب سکون سا چھا گیا اور میں دوبارہ کیفے میرا کی طرف چلا آیا۔ کچھ ہی دیر بعد عامر بن حبیب اور اس کے چند ساتھی کیفے میرا میں داخل ہوئے۔ عامر سیدھا میری طرف چلا آیا ”مدد کرنے کا شکریہ۔ تم نے ایک بڑا جھگڑا شروع ہونے سے پہلے ہی ٹال دیا۔“ میں کافی کے سِپ لیتا رہا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ جو میرے بھائی کے ساتھ ہوا، وہ کسی اور بے گناہ کے ساتھ نہ ہو۔ ورنہ تمہارے گروپ میں تو ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو مدد نہ کر کے بھی احسان کی طرح جتاتے ہیں۔“ میرا طنز سن کر بابر سیدی نے گھور کر دیکھا، لیکن عامر نے فوراً کہا ”پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں آج ایک بار پھر تمہیں مسلم طلبہ کاؤنسلنگ گروپ میں شمولیت کی دعوت دیتا ہوں۔ تمہارے پاس دو بہت اہم چیزیں ہیں، جو مسلم طلبہ کے مسائل کو انتظامیہ تک پہنچانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک تمہاری امریکی شہریت اور دوسری تمہاری فائل کرنے کی صلاحیت اور ہمیں ان حالات میں ان دونوں کی اشد ضرورت ہے۔“ میں نے نیم رضامندی کا اظہار کیا ”سوچ لو، ہو سکتا ہے خود تمہارے گروپ میں میری شمولیت کو اچھی نظر سے نہ دیکھنے والے موجود ہوں۔“ عامر نے زور سے نفی میں سر ہلایا ”نہیں، ایسا کوئی نہیں ہے۔ ہم سب ایک اچھے مقصد اور مسلمان طلبہ کی مدد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ تمہیں دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔“ میں نے چند لمحوں سوچنے میں وقت گزارا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ لیکن مجھے اپنے فیصلے کرنے کا اختیار تو حاصل ہوگا نا؟“ عامر نے خوش ہو کر مجھے گلے لگا لیا ”ہم ہر فیصلہ مل جل کر کرتے ہیں۔ مسلمان طلبہ کی کابینہ میں خوش آمدید“ عامر سے گلے لگتے ہوئے، میری نظر بابر سیدی کی نظر سے ٹکرائی، جہاں شک کی گہری پرچھائیاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔ میری نظر نے اُس کی نظر سے کہا۔ ”تم لوگوں کے بُرے دن شروع ہو چکے ہیں مسٹر بابر سیدی، اب صرف اپنی بربادی کا انتظار کرو۔“..... (جاری ہے)





ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroupp.com.pk



اگلی صبح یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میری نظر کیفے میریا کے باہر ٹہلتی پڑوا پر پڑی۔ لمبے سفید اسکرٹ اور دھانی قمیص میں وہ بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری جانب لپکی۔ ”کہاں تھے تم، صبح نو بجے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کلاس میں کبھی تم پائے نہیں جاتے، یہی تمہارا ٹھکانہ ہے، لہذا اسٹیم ڈیرہ ڈال دیا میں نے۔“ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ ”سب خیر تو ہے نا؟“ ”ارے بھی، تم نے عامر بن حبیب کا گروپ جوائن کر لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ لگتا ہے آخر کار وہ تمہارے معیار کے فارمولے پر پورا اتر ہی گیا۔ ویسے میں تم سے خود بھی یہی کہنے والی تھی کہ میں نے ہر طرح سے عامر کو پرکھ کر دیکھا ہے، وہ تمہاری شرائط پر مکمل اترتا ہے، صرف نام کا مُسلم کاؤنسلر نہیں ہے، وہ عمل کا بھی پکا ہے۔ تب ہی تو سارے مسلمان طلبہ اس کے دیوانے ہیں۔ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے آیان۔“ میں نے کیفے میریا میں داخل ہونے سے لے کر اپنی مخصوص میز پر بیٹھنے تک پُروا کی یہ تمام تقریر اطمینان سے سُنی، لیکن کچھ ہی دیر میں یہ خبر میرے اپنے دوستوں تک پہنچی، تو اُن سب کا چین و اطمینان غارت ہو گیا۔ سب سے پہلے جینی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”کیا..... تم نے مُسلم گروپ جوائن کر لیا۔ بیڑہ غرق، اب گئے ٹم کام سے۔“ ایرک اور جم تو صدے سے کچھ بول ہی نہیں سکے، البتہ فرہاد نے پوری تقریر کر ڈالی۔ ”آیان..... تم نے وہ کام کیا ہے جو بُروٹس بھی نہ کر پایا ہوگا۔ ساری زندگی مذہب کی رواداری کا سبق دے دے کر ہمارے خیالات بدل ڈالے اور آخر میں خود اُن لوگوں سے جا کر مل گئے، جن سے ہمیں رویوں میں انتہا پسندی کا گلہ رہا ہے۔ قتل کر ڈالا تم نے میرے تمام نظریات کو ہمیشہ کے لیے۔“ کچھ ایسے ہی تاثرات کا اظہار گزشتہ شام بتام بھی کر چکا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس وقت صنم کبیر بھی اسپتال میں موجود تھی، ورنہ بتام کے سوالات کا سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ ”کیا..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ انو، تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ ساری زندگی ہم جن سے لڑتے آئے ہیں، تم اُن ہی کے ساتھ جا ملے ہو۔ سچ بتاؤ، یہ کیا معاملہ ہے؟ کیوں کر رہے ہو تم یہ سب؟“ میں نے اُسے صرف ایک ہی جواب دیا۔ ”جہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں، تم بس، جلد از جلد ٹھیک ہو کر گھر پہنچنے کی کرو۔“ صنم خاموش بیٹھی، ہم دونوں بھائیوں کے درمیان ہوتی ٹکرا سکتی رہی۔ مجھے اس کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ صرف اُسی وقت بات کرتی تھی، جب اُس بات کا مناسب وقت آ جاتا اور یہ وہی وقت تھا۔ اس نے بتام کی پھلوں کی ٹوکری سے ایک سیب نکال کر چھپلا۔ ”اگر آیان نے عامر بن حبیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو اس میں ایسی کیا بُرائی ہے۔ آخر وہ سب بھی تو مسلمان طلبہ کی مدد کے لیے ہی یہ سب مشکلات جھیلتے ہیں۔ نیویارک کی یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کاؤنسلر کی ذمہ داری سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اُسے اپنے تعلیمی کیریئر میں اس وجہ سے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ اس کی روزانہ جو کلاسز رہ جاتی ہیں، وہ ان کی کمی پُری کرنے کے لیے ہر سمسٹر میں ہزاروں ڈالر کی اضافی ٹیوشن فیس جمع کرواتا ہے۔ راتوں کو دیر تک لائبریری میں بیٹھ کر اپنے لیچرز مکمل کرتا ہے۔ مسلمان طلبہ کا حامی ہونے کی پاداش میں عیسائی اور یہودی انتظامیہ اور طلبہ کی باتیں الگ سننا پڑتی ہیں اُسے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ آیان نے دیر ہی سے سہی، مگر درست فیصلہ کیا ہے۔“ بتام نے صنم کبیر سے مزید بحث نہیں کی، لیکن اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں گہری ہوتی گئیں۔ ٹھیک اُسی طرح جیسی میرے سارے دوستوں کی آنکھوں میں تھیں۔ فرہاد نے تو فوراً فتویٰ ہی صادر کر دیا کہ میں نے پُروا کی وجہ سے عامر بن حبیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

میں ان سب کو کیفے میں اسی بحث میں الجھا چھوڑ کر ہال نمبر 3 کی طرف چلا آیا، جہاں مجھے آج صبح پُروا نے مسلم کاؤنسلر گروپ کی ہفتہ وار میٹنگ میں عامر کی جانب سے شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں اس چھوٹے سے ہال میں داخل ہوا، تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ سب نے خوش آمدید کہا۔ پُروا بھی وہیں موجود تھی اور سب ہی طلبہ کو اس میٹنگ کا ایجنڈا بانٹتی پھر رہی تھی۔ مجھے کاغذ پکڑاتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ ”خوش آمدید غصیلے لڑکے، اللہ کرے تمہارا آنا ہمارے لیے مبارک ثابت ہو۔“ میں مُسکرا دیا، البتہ اس ہال میں کوئی ایسا بھی تھا، جسے میرے آنے کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی، باربر سیدی، جو اس وقت اپنے گلے میں چار خانوں والا فلسطینی رومال باندھے کسی گہری سوچ میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اجلاس میں سب سے پہلے میری شمولیت کا اعلان کیا گیا اور پھر اس کے بعد اگلے ہفتے کے لیے ایک پلان ترتیب دیا گیا کہ کن مسائل پر یونیورسٹی انتظامیہ سے بات چیت کی جائے گی۔ جمع شدہ چندے کی تفصیل اور مستقبل قریب کے خرچے کی فہرست بھی پیش کی گئی۔ سچ یہ ہے کہ میں مُسلم طلبہ کو اس قدر مخمّم انداز میں اپنی تنظیم چلاتا دیکھ کر کافی حیرت زدہ بھی تھا، کیوں کہ باہر رہتے ہوئے ہم سب کی عامر بن حبیب گروپ کے بارے میں رائے بالکل مختلف تھی۔ ہم ان سب طلبہ کو صرف چند جذبہ باقی لڑکوں کا ٹولہ سمجھتے تھے، جو اپنی مسلمان شناخت کی ہٹا کے لیے یونیورسٹی میں یک جا ہوئے تھے، لیکن میں نے یہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ وہ سب عامر بن حبیب کی قیادت میں متحد اور بہت مخمّم انداز میں اپنے مقصد کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اُس روز جو فوری مسئلہ مُسلم طلبہ کی توجہ کا مرکز تھا، وہ یونیورسٹی کے احاطے یا ہاسٹل کی چار



دیواری میں کسی ایسے کمرے کی ضرورت کے بارے میں تھا، جہاں لڑکے ظہر کی نماز ادا کر سکیں، کیوں کہ عصر تک تو زیادہ تر مسلم طلبہ واپس ہاسٹل پہنچ جاتے تھے، لیکن ظہر کے اوقات میں سب ہی یونیورسٹی ہی میں موجود ہوتے تھے۔ کچھ ہی ماہ قبل طلبہ یونیورسٹی انتظامیہ سے دوپہر میں ظہر کے اوقات کے دوران پندرہ منٹ کا بریک لینے میں کامیاب ہو چکے تھے، جس میں وہ نماز ادا کر سکتے تھے، لیکن اب ان کی کوشش تھی کہ انہیں کوئی ایک کمرایا ہال بھی صرف پندرہ منٹ کے ان اوقات کے لیے مل جایا کرے، جہاں وہ سب اکٹھے ہو کر باجماعت نماز ادا کر سکیں۔ قاعدے کے مطابق پہلے مسئلہ پیش کیا گیا اور پھر سب ہی شرکاء سے رائے اور حل طلب کرنے کے لیے ووٹنگ شروع کی گئی۔ گویا وہاں سب کو اپنی اپنی رائے کے اظہار کی آزادی حاصل تھی۔ تقریباً نوے فی صد طلبہ نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ میں نے اپنی باری پر کھڑے ہو کر صرف اتنا ہی کہا کہ میرا ووٹ اکثریت کی طرف ہوگا، کیوں کہ یہ میرا پہلا دن ہے اور مجھے ان مسائل کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت مزید درکار ہے۔ ووٹنگ کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا کہ طلبہ اور انتظامیہ کے مابین ہونے والی اگلی پندرہ روزہ میٹنگ میں یہ مطالبہ یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ اجلاس برخاست ہونے سے پہلے مختلف مسلم طلبہ کو اگلے ہفتے کے لیے مختلف قسم کے ہارگنس دیے گئے، جن میں سب سے اہم نان ممبر مسلم اسٹوڈنٹس کو متحرک کرنا تھا۔ میں ہال سے نکلا، تو پُر و ابھی میرے ساتھ چل پڑی۔ ”کیسا رہا آج کا تجربہ تمہارے لیے؟“ میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”ٹھیک تھا، مگر کچھ ادھورا سا۔“ دراصل میں اس سے کچھ زیادہ کی امید کر رہا تھا۔ یہ لوگ تو ابھی تک مسجدوں اور نمازوں کے مسائل ہی سے باہر نہیں نکل پائے۔ کیا عامر بن حبیب اس یونیورسٹی کی 70 سالہ تاریخ میں پہلا مسلم کاؤنسلر منتخب ہوا ہے؟ یہ بنیادی باتیں تو پہلے طے ہو جانی چاہیے تھیں۔“ پُر و نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم ابھی بنیادی مسائل ہی میں اُلجھے ہوئے ہیں، لیکن شاید تمہیں اس بات کی خبر نہیں کہ یونیورسٹی کی ستر سالہ تاریخ میں عامر بن حبیب یہاں کا صرف تیسرا مسلم کاؤنسلر بنا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان طلبہ کو یہ سہولت حاصل ہی نہیں تھی، تب وہ صرف کسی عیسائی یا یہودی کاؤنسلر کے ذریعے اپنی بات انتظامیہ تک پہنچانے کے پابند تھے۔“ میں حیرت سے رُک گیا۔ ”اچھا، لیکن کیوں؟ اور اس کا مطلب ہے کہ مسلم کاؤنسلر کا عہدہ مسلمان طلبہ کے پاس آئے یہ صرف چھٹا سال ہے۔ حیرت ہے۔“ ”ہاں! یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ چھ سال پہلے تک مسلم کاؤنسلر کی سیٹ ہی نہیں تھی یونیورسٹی میں۔ اور پہلے دو مسلم کاؤنسلرز تو بے چارے یونیورسٹی انتظامیہ اور دیگر طلبہ کے دباؤ کے تحت از خود استعفیٰ دے گئے تھے، کیوں کہ ان کی اپنی پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا تھا اور وہ یونیورسٹی میں تعصب کا شکار بھی ہو رہے تھے۔“ میرے لیے پُر و کی یہ باتیں واقعی غیر متوقع تھیں۔ ”لیکن ایسا کیوں ہے، آخر یہ مٹھی بھر مسلم طلبہ کسی کا کیا بگاڑ لیتے، جو انہیں کام ہی نہیں کرنے دیا جاتا؟“ پُر و نے کسی گہری سوچ میں گم جواب دیا۔ ”شاید یہ سب اسلام سے خوف زدہ ہیں کہ سخت پابندیوں کے باوجود یہ امریکا میں گزشتہ دہائی کے دوران سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔“ میں پُر و کی بات سُن کر مزید اُلجھ گیا، پھر وہی مذہبی تخصیص..... ”لیکن اسلام کے تیزی سے پھیلنے سے امریکا کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہاں چند لاکھ مزید مسلمان جمع بھی ہو جائیں گے، تب بھی یہ یو ایس اے ہی رہے گا، ”اسلامستان“ تو نہیں بن جائے گا۔ میں نہیں مانتا کہ اتنی بڑی جمہوریت کو ایسی کسی بھی مذہبی تبدیلی کا کوئی خوف یا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ پُر و نے مجھ سے اس موضوع پر مزید بحث نہیں کی اور پُپ چاپ میرے ساتھ چلتی رہی، پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آئی۔ ”ارے ہاں! جتنی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا بھائی بیمار ہے۔ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ ویسے ایک بات ہے، تمہارا چھوٹا بھائی ہے کافی کیوٹ سا۔“ مجھے ہنسی آگئی۔ ”ہاں! وہ کیوٹ ضرور ہے، لیکن مجھ سے ایک سال بڑا ہے۔“ پُر و اکو شدید حیرت ہوئی۔ ”ارے..... واقعی؟ تو پھر بجائے اس کے کہ تم اس کے رعب میں رہو، وہ ہر وقت تم سے ڈانٹ کیوں کھاتا رہتا ہے؟“ ”کیوں کہ اُسے ڈانٹنے کے حقوق صرف میرے پاس محفوظ ہیں۔“ ”سُنا آ یاں! تم میرے ساتھ اردو میں کیوں بات نہیں کرتے۔ جانتے ہو اردو کو میں دنیا کی بہترین زبان سمجھتی ہوں۔“ ”کیوں.....؟ ایسی کیا خاص بات ہے اردو میں اور تمہارے بھارت میں تو اسی اردو کو بگاڑ کر ”ہندی“ کے نام سے بولا جاتا ہے۔“ پُر و کی آواز تیز ہو گئی۔ ”ہندی یا سنسکرت کے چند الفاظ شامل کر دینے سے ”اردو“ ہندی نہیں بن جاتی اور کون سی خاص بات ایسی ہے، جو اردو زبان میں نہیں ہے۔ کتنی وسیع لغت ہے اردو کی، ہر رشتے کے لیے اور اُس رشتے کے احترام کے لیے کتنے معنی موجود ہیں اس زبان میں اور یہ جو تم امریکن انگریزی کے کُن گاتے پھر رہے ہو، اس سے زیادہ غریب اور ناشائستہ زبان تو میں نے آج تک نہیں دیکھی، جس میں ماں باپ کے لیے بھی صرف ”تم“ کا لفظ موجود ہے۔ بس، میں نے طے کر لیا ہے کہ اب ہم دونوں اردو ہی میں بات کریں گے۔“ حسب معمول پُر و اپنا فیصلہ صادر کر کے اطمینان سے چیونگم چباتی رہی۔ ”ٹھیک ہے مس پُر و! ضمیر خان، لیکن خدا کے لیے اردو کی یہ مشق تب ہی جاری رکھنا، جب ہمارے دوست آس پاس موجود نہ ہوا کریں۔ یہاں محفل کے آداب کچھ مختلف ہیں۔“ پُر و نے بے پروائی سے کہا۔ ”سب جانتی ہوں میں۔ ویسے تم دونوں بھائی گھر میں تو اردو میں بات کرتے ہو گے نا؟ سچ، میری تو زبان ترس گئی ہے، یہاں ولایت میں دلی کی خاص اردو بولنے کے لیے۔“ پُر و کی زبان یوں ہی پڑ پڑ چلتی رہی اور ہم آگے بڑھتے گئے۔

اگلے چند دن میں بسام نے بھی یونیورسٹی آنا شروع کر دیا، لیکن اس کی فضا بہت ابھی باقی تھی، لہذا میں اُسے یونیورسٹی سے سیدھا گھر واپس لے جاتا۔ سیکسٹر کی فیس کے بارے میں بھی مجھے اس سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں نے کسی شرط کے عوض بیٹنگی رقم لے کر فیس ادا کی ہے، لیکن میں رفتہ رفتہ وہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ بسام جانتا تھا کہ میں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے میری بات پر یقین کرنا ہی پڑا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ دن بھی آ گیا، جب مسلم کاؤنسلر کی یونیورسٹی انتظامیہ سے پندرہ روزہ میٹنگ طے تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار یونیورسٹی کے ایڈمن بلاک میں قدم رکھا اور اُسی روز میں نے یونیورسٹی ڈین کو پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھا، ورنہ اس سے پہلے ہم صرف اُس کی آواز یا ویڈیو کا نظرس کے ذریعے بھیجے ہوئے ریکارڈ شدہ پیغامات ہی میں اُسے دیکھا کرتے تھے۔ ڈین بھاری تن و توش اور گہرے نظر کے چشموں کے ساتھ ایک سخت گیر شخصیت کا مالک تھا، جس کے کمرے کے باہر بڑی سی ”رابنسن پنٹرکس Robinsun patricks“ کے نام کی سنہری تختی لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں عیسائی اور یہودی طلبہ کاؤنسلرز بھی موجود تھے۔ ڈین نے بڑے مطمئن انداز سے میٹنگ کا آغاز کیا۔ ہر طالب کاؤنسلر کے ساتھ صرف تین ممبر کو اجلاس میں شرکت کی اجازت تھی اور عامر بن حبیب کے ساتھ میں اور بابر سیدی مسلم طلبہ کی جانب سے شریک تھے، لیکن ابھی تک میری نظر یہودی طلبہ کے کاؤنسلر شمعون کے پیچھے بیٹھے اس کے ساتھیوں پر نہیں پڑی تھی اور پھر جب تعارف کے وقت مائیکل کا نام پڑھا گیا، تو میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ مائیکل نے سب سے نظر بچا کر میری طرف دیکھ کر اپنی بانٹیں آنکھ دبائی، تو گویا وہ خود بھی یہودی گروپ کا ممبر تھا۔ مجھے ان کے منصوبے کے تانے بانے جڑتے دکھائی دیے تھے۔

اجلاس شروع ہوا، تو پہلے عیسائی اور پھر یہودی کاؤنسلر نے اپنے اپنے طلبہ کے چھوٹے چھوٹے مطالبے اور مسائل پیش کیے۔ ڈین نے موقع ہی پر احکامات جاری کر دیے، انتظامیہ کی ٹیم میں ڈین سمیت چار افراد تھے، جن میں ایک عیسائی اور ایک یہودی ممبر شامل تھا۔ مسلمان طلبہ کی فیکلٹی میں کوئی مسلمان استاد نہ ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کی جیوری میں کوئی مسلمان ممبر موجود نہیں تھا۔ مائیکل کو میں پہلے ہی عامر بن حبیب کے پہلے اجلاس کی تمام روداد بتا چکا تھا اور جب عامر بن حبیب نے کمپس میں نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرنے کی درخواست پیش کی اور یہودی گروپ کی جانب سے اس کی شدید مخالفت بہت مؤثر انداز میں پیش کی گئی، تو مجھے مائیکل کی وہ بے چینی سمجھ میں آ گئی، جو عامر بن حبیب کے اجلاس کی پہلی خبری کے لیے اس کے انداز سے



صاف ظاہر تھی۔ وہ لوگ اسی لیے عامر کے ایجنڈے کے بارے میں خبر رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ اس کے لیے انتظامیہ کی اہم میننگ، جسے پہلے مضبوط دلائل کے ذریعے مؤثر توڑ کر کے مسلم طلبہ کے منصوبے ناکام کر سکیں۔ شمعون نے پہلا اعتراض تو چھوٹے ہی داغ دیا تھا۔ ”نہیں نہیں، نماز کے لیے کوئی جگہ کیسے مخصوص کی جاسکتی ہے، پھر تو عیسائی طلبہ کے لیے کیسپس میں گر جا گھر اور یہودی اسٹوڈنٹس کے لیے سنی گوگ (یہودی عبادت گاہ) تعمیر کرنا پڑے گا۔ پھر تو یہ یونیورسٹی کیسپس کم اور مختلف مذاہب کا اکھاڑہ زیادہ بن جائے گا۔“ ڈین نے سر ہلایا۔ ”شمعون ٹھیک کہہ رہا ہے، کیسپس میں نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص نہیں کی جاسکتی۔“ عامر نے دفاع کیا۔ ”لیکن صرف مسلم طلبہ ہی کو دن میں پانچ مرتبہ یہ فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ چرچ یا سنی گوگ کی ضرورت تو تب پڑتی ہے، جب ان دو مذاہب کے طلبہ کو بھی روزانہ باقاعدگی سے اپنی عبادت کا کوئی وقت، کیسپس روٹین کے دوران یونیورسٹی میں گزارنا پڑتا اور ہم بھی تو صرف ظہر کے وقت چندرہ منٹ کے بریک کے دوران کسی کمرے یا چار دیواری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بڑی وقتی ضرورت ہے۔ اسے مستقل نہیں کیا جائے گا۔“ لیکن مائیکل کی اطلاعات کی بنیاد پر شمعون خوب تیاری کر کے آیا تھا۔ ”ہاں، مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ سال چھ ماہ بعد مسلم طلبہ اُسی جگہ کو مستقل مسجد بنانے کا مطالبہ نہیں کر دیں گے اور پھر اگر عیسائی اور یہودی طلبہ نے بھی ہفتے اور اتوار کی چھٹی کے دوران کیسپس میں عبادت کرنے کی ٹھان لی اور یہ ضد بحث چل پڑی، تو ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“ جیوری ممبر نے آپس میں کچھ دیر گھس گھس کر اور پھر ڈین نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ ”فیصلہ ہو چکا۔ تمام جیوری ممبر کیسپس میں کسی مخصوص جگہ پر نماز کی ادائیگی کے حق میں نہیں ہیں، لہذا یہ معاملہ یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

ہم لوگ ڈین کے کمرے سے باہر نکلے تو شمعون نے طنز یہ انداز میں عامر کی جانب جملہ اُچھالا۔ ”ہم سب تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں عامر بن حبیب..... بیٹرک نیکسٹ ٹائم۔“ شمعون کی بات سن کر اس کے سب ہی ساتھیوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بابر سیدی غصے میں ایک قدم آگے بڑھا، لیکن عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور خوش دلی سے شمعون کو جواب دیا۔ ”بس تم یوں ہی دعا کرتے رہا کرو۔ عبادت میری ہو یا تمہاری، اس کی ادائیگی میں مقابلہ کیسا؟“ شمعون اور عیسائی کاؤنسلر جارج اپنے اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ بابر ابھی تک شدید غصے میں تھا۔ ”ایسا لگتا ہے، جیسے انہیں ہمارے ایجنڈے کی پہلے سے خبر تھی، ورنہ اتنی مکمل تیاری کر کے تو یہ لوگ پہلے کبھی بھی نہیں آئے؟“ بولتے وقت بابر کی نظر میری جانب ہی مرکوز تھی۔ عامر نے اسے تسلی دی۔ ”اس بار ان کی تیاری زیادہ نہیں، شاید ہماری کچھ کم تھی۔ بہر حال، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے بات آگے پہنچا دی ہے، رفتہ رفتہ انہیں قائل بھی کر لیں گے۔“ لیکن میں خود عامر کے چہرے پر مایوسی کے ہلکے سائے اسی وقت دیکھ چکا تھا، جب ہم ڈین کے کمرے سے نکل رہے تھے۔ دوسری جانب یونیورسٹی سے واپسی پر مجھے مائیکل گروپ نے پارکنگ لاٹ میں دیکھا تو خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ ”زبردست یہ ہوئی نا بات۔ پہلی ضرب ہی میں عامر بن حبیب کو ادھوا چت کر دیا ہے تم نے۔ تمام مسلم طلبہ میں اس فیصلے سے شدید مایوسی پھیل چکی ہے۔ ایک آدھ بار اگر پھر ایسا ہوا تو اُسے اپنی مسلم کاؤنسلر کی سیٹ بچانا مشکل ہو جائے گا۔ یو آر گرینٹ آیان۔“ وہ شور مچاتے اور ہنستے گاتے وہاں سے پلٹے تو بتام کو میں نے پارکنگ لاٹ کے آغاز میں کھڑے دیکھا۔ ”کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ؟“ میں نے بات ٹالی۔ ”کچھ نہیں، کلاس کی کوئی بات تھی۔ تم چلو، دیر ہو رہی ہے۔“ بتام وہیں کھڑا رہا۔ ”نہیں انو..... مجھے یہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے، تم اتنے پراسرار کیوں ہوتے جا رہے ہو۔ آج سے پہلے تو ہم دونوں میں کوئی راز نہیں تھا۔“ میں نے اُسے زبردستی کھینچ کر بائیک پر بٹھا دیا۔ ”تمہاری یہ جیمز بونڈ بننے کی عادت نہ گئی کبھی۔ کہہ جو دیا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ چلو، اب جلدی کرو۔ ابھی تمہیں رات کا کھانا بھی تیار کرنا ہے۔ میں اتنے دن سے بد مزہ پڑا اور برگر کھا کھا کر تھک گیا ہوں۔“ بتام سارے راستے خاموش سا رہا، لیکن میں جانتا تھا اس کے ذہن میں گھلایا تاشک کا کیڑا اب اسے بے چین رکھے گا اور پھر اگلے تین ہفتوں میں مسلم کاؤنسلر کا گراف روز کی بنیاد پر تیزی سے نیچے آتا چلا گیا۔ عامر بن حبیب مختلف مسائل پر مسلم طلبہ کی نمائندگی مناسب طور پر نہ کر سکا، جس میں حلال کھانے کا الگ کاؤنٹر نہ کھولے جانے پر تو ٹھیک ٹھاک ہنگامہ ہوا اور مسلم طلبہ نے کیفے کا بائیکاٹ بھی کیے رکھا اور پھر بعد مشکل میں نے لڑکوں کو راضی کیا۔ اس دوران میری بابر سیدی سے دو تین بار شدید جھڑپ بھی ہوتے ہوئے رہ گئی، لیکن ہمارے درمیان دشمنی روز بہ روز بڑھتی ہی گئی اور اگر ہر بار عامر بن حبیب درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع نہ کروا تا تو ہم اب تک ضرور لڑ چکے ہوتے، خاص طور پر اُس دن جب بابر نے یہ اعتراض کر دیا کہ میں باقی مسلم طلبہ کی طرح نماز کے وقت، نماز ادا کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ وہ مجھے مذہب کا درس دینے کے بجائے اپنے مذہب کی فکر کرے اور سب کے ایمان کا ٹھیکے دار بننے کی کوشش نہ کرے۔ بات بہت بڑھ گئی، لیکن اس موقع پر بھی عامر ہی نے فیصلہ دے دیا کہ اُن کے منشور میں کسی بھی طالب علم پر کوئی مذہبی پابندی نہیں لگائی جاسکتی، نہ ہی اُسے عبادت کے لیے زبردستی مجبور کیا جاسکتا ہے، لیکن بابر نے عامر کو احتجاجاً اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ ان حالات میں، میں مزید مسلم طلبہ کے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتا۔ بڑی مشکل سے لڑکوں نے بابر کا غصہ ٹھنڈا کیا، لیکن عامر بن حبیب کے گروپ میں جو دراڑ پڑ چکی تھی، وہ روز بہ روز بڑھتی ہی گئی۔ میرا مائیکل سے کیا ہوا معاہدہ اپنی تکمیل کے قریب پہنچنے لگا تھا، لیکن جانے کیوں میں اندر سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ عامر بن حبیب ایک شریف انٹنس اور اعلیٰ خاندانی لڑکا تھا، جس نے براہ راست میرا کبھی کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مجھے مسلم کاؤنسلر گروپ کی پالیسیوں سے اختلاف ضرور تھا، لیکن ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مجھے ان کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بھی پتا چلیں، جو میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ مجھے مذہب کی بنیاد پر تخصیص بہت بُری لگتی تھی، لیکن میں نے ان دنوں محسوس کیا کہ مسلم طلبہ کو اس مذہبی پہچان کی بنیاد پر اکٹھا کرنے میں خود یونیورسٹی انتظامیہ اور دیگر گروہوں کی مذہبی سرگرمیوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مسلمانوں کو ہمیشہ ہی یہ احساس دلا کہ علیحدہ اکٹھا ہونے پر مجبور کیا گیا کہ وہ کم زور ہیں اور متحد نہ ہوئے تو بہت جلد مٹا دیے جائیں گے۔ نیویارک شہر میں ابھی ٹائم اسکوائر بم کیس کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُس پاکستانی ڈاکٹر کی سزا سنائے جانے کا وقت قریب آنے پر، ایک بار پھر یہ بحث گلیوں میں موضوع بحث بنتی گئی کہ آیا وہ دھان پانسی عورت مجرم ہے یا نہیں؟ لیکن عامر بن حبیب کی گرفت مسلم طلبہ پر کم زور ہونے کی وجہ سے مسلم طلبہ اُن تمام ایٹشوز پر متحد ہو کر اپنا کوئی موقف پیش کرنے میں ناکام رہے۔ اسلام پر بحث چھڑتی گئی اور مسلمان طلبہ کو اپنا دفاع کرنا مشکل ہوتا گیا اور پھر ایک دن وہ سب کچھ ہو گیا، جس نے ہم سب کی زندگیوں میں ایک نئے طوفان کو جنم دے دیا۔ بتام کی گرفتاری کے ڈیڑھ ماہ بعد اچانک ہی اس کی ضمانت منسوخ کر دی گئی، کیوں کہ ٹائم اسکوائر بم والے کیس کے ملزم کے بیان کی روشنی میں چھاپوں کی ایک لہر کے دوران اس کے دو قریبی ساتھی اسی علاقے سے پکڑے گئے تھے، جہاں بتام نے بیماری ختم ہونے کے بعد پھر سے اپنی شام کی نوکری شروع کر دی تھی۔ مجھے یہ خبر شام کو عارفین ماموں نے فون پر دی، جب میں یونیورسٹی میں موجود تھا۔ عامر بن حبیب نے اُسی وقت بتام کی گرفتاری کے خلاف طلبہ کو مظہم کیا، کیوں کہ یہ ہماری یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم کی گرفتاری کا معاملہ تھا، لیکن اس بار نیویارک پولیس پہلے ہی سے ہوشیار تھی اور جیسے ہی وہ احتجاج کرتے ہوئے یونیورسٹی سے باہر سڑک پر آئے، اُن پر تیز ٹھنڈے پانی کی دھاریں ماری گئیں اور پھر جب لاشی چارج سے بات نہ بنی، تو ربر کی گولیاں بھی فائر کی گئیں۔ عامر بن حبیب کو اس طرح بے جگری سے بابر سیدی کے ساتھ بتام کے لیے لڑتے اور ساری رکاوٹیں توڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر میرے اندر کا جوش بڑھتا گیا۔ عامر کیا جانتا تھا کہ جس کے بھائی کی رہائی کے لیے وہ اپنے جسم پر لا تعداد ضربات جھیل رہا ہے، وہی آیان اُس کی پیٹھ میں مچھر اگھوپ چکا ہے۔ بابر سیدی نے بھی اس روز جم کر عامر کا ساتھ دیا، لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ پولیس اتنی جلدی وہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟ میں تو بتام کی گرفتاری کی خبر سننے ہی یونیورسٹی سے لاگ اپ چلا آیا تھا اور یہ تمام مناظر، میں ملاقاتیوں کے ہال میں لگے بڑے ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہا تھا، جس پر شہر کی براہ راست کوریج دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں مائیکل کا جملہ گونجا ”کون جانے، تم سے پہلے ہی ہم اپنا کوئی ٹھہر عامر بن حبیب کے گروپ میں شامل کر چکے ہوں۔“ ضرور یہ اُسی مجر کی کارستانی تھی، جس نے مسلم طلبہ کے یونیورسٹی میں جمع ہونے سے پہلے ہی نیویارک پولیس کو اس جیسے سے آگاہ کر دیا تھا، پھر اچانک ٹی وی اسکرین ہی پر میں نے یونیورسٹی کے ڈین کو نمودار ہوتے دیکھا، جس نے ڈسپلن توڑنے کے جرم میں عامر اور بابر سیدی کو چھ ہفتوں کے لیے معطل کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں رات گئے بتام سے مل کر دوبارہ یونیورسٹی کے ہاسٹل ایریا میں پہنچا، تو مسلم طلبہ کے ہاسٹل پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ عامر بن حبیب اور بابر کو پولیس سے مذہبیٹر کے دوران کافی چوٹ آئی ہے، خاص طور پر عامر بہت تکلیف میں ہے۔ میں ڈوبتے دل کے ساتھ عامر کے کمرے میں پہنچا، تو سب ہی وہاں جمع تھے۔ میں نے عامر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“ بابر، عامر کے سر ہانے ہی بیٹھا تھا۔ عامر نے مُسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”تمہیں میری اور بابر کی چھ ہفتے کی معطلی کا تو پتا چل گیا ہوگا، لیکن رمضان بالکل قریب ہے اور ان حالات میں مسلم طلبہ کو پنا کاؤنسلر نہیں چھوڑا جاسکتا، لہذا ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے تین ماہ کے لیے تمہیں مسلم طلبہ کاؤنسلر بنادیا جائے۔ تمہیں کل ہی سے اپنی ذمہ داری سنبھالنی ہوگی آیان۔“ میرے سر پر جیسے کوئی بم سا پھٹا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔..... (جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عامر! میں بھلا مسلم کا وٹسٹر کی ذمے داریاں کیسے سنبھال سکتا ہوں، مجھے تو گروپ جوائن کیے بھی بمشکل ڈیڑھ ماہ ہوا ہے، اور پھر باقی سب مجھ سے سینئر ہیں۔ تم انہی میں سے کسی کو یہ ذمے داری سونپ دو۔“ عامر نے اصرار کیا ”یہ فیصلہ انہی تمام سینئر مسلم طلبہ کے مشورے ہی سے کیا گیا ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”صرف چھ ہفتے ہی کی تو بات ہے۔ یہ عرصہ تو کوئی بھی دوسرا سینئر تمہارے معاملات دیکھ کر گزار سکتا ہے۔ چھ ہفتے کے بعد تم دونوں بحال ہو جاؤ گے، تو یونیورسٹی آتے ہی دوبارہ اپنی ذمے داریاں سنبھال لینا۔“ عامر نے گہری سانس لی ”یہی تو مسئلہ ہے دوست۔ ڈین نے ہم دونوں کو چھ ہفتے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر معطل کیا ہے۔ یونیورسٹی کے آئین کے مطابق کوئی بھی اسٹوڈنٹ کا وٹسٹر اگر چار ہفتے تک اپنی ذمے داریاں نہ نبھائے، تو اس کی نشست خالی قرار دے دی جاتی ہے۔ اسی آئین کی دوسری شق یہ ہے کہ کا وٹسٹر کی غیر موجودگی میں اگر اس مذہب کے طلبہ کا گروپ کسی دوسرے کا وٹسٹر کو عبوری مدت کے لیے منتخب کرنا چاہے تو یہ عرصہ کم از کم تین ماہ کا ہونا چاہیے۔ اس تین ماہ کے عرصے کے بعد دوبارہ کا وٹسٹر کا انتخاب کیا جائے گا، لیکن مسلم طلبہ کے پاس درمیانی مدت کا کا وٹسٹر منتخب کرنے کے لیے صرف دو ہفتے یعنی پندرہ دن کا وقت ہے۔ اس مدت میں اگر وہ کوئی عارضی کا وٹسٹر نہ چن سکیں تو اگلے تین ماہ انتخابات ہونے تک انہیں بنا کسی رہنما کے گزارنے ہوں گے اور یقیناً جانو، یہ بہت برا ہوگا۔ ہم پہلے ہی بہت سے اہم معاملات میں شکست کھا چکے ہیں۔ بس، یہ ہماری آخری شکست ثابت ہوگی۔“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں عامر کو کس طرح قائل کروں۔ گویا عامر کی مسلم کا وٹسٹر شپ ختم ہو چکی تھی اور مسلم طلبہ کی دوسری امید بابر سیدی بھی اگلے تین ماہ تک کا وٹسٹر نہیں بن سکتا، کیوں کہ اب انتخابات تین ماہ بعد ہی ہو سکتے تھے۔ مائیکل گروپ نے بہت سوچ سمجھ کر چال چلی تھی اور ڈین کے پنے تلے فیصلے سے تو یہ بھی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بھی عامر بن حبیب کی کا وٹسٹر شپ ختم کرنے کے لیے کسی ایسے ہی موقع کے انتظار میں تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک شک نے سرا بھارا۔ کہیں خود ڈین بھی اس منصوبے کا ایک حصہ نہیں؟ میں نے بے چارگی سے عامر کی طرف دیکھا، ”لیکن اگر تم لوگ جانتے تھے کہ اس احتجاج کا نتیجہ اس قدر نقصان دہ اور انتہائی بھی نکل سکتا ہے تو تمہیں اور بابر کو ایک ساتھ باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا، کم سے کم تمہاری معطلی کی صورت میں کوئی متبادل تو باقی رہتا مسلم طلبہ کی رہنمائی کے لیے۔“ عامر مسکرایا ”یہ تم بابر سے ہی پوچھو، میں نے آتے ہوئے اسے منع بھی کیا تھا۔“ بابر دوسرے بستر پر خاموش نیم دراز تھا۔ ”مجھے یہودی لڑکوں میں سے کسی نے اطلاع دی تھی کہ عامر پولیس کی شیلنگ سے زخمی ہو گیا ہے، ہلا کے بتر ہورہے ہیں۔ اس لیے مجھے عامر کو ریسکیو کرنے کے لیے باہر آنا پڑا۔“ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے دل میں بابر سیدی کے لیے بے پناہ عزت کے جذبات ابھرے۔ وہ اجد تھا، بدتمیز اور لڑاکا تھا، لیکن وفادار تھا اور اس دور میں ”وفا“ ہی تو ایک ایسی صنف ہے، جو ناپید ہو چکی ہے۔ کہاں ملتی ہے آج کل وفا؟ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والے بھی وقت بدلتے ہی چہرے موڑ کر چل پڑتے ہیں۔ میں نے انکار میں سر ہلایا ”مجھے افسوس ہے عامر! میں خود کو اس ذمے داری کے قابل نہیں سمجھتا اور اگلے چند دن مجھے بسام کی رہائی کے لیے دن رات ایک کرنا ہوں گے۔ ایسے میں مسلم کا وٹسٹر کی ذمے داریاں نبھانا میرے لیے ناممکن ہے۔ تم لوگ کوئی دوسرا لیڈر چن لو۔“ میں ان کا جواب سنے بغیر ٹوٹے قدموں سے وہاں سے واپس چلا آیا۔ آج پہلی بار مجھے اپنے اندر کے آیان سے نظریں ملاتے ہوئے بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ ساری رات خود سے نظریں چراتا رہا۔ اگلی صبح یونیورسٹی میں بھی ایک ہی موضوع گفتگو تھا کہ عامر بن حبیب کے سسپینڈ ہو جانے کے بعد اب مسلم طلبہ کا اگلا کا وٹسٹر کون ہوگا یا پھر مزید چند سال مسلم طلبہ کو بنا کسی نمائندے کے گزارنے ہوں گے۔ مائیکل نے مجھے لان میں الگ تھلگ گرتے پتوں کی چادر تانے دیکھا تو وہ لوگ لپک کر میرے قریب آ گئے۔ ”تم کمال ہو بانیو تک بوائے، لوگ برسوں میں جو کام نہ کر سکے، تمہاری مدد سے ہم نے ہفتوں میں کر دکھایا، آج اس خوشی میں ہم ایک گرانڈ پارٹی دے رہے ہیں، تمہیں بھی ضرور آنا ہوگا۔“ میں نے غور سے مائیکل کو دیکھا ”تم لوگوں نے اپنے کسی منبر کا ذکر بھی کیا تھا مجھ سے، مجھے آج تک اس کا نام نہیں بتایا؟“ مائیکل زور سے ہنسا ”معاف کرنا، شروع شروع میں ہم تم پر بھی پورا اعتبار نہیں کر پارہے تھے، کیوں کہ تم مسلمانوں کی جذباتی رگ پھڑکنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا، لیکن تم نے واقعی خود کو مردِ عہد ثابت کیا ہے، لہذا اب تمہیں اس سے ملوانے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی تمہارا وعدہ پورا ہو چکا اور ہماری راہ کا سب سے بڑا کاٹنا ہمیشہ کے لیے نکل چکا۔ اب ہم اتنی آسانی سے عامر کو دوبارہ مسلم کا وٹسٹر نہیں بننے دیں گے۔ یہ لو، وہ خبر ای



جانب آرہا ہے۔“ میں نے مائیکل کے ہاتھ کے اشارے کی جانب تیزی سے گردن موڑی، میرا دل ڈوب سا گیا۔ سامنے سے اکیڈمک بلاک کی سیڑھیاں اترتے پُر وانظر آئی۔ ”کون..... پُر وا.....؟“ مائیکل ہنسا ”ارے نہیں، اس بھارتی لڑکی کے پیچھے دیکھو۔“ اور پھر دوسرے ہی لمحے پُر وا کے عقب سے کینے کا پرانا بیراجوزف، جو مسلم طلبہ کی ہر میٹنگ میں چائے، کافی اور اسٹیکس وغیرہ کی فراہمی پر مقرر تھا، ہاتھ میں ایک ٹرے لیے ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔

جوزف نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری، گویا وہ بھی میرے کردار سے واقف تھا۔ پل بھر میں مجھے اس کا تمام میٹنگ کے دوران کسی نہ کسی بہانے آس پاس منڈلاتے رہنا اور بار بار مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کا پوچھنا یاد آگیا، اس کا مطلب تھا کہ مائیکل نے اسے میری نگرانی پر بھی لگا رکھا تھا، کیوں کہ وہ تمام وقت تو ہال میں موجود نہیں رہ سکتا تھا، لہذا وہ اس بات کی یقین دہانی بھی کرتا ہوگا کہ میں اپنا کردار ٹھیک سے ادا کر رہا ہوں کہ نہیں۔ اسے کہتے ہیں پرفیکٹ پلان۔ پُر وا کو میری جانب آتے دیکھ کر وہ لوگ وہاں سے ٹل گئے، پُر وا نے قریب آ کر پوچھا ”کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ، ضرور عامر بن حبیب والے واقعے پر طنز کر رہے ہوں گے۔“ میں چپ رہا، پُر وا ابھی کافی پریشان ہی دکھائی دے رہی تھی۔ ”آیا ان اب کیا ہوگا؟ آخر تم یہ ذمے داری کیوں نہیں سنبھال لیتے۔ یہ وقت تمام مسلم طلبہ کے لیے بہت نازک ہے، ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ خدا خدا کر کے تو مسلم طلبہ کو ایک پلیٹ فارم میسر آیا تھا، وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ میں الجھ کر بولا ”آخر تم لوگ یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ مسلم کاؤنسلر بننے کے لیے کسی طالب علم میں جن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، میں ان سے قطعی نااہل ہوں۔ مجھے تو دن میں پڑھی جانے والی پانچ نمازوں کی مکمل رکعتوں کا بھی ٹھیک سے نہیں پتا۔ میں اور بسام ڈیڈ کے ساتھ صرف عید کی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ جن اصولوں کی بنیاد پر مسلم کاؤنسلر کو انتظامیہ سے اپنا کیس لڑنا ہوتا ہے، میں ان سے زیادہ تر سے اتفاق ہی نہیں کرتا۔ میں مذہب کی بنیاد پر انسانوں کی گروہوں میں تقسیم کے ہی خلاف ہوں۔ میرے نزدیک سب ہی انسان برابر ہیں۔ کوئی بھی مذہب انہیں میرے نزدیک اہم یا غیر اہم نہیں بناتا۔ میرے نزدیک تو مذہب کسی کی شناخت کا ذریعہ بھی نہیں۔“ پُر وا نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”تو پھر تم نے مسلم طلبہ میں شمولیت کیوں اختیار کی تھی؟“ میں صرف اتنا ہی کہہ کر آگے چل پڑا ”بس یوں سمجھ لو کہ وہ میری ایک مجبوری تھی۔ ایک عہد کر بیٹھا تھا کسی سے، جس کا نبھانا فرض ہو چکا تھا میرے لیے۔“ پُر وا وہیں درخت کے نیچے گم صم کی کھڑی رہ گئی اور خزاں رسیدہ چٹوں نے اس کے وجود کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔ کاش میرے اندر کے اس ننگے بچ کو ڈھانپنے کے لیے بھی کوئی خزاں اپنے پتے اسی طرح برسا پاتی۔

عرفی ماموں مجھے عدالت کی سیڑھیوں ہی پر کھڑے ملے گئے۔ آج بسام اور دیگر تین لڑکوں کی تیشی تھی۔ ”کہاں رہ گئے تھے، وہ لوگ ابھی کچھ دیر پہلے ان تینوں کو عدالت لے گئے ہیں۔“ میں ماموں کے ساتھ عدالت میں داخل ہوا تو بسام کو طرزموں کی مخصوص نشست پر بیٹھا دیکھ کر دل کٹ سا گیا۔ جی چاہا کہ اپنے نازک مزاج بھائی کا ہاتھ پکڑوں اور کہیں دور لے جاؤں۔ حکومت کا وکیل اور نیویارک پولیس کے نمائندے بسام اور دیگر لڑکوں کو مشکوک اور دہشت گرد بنا کر پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے ان کا وکیل کچھ زیادہ منطقی اور پُر اعتدال نظر نہیں آیا اور یہی بات عرفی ماموں نے بھی محسوس کی۔ ”یہ گدھا یہاں پنے بیچنے کے لیے آیا ہے کیا، پولیس کے الزامات کا ٹھیک سے جواب کیوں نہیں دے رہا یہ بسام کا وکیل؟“ جج نے بسام کے وکیل کو تیاری کے لیے ایک ہفتے کا وقت دے کر پیشی ختم کر دی اور تب تک سب ہی طالب علموں کو تحویل میں رکھنے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ میں غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، لیکن عرفی ماموں نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ ”یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش کا ہے۔“ تیشی سے واپسی پر عدالت سے باہر راہ داری میں میری چند لہجوں کے لیے بسام سے بات ہوئی، وہ پُر سکون تھا۔ ”انویار! پریشان مت ہونا۔ یہ سارے گورے ہمیں بنا کسی ثبوت کے زیادہ دن اندر نہیں رکھ پائیں گے۔“ مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بسام کو گلے لگا لیا۔ میرا معصوم بھائی میری تسلی کی خاطر خود کو مضبوط کر رہا تھا، ورنہ میں جانتا تھا کہ وہ یہ سات دن کس عذاب میں گزارے گا۔ ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو وہ بستر مرض سے اٹھا تھا۔ ابھی اس کی چہرے کی پیلی رنگت بھی نہیں دھلی تھی۔ میں نے اس کے شانے دبائے ”تم بے فکر رہنا، اگر تمہیں لاک اپ تو ذکر بھی نکالنا پڑا تو میں نکال کر ہی دم لوں گا۔ بس ہمت نہ ٹوٹنے پائے۔ تمہیں مجھ پر اعتبار ہے نا؟“ بسام نے ٹوٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا، ”ہاں انو! مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“ عرفی ماموں ایک جانب کھڑے ہم بھائیوں کی یہ ساری گفتگو چپ چاپ سنتے رہے اور پھر وہ بسام کو لے گئے۔ میں ماموں کی طرف پلٹا تو انہوں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں ”جس کا آیاں جیسا بھائی ہو، اسے بھلا پھر کس بات کی فکر بھانجے۔“ لیکن خود میری فکر اور پریشانیوں کے دن اب طویل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اگلے روز نوٹس بورڈ پر بسام کی یونیورسٹی سے معطلی کا نوٹس لگا ہوا تھا۔ اسے کیس کی کارروائی کے دوران یونیورسٹی سے معطل کر دیا گیا تھا، کیوں کہ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی عدالتی کارروائی میں ملوث طالب علم کو کیس کا فیصلہ ہونے تک یونیورسٹی کی حاضری لسٹ میں شامل نہیں رکھا جاسکتا تھا اور ایک دن کی بھی عدالتی سزا ملنے کی صورت میں وہ طالب علم ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے فارغ کر دیا جاتا تھا۔

کینے میں اسی بات پر شدید بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جم اور ایرک، فرہاد سمیت انتظامیہ کے فیصلے پر سخت تنقید کر رہے تھے کہ کم از کم جب تک عدالت کسی کو بے گناہ یا قصور وار قرار نہ دے ڈالے، تب تک طالب علم کو معطل کیے رکھنا سراسر نا انصافی ہے۔ میں اس بحث سے لاتعلقی، چپ چاپ ان سب کے درمیان بیٹھا کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ کسی پیرے نے مجھے پُر وا کے ہاتھ کی لکھی ایک چٹ پہنچائی۔ ”ہم سب ہال نمبر 3 میں بسام کی گرفتاری پر اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں، تم بھی وہیں پہنچو۔“ اپنے دوستوں سے کچھ دیر کی معذرت کر کے میں ہال نمبر 3 میں پہنچا تو جوزف سب کو کافی پیش کر کے ہال سے نکل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی کمینہ سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد انڈر ویشمن صالح کو کہہ کر دروازہ اندر سے بند کروایا، لیکن آج جتنے منہ، اتنی ہی باتیں تھیں۔ میٹنگ میں کوئی نظم و ضبط نہیں تھا اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ عامر بن حبیب کے بغیر وہ تمام بنا کسی گڈ ریئے کے بھٹکتی ہوئی بھڑکیں تھیں۔ وہ سب بسام کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے، لیکن کیا.....؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ پُر وا نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ ”اسی لیے میں کسی لیڈر کو بچنے پر زور دے رہی تھی۔ اس طرح تو یہ سب آپ میں ہی لڑتے رہیں گے اور پندرہ دن کا وقت یونہی گزر جائے گا۔ اگر تم خود ان کا کاؤنسلر نہیں بننا چاہتے، تو کم از کم ان کے ساتھ مل کر انہیں اپنا ایک نمائندہ چننے میں مدد تو دے سکتے ہو؟“ اجلاس بنا کسی فیصلے کے ختم ہو گیا۔ ہال سے نکلتے نکلتے سوڈانی احمر نے سب کو یاد دہانی کروائی کہ ہر سال اس بار بھی بیت المقدس سے مشہور خطیب شیخ الکریم اپنے سالانہ لیکچر کے لیے نیویارک پہنچ رہے ہیں اور وہ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں موجود جامع مسجد میں خطاب کریں گے۔“ میں نے وہیں معذرت کر لی کہ شاید میں اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکوں، لیکن احمر نے مجھے یہ کہہ کر بانڈھ دیا کہ وہ یہ بات عامر بن حبیب کی خصوصی ہدایت اور درخواست پر کہہ رہا ہے۔ عام حالات میں عامر خود تمام طلبہ کو لے کر وہاں جایا کرتا تھا، لیکن اس بار وہ اپنی طبیعت اور معطلی کے باعث ایسا نہیں کر پائے گا، لہذا اس نے مجھے خاص طور پر یہ پیغام دیا تھا کہ میں ان سب کو جمع کر کے شیخ صاحب کی خدمت میں حاضری ضرور دوں۔ نہ جانے کیوں میں عامر کی درخواست رد نہیں کر سکا اور اگلے روز ہم سب مسلم طلبہ ڈین سے یونیورسٹی کی بس لاٹ کروا کر چائنا ٹاؤن پہنچ گئے، جن طلبہ کا وضو نہیں تھا، انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی، لیکن میں مسجد کے صحن میں ہی بیٹھا رہا۔ کچھ دیر میں جماعت ختم ہوئی تو شیخ الکریم باقی طلبہ کے ساتھ صحن میں آ گئے۔ وہ ایک پُر نور چہرے والے بزرگ تھے، جو مخصوص عربی لباس میں ملبوس تھے، نئے طلبہ کا ان سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے مجھے الگ تھلگ بیٹھے دیکھا تو مجھ سے ہاتھ ملا تے وقت پوچھ بیٹھے۔ ”کیوں لڑ کے تم نے نماز نہیں پڑھی کیا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا ”نہیں..... مجھے ٹھیک طرح سے نماز ادا کرنا نہیں آتی۔“ وہ مسکرا دیے ”اچھا! تو یہ تو ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ جماعت



کے ساتھ کھڑے ہو جایا کرو اور جیسا امام اور باقی مقتدی کریں، کرتے جاؤ، دھیرے دھیرے ساری آیات اور دعائیں یاد ہو جائیں گی تمہیں۔“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس بات پر سخت سرزنش کریں گے کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ میں خود کو مسلمان کہتا ہوں اور ٹھیک طرح سے نماز تک ادا نہیں کر سکتا، لیکن انہوں نے تو اس بات کا دوبارہ تذکرہ بھی نہیں کیا اور ہم سب کے بیٹھ جانے کے بعد لیکچر شروع کر دیا۔ ان کے لیکچر کا موضوع، یورپ اور امریکا میں اسلام کی ترویج اور مسائل تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی شیخ صاحب کے فصیح انداز گفتگو کے سبب ان کی باتیں سننا رہا۔ ان کا کہنا تھا کہ ”اسلام کے ان علاقوں میں پھیلنے سے کسی کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ صرف مذہب کی بنیاد پر سلطنت فتح ہو جائے اور مذہب پھیلانے کا مقصد بھی کسی کی ریاست حاصل کرنا ہرگز نہیں۔ مذہب تو ایک ضابطہ حیات کی طرح ہے، تقریباً ہر مذہب میں بری باتوں کو برا اور اچھی باتوں کو اچھا ہی کہا گیا ہے۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ کس ضابطہ حیات کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ یہ حیثیت مسلمان، ہم سب کا ہی ایمان ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے بہترین مذہب اور ضابطہ حیات ہے۔ شاید وہ جو اسلام کی مخالفت میں حد سے گزر کر اسے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، انہیں بھی یہ خبر ہے کہ اسلام ہی بہترین ہے اور یہی خوف انہیں اس کی شدید مخالفت پر ابھارتا ہے، لیکن ہمیں اس صورت حال میں بھی صبر اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر وہ اپنی خونیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اپنی وضع کیوں بدلیں؟ سچ ہی آخری جیت کا حق دار ہوتا ہے۔ ابھی کسی طالب علم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ فرانس میں حجاب پر مکمل پابندی سے انہیں کیا حاصل ہوگا، تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس سے فرانس کے معاشرے پر تو شاید کوئی خاص فرق نہ پڑے، لیکن یہ حجاب کا خوف ظاہر کرتا ہے کہ وہاں بھی کچھ عناصر اسلام کی پھیلتی شناخت سے بے حد خوف زدہ ہیں اور یہ پابندی صرف ایک اسلامی روایت کو اپنے معاشرے کا حصہ بننے سے روکنے کے لیے لگائی ہے، لیکن میں یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ہمیں اس طرح کی پابندیوں پر سخت پاہو کر اپنی روایتی شانگنی کو بھی نہیں بھولنا ہوگا۔ فرانس کے مسلمانوں پر ریاست کے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ سو وہ قانون کے اندر رہتے ہوئے اپنے احتجاج کا حق استعمال کریں اور کسی کو بھی خود پر روایتی اور فرسودہ الزام لگانے کا موقع نہ دیں۔ اسلام جبر اور جبریت کا نہیں، منطق اور دلیل کا مذہب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا، جب ہم اپنا آپ منوانے میں ضرور کام یاب ہو جائیں گے۔“ شیخ الکریم کا پہلا لیکچر ختم ہوا تو میرے ذہن میں بہت سے سوال جنم لے چکے تھے، لیکن مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ طالب علموں کے زلفے میں گھرے رہے اور ہماری واپسی کا وقت بھی ہو گیا۔

شام کو میں اور ماموں بسام کے ریسٹوران کے وکیل کے پاس پہنچے تو اس کا رویہ وہی بے زاری لیے ہوئے تھا۔ ”میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں، لیکن سرکاری اتارنی نے کیس ہی ٹکڑا بنایا ہے، ان سب لڑکوں کے خلاف۔ دراصل نائن الیون سے پہلے امریکا میں سب ہی معصوم سمجھے جاتے تھے، جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائیں، لیکن نائن الیون کے بعد یہاں سبھی مجرم ہیں، جب تک کہ وہ خود کو معصوم ثابت نہ کریں۔ دوسرے ایشیائی لڑکے تو پھر بھی شاید جلد باہر آ جائیں، مگر بسام.....“ ماموں نے تنگ آ کر پوچھا ”کیوں، بسام نے ایسا کیا گناہ کر دیا ہے۔“ وکیل نے ایک گہری سانس لی ”بسام مسلمان بھی ہے اور یہ بات اس وقت اس کے خلاف جاتی ہے۔“ مجھے غصہ آ گیا ”تو پھر یوں کہو کہ امریکا میں نائن الیون کے بعد ہر انسان نہیں صرف ہر مسلمان مجرم ہے، جب تک وہ خود کو بے گناہ نہ ثابت کر دے۔ یہ اسلام کے خوف کا بھوت تم لوگوں کے دلوں سے نکل کیوں نہیں جاتا؟ بسام مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ امریکن شہری بھی ہے اور اس کے اپنے بھی کچھ حقوق واجب ہیں ریاست پر۔ ہم بھی اتنا ہی ٹیکس بھرتے ہیں، جتنا کوئی دوسرا امریکی شہری۔“ ماموں نے دھیرے سے اردو میں مجھے سرزنش کی ”چپ کر جاؤ بھانجے، اس بھینس کے آگے تین بجانے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ کچھ دیر بعد ہم دونوں جب اس موٹے وکیل کے دفتر سے نکل رہے تھے تو دونوں ہی بسام کے لیے کسی دوسرے اچھے وکیل کی خدمات لینے کا سوچ رہے تھے، لیکن اچھے وکیل کے لیے اچھی رقم کی ضرورت بھی ہوتی ہے، جو اس وقت نہ میرے پاس تھی اور نہ ہی عرفی ماموں کے پاس۔ دوسرے روز یونیورسٹی میں صنم کبیر نے جب مجھ سے بسام کے بارے میں پوچھا تو اندر کا غبار روک نہ پایا۔ ”بسام کی واحد خطا صرف مسلمان ہونا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن خود کو مذہب ترین کہلانے والوں کے شہر میں ہمارا مذہب ایک جرم بن جائے گا۔“ صنم مجھے تسلیاں دیتی رہی، لیکن شاید میرے اندر بننے بت اب ایک ایک کر کے ٹوٹنا شروع ہو چکے تھے۔ گیارہ بجے میں خود اس بس میں جا کر بیٹھ گیا، جو ہمیں گزشتہ روز شیخ الکریم کے لیکچر کے لیے لے گئی تھی۔ آج شیخ صاحب کا دوسرا لیکچر تھا اور موضوع تھا ”اسلام قابل خوف کیوں.....؟“ شیخ صاحب نے اپنے مخصوص روایتی انداز میں بات شروع کی ”عیسائیت کو اسلام سے بھلا کیا خطرہ؟ عیسائیت میں تو خود تبلیغ کا رواج عام ہے۔ عیسائی مشینیں تمام دنیا میں تبلیغ کرتی پھرتی ہیں۔ اسلام نے کبھی ان پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ اسلام سے اصل خطرہ یہودیت کو ہے، کیوں کہ یہودی محض تبلیغ کے ذریعے وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہودی ہونے کے لیے انسان کے جسم میں خالص یہودی خون ضروری ہے، لیکن حیرت ہے کہ یہودی عیسائیت کے پھیلاؤ سے خوف زدہ نہیں ہوتے، شاید وہ عیسائیت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ گویا اصل جنگ صرف یہودیت اور اسلام کے بیچ میں ہے۔ دراصل اسلام کی جدت انہیں خائف کرتی ہے، کیوں کہ اسلام اس دنیا کا سب سے ماڈرن مذہب ہے۔ اسلام سے چھ سو سال پہلے عیسائیت اور اس سے چھ سو سال پہلے یہودیت کا بول بالا تھا۔ اصل میں سارا مسئلہ شاید درمیان کے ان بارہ سو برسوں کو پڑ کرنے کا ہے۔ چودہ سو برسوں میں ہزاروں لاکھوں یہودی مسلمان تو ہوئے، مگر شاید ایک بھی مسلمان پلٹ کر یہودی نہیں بنا۔ بس، یہی خوف طاری ہے ان سب کے دلوں پر۔ عیسائیت سے یہود کو پلٹنے والوں کی مثال کثرت سے ملتی ہے اور اسلام آنے کے بعد عیسائی کا اکثریت میں اسلام کی طرف بڑھنا بھی ایک اہم وجہ ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ عرب ممالک میں آج کے اکثر مسلمانوں کے آباؤ اجداد کبھی عیسائی اور اس سے پہلے کبھی نہ کبھی یہودی بھی رہے ہیں، لہذا یہود ان اپنوں کو بھی مائل بہ اسلام دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ اس لیے آج تمام دنیا میں مسلمان اور اسلام کی شناخت کو ایک دہشت گرد اور جنونی کی شناخت سے بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دکھ اس بات کا ہے کہ وہ اس میں کافی حد تک کام یاب بھی رہے ہیں اور انہیں کام یاب کرنے میں ہماری جذباتیت کا بھی دخل ہے۔ کل ہم اس جذباتیت کے نتائج اور توڑ کے متعلق بات کریں گے۔“ شیخ کا لیکچر ختم ہوا تو حسب معمول مسلم طلبہ نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور مختلف مسائل پر بحث کرنے لگے۔ میں بھی ایک جانب کھڑا اپنی باری کا انتظار کرتا رہا اور پھر بھیڑم ہوئی تو ان کی نظر مجھ پر پڑی ”تم کچھ اچھے ہوئے سے لگتے ہو؟ کیا کسی مشکل میں ہو؟“ ”جی..... مشکل ہی سمجھ لیں۔ دراصل میں یہاں جس ماحول میں پلا بڑھا ہوں، مجھے ”انسانیت“ ہی سب سے بڑا مذہب سکھایا، پڑھایا اور بتایا گیا ہے، لیکن گزشتہ کچھ ہفتوں سے میرے ارد گرد مذہب کی اتنی زیادہ بکرا جا رہی ہے کہ میں الجھ گیا ہوں۔ میں ہمیشہ مذہب کو ایک ذاتی فعل جان کر اس کی ادائیگی کو روح کی تسکین کے لیے کی جانے والی ایک معصوم مشق سمجھتا رہا، جب کہ یہاں تو مذہب کو باقاعدہ شناخت کے طور پر انسانوں کے بنیادی رویوں کی ایک پہچان بنالیا گیا ہے۔ یہ مسلمان ہے، تو ضرور جذباتی اور جنونی ہوگا، عیسائی ہے تو ضرور دوغلا ہوگا اور یہودی ہے تو ضرور سازشی اور مکار ہوگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مذہب کو شناخت بنانا اتنا ہی ضروری ہے تو اس مذہب کی اچھی باتوں سے انسان کی پہچان کیوں نہیں ہوتی؟“ شیخ صاحب نے غور سے میری بات سنی۔ ”واقعی یہ تو اس وقت کی سب سے بڑی الجھن ہے۔ دراصل تینوں ہی ایک دوسرے کے مذہب کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ اسلام واحد مذہب ہے، جو دوسرے مذاہب کے سب ہی پیغمبروں اور کتابوں کو نہ صرف مانتا ہے، بلکہ ان کا احترام بھی ہمارے ایمان کا ایک بنیادی جزو ہے۔ چاروں آسمانی کتابوں پر ایمان لائے بنا تو کوئی مسلمان ہو بھی نہیں سکتا۔ لہذا اگر کوئی صرف مذہبی تخصیص کی بنا پر کسی کے مذہب کو برا بھلا کہتا ہے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہمیں غیر مذہب کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔“ ”ٹھیک ہے، لیکن یہ تو آپ عام حالات اور عمومی رویے کی بات کر رہے ہیں، لیکن اگر مسئلہ خود اپنی مذہبی شناخت کو بچانے اور اس پر لگنے والے غلط الزامات کو مٹانے کا ہو تو پھر کوئی مسلمان کیا کرے، خاص طور پر اس معاشرے میں، جہاں مسلمان اقلیت میں بھی ہوں۔“ شیخ الکریم مسکرائے ”تب مسلمانوں کا اتحاد اور شائستہ بحث ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ یاد رہے، اشتعال کا سب سے زیادہ نقصان اس وقت خود مسلمان کو ہو رہا ہے۔“ اتنے میں اچانک مسجد کے باہر اللہ اکبر کے نعرے اور بہت سے لوگوں کا شور گونجنے لگا۔ ایک طالب علم جلدی سے مسجد کے باہر صورت حال معلوم کرنے کے لیے گیا اور جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ”ناٹم اسکوائر کے آس پاس ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ فلوریڈا کے کسی ٹیری جونز نامی پادری نے 11 ستمبر کو قرآن پاک جلانے کا اعلان کر دیا ہے۔“ شیخ الکریم کی زبان سے بے اختیار نکلا ”نعوذ باللہ.....“ (جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroupp.com.pk



شیخ الکریم نے ہم سب کو پُر سکون رہنے کی تلقین کی، کیوں کہ مسلم طلبہ وہ مکروہ اعلان سننے کے بعد خاصے غصے میں دکھائی دے رہے تھے، چائنا ٹاؤن سے واپسی پر ہم نے بروکلین ہل اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مختلف ممالک کے مسلمان باشندوں کو بڑے بڑے بیڑ اور کارڈ اٹھائے پادری، ٹیری جونز کے اس انتہا پسندانہ رویے کے خلاف احتجاج کرتے دیکھا۔ میری نظر ایک بہت بڑے بیڑ پر جم کر رہ گئی، جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ ”ٹیری جونز..... دہشت گرد.....“ یونیورسٹی میں بھی چاروں جانب اسی بات کا شہرہ تھا اور مسلم طلبہ بڑے احاطے میں جمع ہو کر نعرے لگا رہے تھے۔ پتا چلا کہ ٹیری جونز نے نائن الیون کو ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کے انہدام اور اس جگہ پر امریکی حکومت کی جانب سے مسجد اور اسلامک سینٹر بنانے کے متوقع اعلان کے پیش نظر اسی دن اور ٹھیک ورلڈ ٹریڈ ٹاورز سے جہاز ٹکرانے کی گھڑی، گراؤنڈ زیرو کے مقام پر جمع شدہ قرآن کے اوراق جلانے کا ناپاک منصوبہ بنایا ہے اور باقاعدہ اعلان بھی کر دیا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلبہ کے ممکنہ احتجاج کو روکنے کے لیے باہر پولیس کی ایک بڑی نفری اکٹھی کر رکھی تھی۔ مسلم طلبہ بے حد مشتعل تھے اور اس موقع پر، میں نے پہلی مرتبہ خود عامر بن حبیب اور بارسیدی کی کمی محسوس کی۔ اس روز یونیورسٹی کی کلاسز ختم کر کے اگلے دو دن کے لیے چھٹی کا اعلان کر دیا گیا، لیکن یہ مسئلہ اب صرف ایک دو دن کی چھٹی سے حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیخ الکریم کے تین لیکچرز ابھی باقی تھے اور مسلم طلبہ تیسرے روز چھٹی ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر مختلف علاقوں اور ہاسٹل سے براہ راست چائنا ٹاؤن کی مسجد تک پہنچے۔ اس روز وہاں مسلم طلبہ کا ایک بہت بڑا اور مشتعل ہجوم موجود تھا۔ شیخ نے اپنا لیکچر شروع کیا تو نعرے بازی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ”میں آپ سب کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں، خود میرے اندر بھی غم اور غصے کا ایسا ہی ایک آتش فشاں ابل رہا ہے، لیکن ہم سب کو اللہ کا مسلمانوں سے کیا گیا وعدہ یاد رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، لہذا کسی جنونی پادری کی ایسی کسی دھمکی سے ہمیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس مذموم حرکت میں کبھی کام یاب نہیں ہوگا۔ ہاں، مگر اُمّت اسلام کی جتنی دل آزاری وہ کر سکتا تھا، اس نے اس سے کہیں زیادہ کر دی ہے، لیکن کیا یہ دل آزاری کوئی نئی بات ہے؟ مسلمان رُشدی، تسلیمہ نسیرین اور ان جیسے کئی ملعونوں سے لے کر ڈیفنس کارٹونسٹ تک کہتے ہی ہیں، اس مکروہ قتل عام میں..... اور انہیں روکنے کے بجائے ہمیشہ بڑھا دیا گیا ہے۔ سیاسی پناہ ان کا پہلا انعام ہے اور پھر مسلمانوں کو اذیت دینے پر، دیگر کئی تجھے بھی عمر بھر دیے جاتے رہے ہیں۔ مسلمان رُشدی کو برطانیہ نے ٹائٹ ہڈ کا خطاب تک دے ڈالا۔ ہمارے نزدیک جو ملعون ہو جائے، وہ اسے اپنی یونیورسٹیز میں لیکچر کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ہم ہر بار ایک جذباتی گروہ کی طرح سڑکوں پر تو نکل آتے ہیں، لیکن ہمیشہ صرف اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچا کر، توڑ پھوڑ اور جلا کر گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ بس یہی ہے ہمارا احتجاج اور اتنا ہی ہے، اس بے مقصد ہنگامے کا اثر، اب تو وہ جو ہمیں آزار پہنچانے کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں، انہیں بھی ہمارے احتجاج کی وقعت کا پتا ہے۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ مسلمان دنیا کی پچاس سے زیادہ امیر ترین اور تیل کی دولت سے مالا مال ریاستوں کے حکمران ہونے کے باوجود اس وقت ایک کم زور ترین نسل یا گروہ کے طور پر جانے جاتے ہیں اور کم زور کا احتجاج کیا ہو سکتا ہے؟ صرف رونا دھونا اور اپنے سر پر خاک ڈال کر بددعا دینا۔ ہم مسلمان تو اس قدر بٹ چکے ہیں کہ اجتماعی بددعا بھی نہیں کر سکتے، نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اسلام دشمن قوتیں اپنے کھیل کھیلتی رہیں گی اور کبھی آزادی اظہار کے نام پر تو، کبھی کسی جنونی کا ذاتی فعل سمجھ کر وہ اسے تحفظ بھی فراہم کرتے رہیں گے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہم مسلمان آج تک اس کا کوئی توڑ بھی نہیں کر پائے۔“ ایک جذباتی لڑکا اٹھا اور غصے میں بولا۔ ”ہمیں ایسے ہر دشمن کو کچل کر ختم کر دینا چاہیے۔ چاہے ہماری قوم کم زور ہی کیوں نہ ہو۔ میں یہاں موجود سب حاضرین سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں فلوریڈا جا کر اپنے ہاتھوں سے ٹیری جونز کا خاتمہ کروں گا اور اس کے لیے مجھے کسی کی مدد بھی درکار نہیں ہے۔“ مجمع پر سناٹا سا چھا گیا اور پھر سب نے تعریفی انداز میں پُر جوش تالیاں بجانیں۔ شیخ الکریم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”یہی ہماری بنیادی غلطی ہے۔ ہماری بے بسی فوراً جنون میں بدل جاتی ہے، جو ہمیں تشدد پر اکساتی ہے، مگر ہم اپنے اس جنون کو دلیل اور بحث کے ذریعے ان اقوام تک منتقل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں۔ ایک ٹیری جونز کے مرجانے سے اس طبقے کے اندر چلتی سوچ ختم نہیں ہو جائے گی۔ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ مکالمہ بین المذاہب کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسے اسکالر ز اور مسلم عالم چاہئیں، جو ٹیری جونز جیسے پادریوں کے



درمیان بیٹھ کر ساری دنیا کے میڈیا کے سامنے ان سے بات کریں، بحث کریں اور مناظرہ کریں کہ ہمارے دین میں تو توریت، زبور اور انجیل کو بھی مقدس گردانا جاتا ہے، لیکن قرآن پر ان سب آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا اختتام ہے۔ ہماری کتاب ہی آخری کتاب ہے اور اس کتاب کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن اپنے سے پہلے آنے والی کسی کتاب کی نفی نہیں کرتا۔ لہذا نعوذ باللہ قرآن کی توہین کرنے یا اسے جلانے کا اعلان کر کے دراصل وہ خود اپنی مقدس کتابوں کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں میں سے جس کے دل میں بھی اس پادری کو قتل کرنے کی خواہش چل رہی ہے، میری اس سے یہی درخواست ہے کہ مختلف مذاہب سے مکالمہ کر کے اور میڈیا کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیارے قرآن کی تعلیمات کا ذکر کریں اور یوں ہر روز میری جونز سمیت اس جیسے کئی انتہا پسند اور جنونیوں کے خیالات کا قتل کرے۔ ان کی قرآن اور اسلام کے بارے میں پھیلائی غلط فہمیوں کو سولی چڑھائیں۔ ان کے پروپیگنڈے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں۔ جائیں اور جا کر اپنے سب ہی غیر مسلم عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب کے یونیورسٹی فیلوز کو بتائیں کہ جس قرآن کی پادری جونز سمیت دوسرے بے حرمتی کے منصوبے بناتے ہیں، وہی قرآن ہمیں ان کی بائبل اور دوسری آسمانی کتابوں کو عقیدت سے طاق میں رکھنے کی تربیت دیتا ہے، جیسے ہم خود اپنے قرآن کو بے حد عزت و احترام سے رحل پر رکھ کر کھولتے ہیں۔“

شیخ الکریم کا تیسرا لیکچر ختم ہوا تو مسجد کے صحن میں سنانا سا چھاپکا تھا، طالب علموں کا جوش اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت کے لیے ایک تقدس میں بدل رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس وقت مسجد میں موجود ہر ذی نفس اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کر رہا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دن سے پہلے، خود مجھے بھی قرآن کریم کی اس خصوصیت کا پتا نہیں تھا۔ مجھے اور بسام کو بچپن میں یہیں امریکا میں امی اور عرفی ماموں نے قرآن پڑھایا تھا، لیکن بات صرف عربی پڑھنے کی حد تک ہی محدود رہی۔ ہم دونوں بھائی کبھی اس کتاب کی آیات کا مفہوم سمجھ ہی نہیں پائے۔ یہاں انگریزی ترجمے والے قرآن بھی ملتے تھے، لیکن ان کا ترجمہ اس قدر لفظ بہ لفظ اور مشکل ہوتا تھا کہ بہت کم لوگ ہی اصل معنی کی تک پہنچ پاتے۔ اس روز شیخ الکریم کی بات سن کر مجھے ایک اور بھی بہت عجیب سا احساس ہوا کہ جو بھی مسلمان قرآن کو صرف عربی اور تلاوت کی حد تک برتنا ہے، وہ بھلا اس مقدس کتاب کی اصل تک کیا پہنچ پاتا ہوگا؟ اور پھر اچانک ہی مجھے ان سب لوگوں پر رشک آنے لگا، جو عربی زبان اور اس کے معنی در در معنی نکالنا جانتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نماز اور قرآن کی تلاوت میں کس قدر سکون اور طمانیت پوشیدہ ہوتی ہوگی اور وہ، جو مجھ جیسے عربی سے نابلد اور جلد باز تھے، وہ تو صرف پانچ وقت کا ”رکنا“ ہی لگا پاتے ہوں گے اور پھر میری تو بات ہی کیا، میں تو ابھی تک اس رُتے اور ”روٹین“ سے بھی کوسوں دور تھا۔ دودن کی چھٹیوں میں، میں نے اور عارفین ماموں نے اپنے اپنے طور پر بہت سے اچھے وکیلوں سے رابطہ کیا، لیکن ان سب کی فیس بھی ان کے نام کی طرح بڑی تھی۔ بسام کی اگلی پیشی قریب آتی جا رہی تھی اور ہم ابھی تک اس کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر پائے تھے۔ شیخ الکریم کے ابھی دو لیکچر باقی تھے، جنہیں شہر کے حالات کے سبب اگلے ہفتے کے شروع تک موخر کر دیا گیا تھا۔ دوسری جانب مسلم کاؤنسلر کے انتخاب کا وقت روز بہ روز گھٹتا جا رہا تھا اور ابھی تک مسلمان طلبہ کسی بھی متفقہ امیدوار کے نام پر حتمی اجتماع نہیں کر پائے تھے۔ میں نے یونیورسٹی کھلنے کے بعد پہلے روز ہی امریکا کا نام تجویز کر دیا تھا، لیکن امر خود ذہنی طور پر اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگلے روز یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر اس بیئر پر پڑی، جو مسلم طلبہ نے اکیڈمک ہلاک کے اوپر کافی اونچائی پر لٹکایا ہوا تھا۔ بیئر کی تحریر دور ہی سے پڑھی جاسکتی تھی۔

”ہم میری جونز کو قرآن کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔“ کچھ مزید چھوٹے بیئر اور کارڈز بھی یونیورسٹی کی دیواروں پر چسپاں تھے۔ ”نائن الیون کا بدلہ قرآن سے کیوں.....؟“، ”پادری جونز کیا واقعی بائبل اور انجیل کی تعلیم دینے والا ایک پادری ہے؟“، ”آؤ، ہم سب ایک دوسرے کی مقدس کتابوں کا احترام کرنا سیکھیں اور سکھائیں۔“ شیخ عبد الکریم کے لیکچر نے مسلم طلبہ کے دلوں میں اچھے لاوے کا رخ ایک مثبت سمت موڑ دیا تھا، لیکن وہ جوش کا لیکچر سن نہیں پائے تھے، وہ اب بھی مختلف ٹولیوں کی صورت میں یونیورسٹی کے پچھلے صحن میں جمع ہو کر نعرے لگا رہے تھے اور غیر مسلم یہودی اور عیسائی طلبہ ان کے نعرے سن کر بُرے بُرے منہ ہمارے تھے۔ کوئی لڑکا اپنی دوست کو یہ بتاتے ہوئے میرے سامنے سے گزرا کہ صدر اوباما نے میری جونز کے اعلان کی مذمت کی ہے اور اسے افغانستان اور عراق میں امریکی فوجیوں پر مزید حملوں کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا، گویا بات تعظیم کی نہیں، بلکہ اپنی فوج کی حفاظت کی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ عمل کسی جنونی نے بائبل کے نسخے جلانے کے اعلان کے طور پر کیا ہوتا، تو شاید یہی امریکی اس کی سرکوبی کے لیے اس ملک میں اب تک اپنی فوجیں اتار چکے ہوتے۔ میرے ذہن میں ایک بہت بڑا سوال پھوڑے کی طرح پکنے لگا۔ ”کیا امریکی مسلمان امریکا کے شہری نہیں ہیں؟“ میرے ذہن میں فرہاد کی آواز گونجی۔ ”وقت آنے دو مسٹر آیان! تمہارے دل سے یہ امریکی شہریت کا بھوت بھی اتر جائے گا۔ یہاں صرف وہی امریکن ہے، جو ان کا ہم مذہب ہے۔ مسلمان اور چاہے کچھ بھی ہو، مگر امریکی شہری نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی پرانے قانون کی مجبوری کی وجہ سے اسے یہ شہریت مل بھی گئی ہے، تو اسے یہاں اپنا مذہب بھلا کر ”امریکن اسلام“ کے تحت زندگی گزارنی ہوگی اور جس دن اس کے اندر کا اصل مسلمان جاگا، وہ امریکا سے اس کی واپسی کا آغاز ہوگا۔“ میں ان ہی سوچوں میں گم جانے کب سے یونیورسٹی کے اسٹڈیم میں بیٹھا، سامنے ہوتا رہی کا میچ دیکھ رہا تھا۔ رگی میرا اور بسام کا پسندیدہ کھیل تھا اور اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہم دونوں رگی ٹیم کا حصہ بھی تھے، لیکن آج میرا دل رگی کھیلنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ میری ٹیم کے ارکان چیخ چیخ کر مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتے اور پھر رگی بال کے پیچھے دوڑ جاتے، ہلکی بارش تیز ہونے لگی تھی اور رگی کا میدان کچھڑ کے ایک بہت بڑے تالاب میں بدلتا جا رہا تھا۔ کھلاڑی کچھڑ میں لت پت اپنے ہاتھوں میں گیند تھامے ایک دوسرے کو شانے کی نکر سے گراتے، دھکیلتے اپنے ساتھیوں کو گیند پاس کرتے، تیزی سے گول پوسٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ رگی کے کھیل میں کم زور کھلاڑی کے شانے کا جوڑا اتر جانا معمول کی بات تھی، لہذا دونوں ٹیموں نے شانوں اور سینے کی حفاظت والا خصوصی لباس اور سر پر ہیلمٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے اور بسام کے وہ سرخ ہیلمٹ یاد آ گئے، جو ہمارے فلیٹ کی دیوار پر لٹکے رہتے تھے۔ اچھا ہوا بارش تیز ہو گئی تھی، ورنہ میرے گالوں پر بہتے قطروں کو لوگ آنسو سمجھ لیتے۔ اچانک عقب میں پُر واک آواز ابھری۔ ”آیان..... تم یہاں بارش میں بیٹھے بھیگ رہے ہو اور تمہارے دوست تمہیں کینے میں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے پلٹ کر پُر واک کی جانب دیکھا۔ کالی جینز اور کالے ہائی ٹیک سویٹر میں وہ خود برکھا کی کوئی بدلی لگ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“، ”میرے فزکس ڈپارٹمنٹ کے پانچ کولیگ اس میچ میں کھیل رہے ہیں..... یہ آس پاس جو دور دور تمہیں چھتیاں کھلی نظر آ رہی ہیں، یہ سب میرے ہی ڈپارٹمنٹ کے ہیں اور اپنے دوستوں کا حوصلہ بڑھانے آئے ہیں۔“ میں نے دھیرے سے کہا ”ہاں، کبھی کبھی حوصلہ بھی ہار کو جیت میں بدل دیتا ہے۔“ پُر واک نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”آج کل تم بہت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو۔ وہ پرانا آیان تو کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ لڑاکا، جھگڑا لوار بس اپنی منوانے والا..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“، ”ہاں، سب ٹھیک ہے۔ شاید میں اپنے اندر سے ہار رہا ہوں اور بد قسمتی سے مجھے حوصلہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔“ پُر واک ایک دم ہی



پریشان ہوگئی۔ ”کیوں آیان، ایسا کیوں کہا تم نے، کیا میں بھی نہیں.....! میرا مطلب ہے کہ کیا تم مجھے بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ مجھ سے اپنی پریشانی بانٹ سکو۔“ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ بانٹنے سے درد کبھی کم نہیں ہوتا، بس دوسرے تک پھیل جاتا ہے۔ جیسے کاغذ پر گری سیاہی کو بلائنگ پیپر چوس تو لیتا ہے، لیکن دونوں ہی داغ دار ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے آس پاس گرتی بارش کی باتیں سنتے رہے۔ وہ جو بوندوں کی باتیں جانتے ہیں، انہیں پتا ہے کہ یہ بارشیں ہم سے کتنی باتیں کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی معصوم باتیں، ٹپ ٹپ کرتی باتیں، رم جھم سرگوشی والی باتیں.....

پھر کچھ دیر بعد پُر وادی نے یہ خاموشی توڑی۔ ”آیان..... آج کل یونیورسٹی کا ماحول کتنا عجیب ہو رہا ہے نا..... جیسے بہت جلد دو تہذیبوں کا ایک خوف ناک ٹکراؤ ہونے والا ہو۔“ پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ ”تہذیبوں کی بات سے یاد آیا۔ میں اور تم بھی تو ایسی ہی دو تہذیبوں کے باسی ہیں۔ پاکستان اور بھارت..... 63 برس سے دریا کے دو کناروں کی طرح ایک ساتھ بہنے پر مجبور، لیکن کبھی ایک نہ ہونے والے دو کنارے۔ آیان تم نے بتایا تھا کہ تم پانچ سال کی عمر میں امریکا شفٹ ہو گئے تھے اور گزشتہ بیس برس میں صرف چار دن کے لیے پاکستان گئے ہو، اس لیے شاید تم میری بات سمجھ نہ پاؤ، لیکن ہم دو ایسے ملکوں کے باسی ہیں، جو نصف صدی سے زائد گزر جانے کے باوجود خود اوپر جانے کے بجائے دوسرے کو نیچے کھینچنے میں اپنی تمام محنت صرف کر رہے ہیں۔ ایک کی بار دوسرے کا جشن ثابت ہوتی ہے۔ پُرکھوں اور بزرگوں کے ساتھ ہوئی زیادتیوں کے حوالے دے کر نئی نسل کو ہر روز یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ ابھی آخری جنگ باقی ہے، لیکن دونوں طرف کے ”بڑے“ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر یہ آخری لڑائی ہوگئی، تو پھر ان کے پاس سیاست کے لیے بھی کچھ نہیں بچے گا، اس لیے وہ آخری معرکہ کبھی ہو کے نہیں دیتا۔ ایک ملک کے مسلمان، دوسرے ملک کی مسلمان اقلیت کے حق میں جلسے جلوس نکالتے ہیں، ان کے حقوق کے لیے کٹ مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ مسجد کی جگہ مندر بنانے پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، مرنے مارنے پر شل جاتے ہیں، مگر خود اپنے ملک کی مسجدوں کو بم دھماکوں سے اڑا ڈالتے ہیں۔ مسجدوں میں گھس کر ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو وہیں بھون کر رکھ دیتے ہیں۔ کیسا تضاد ہے نا یہ آیان..... میں اور تم کتنے عجیب دیسوں کے باسی ہیں.....“ شاید پُر وادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، میرے ملک کے بارے میں ایسی خبریں روزیہاں کے میڈیا کی زینت بنتی تھیں اور پاکستانیوں کو روزانہ یہاں کے عام لوگوں کے ہزار ہا سوالوں کا جواب دینا پڑتا تھا، شرم سے سر جھکانا پڑتا تھا، کیوں کہ عام امریکی اب یہی سمجھتا تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں ہوائی جہاز سے اترتے ہی ایئر پورٹ ٹرمینل ہی پر ڈاکو انہیں لوٹ لیں گے، گھر کے راستے میں قزاق گھات لگائے بیٹھے ہوں گے اور جو بچ گئے، وہ کسی نہ کسی دھماکے کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اچانک پُر وادی نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال پوچھ لیا۔ ”ہم جنگ کیوں کرتے ہیں آیان.....؟“ میں نے چھوٹی سی چھتری کے نیچے سٹ کر بیٹھی اس لڑکی کو غور سے دیکھا، جو اپنی چھتری سے بہ یک وقت ہم دونوں کو برستی بارش سے بچانے کی سعی کر رہی تھی اور اس کی ناکام کوشش میں ہم دونوں ہی مسلسل بھیگ رہے تھے۔ ”شاید ہم اپنے خوف کے رد عمل میں جنگ کرتے ہیں۔ جنگیں جیت کر اخلاق بار دیے جاتے ہیں اور شاید جنگ اتنی بری چیز نہیں، جتنی فتح کے بعد اپنی اقدار بھول جانا ہے، کیوں کہ اس فاتح سے بڑا شکست خوردہ اور کوئی نہیں ہوتا، جو جنگ جیت لینے کے بعد اپنی اخلاقیات بھول جائے۔“ پُر وادی غور سے میری بات سنتی رہی۔ ریفری نے سیٹی بجا کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا، کیوں کہ تیز بارش اور کچھڑ کی وجہ سے اب کھلاڑیوں کے چہرے اور وردیاں بھی نہیں پہچانی جا رہی تھیں۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں نے میچ کے دوران ہوئی مار دھاڑ اور دھکے بازی بھلا کر ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور اپنے ٹوئے ٹھونے ٹھوسوں پر ایک ثابت مسکراہٹ سجائے کھیل کے میدان سے باہر نکلنے لگے۔ ان میں سے شاید کوئی ایک ٹیم میچ ضرور ہاری تھی، لیکن دونوں نے اپنے اخلاق کو ہارنے نہیں دیا تھا۔ میں اور پُر وادی وہاں سے اٹھ کر چل پڑے۔ اب وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ میں اچانک ہی اس سے پوچھ بیٹھا۔ ”اگر تمہیں کبھی پتا چلے کہ میں نے اپنی ایک ذاتی غرض کی خاطر کسی جنگ میں اپنا وقار کھویا ہے یا اپنی اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا ہے، تو کیا تم یقین کرو گی؟“ پُر وادی چمک گئی۔ ”نہیں، کم از کم میں اس بات پر کبھی یقین کروں گی۔“ میں نے رک کر اس کی جانب دیکھا، تو پھر سنو، میں نے اپنی زندگی میں بہت سی فتوحات حاصل کیں، لیکن ان میں سے ایک فتح ایسی بھی ہے کہ جو میری اخلاقی شکست کا حاصل ہے۔ جنگ ہارنے کے بعد بھی جیتی جاسکتی ہے، لیکن اخلاق ہارنے کے بعد اسے دوبارہ فتح کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ پُر وادی کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ تحیر معمول کی ضد ہے، لیکن ہم انسان اس فانی دنیا میں کسی بات کو اپنا معمول بناتے ہی کیوں ہیں کہ جس کا فریب ٹوٹنے ہی حیرت ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔ میں شام کو یونیورسٹی سے فارغ ہو کر لاک اپ میں بسام سے ملاقات کے لیے پہنچا تو وہ ملاقاتیوں کے بڑے ہال میں ایک بیچ پر دیوار سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھا تھا۔ ”کہاں کھوئے ہوئے ہو.....؟“ میری آواز سن کر وہ چونکا۔ ”ا تو یار! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ عامر بن حبیب اور بابر سیدی کو میرے حق میں یونیورسٹی سے باہر احتجاجی مظاہرہ کرنے اور پولیس سے مذہبیٹر کے جرم میں کلاسز سے چھ ہفتوں کے لیے معطل کر دیا گیا ہے۔“ بسام نے پاس پڑا ایک پرانا اخبار کھول کر مجھے دکھایا۔ ”ہاں، یہ سچ ہے کہ وہ دونوں معطل کر دیے گئے ہیں، مگر یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ یونیورسٹی ڈین نے انہیں بنا اجازت جلسہ کرنے پر پہلے ہی آخری وارننگ دے رکھی ہے۔ اس لیے اس بار انہیں اپیل کا موقع بھی نہیں دیا گیا اور اسی معطلی کی وجہ سے عامر بن حبیب کی مسلم کاؤنسلر شپ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔“ بسام نے بے چینی سے سر ہلایا۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہوا آیان! ہم نے ہمیشہ ان لڑکوں کی مخالفت کی اور پیٹھ پیچھے مذاق اڑایا، لیکن وہی مسلم گروپ آج میری گرفتاری کی وجہ سے شہر بھر میں ہو چکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو ان کا مجرم محسوس کرنے لگا ہوں۔“ میں نے ٹوئے ٹھونے لہجے میں کہا ”تمہارا جرم میرے جرم سے بڑا نہیں ہے بھائی!“ میں نے تو انہی لڑکوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔“ بسام نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو، ایسا کیا کر دیا ہے تم نے.....؟“ میں نے شروع سے لے کر آخر تک پوری بات بسام کو بتادی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”اوہ میرے خدا ایسا کیوں کیا تم نے آیان.....؟ اگر ان لوگوں کو اس بات کا پتا چل گیا تو تمام مسلم طلبہ تمہاری جان کے درپے ہو جائیں گے۔“ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے، لیکن اس وقت میرے پاس ہم دونوں کی فیس بھرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا اور مجھے بابر سیدی سے تمہارا بدلہ بھی لینا تھا، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ یہ انتقام آگے چل کر خود میرے ضمیر کے لیے ایک سزا بن جائے گا۔“ بسام نے پریشانی سے میری جانب دیکھا۔ ”اب تم کیا کرو گے.....؟“ میں کسی گہری سوچ میں گم تھا ”کفارہ تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔“ میرے اندر کی عدالت بار بار میرے اس جرم کی سزا کا فیصلہ مانگتی ہے اور اب مجھے کوئی حتمی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔“ بسام نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے باہر آنے تک ایسا کچھ نہ کرنا کہ میں خود کو ان دیواروں سے ٹکرا کر ہی ختم کر دوں..... جو بھی سزا ہوگی، ہم دونوں مل کر جھیل لیں گے۔“ میں چپ رہا۔ میں اپنے بھولے بھائی کو کیسے سمجھاتا کہ ضمیر کی عدالتوں کی سزا اکیلے ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ اگلے روز یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر مسلم کاؤنسلر کی عبوری مدت کے چٹاؤ کا آخری نوٹس لگ چکا تھا اور تمام مسلم طلبہ میں ایک سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی، کیوں کہ صاف نظر آرہا تھا کہ ان کا یہ تنظیمی عہدہ خالی ہی چلا جائے گا۔ عامر بن حبیب کے کمرے میں طلبہ کا جھوم تھا اور بھانت بھانت کی بولیوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو عامر نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا، اس کانٹوں کی بیج پر بیٹھنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔“ میں نے قریب بیٹھے مایوس سے بابر سیدی پر نظر ڈالی۔ ”اگر یہ کانٹوں کی بیج ہی ہے، تو اس جھین کو میرا مقدر کر دو..... میں اپنے ایک جرم کی سزا میں خود کو بطور کفارہ اس بیج کے لیے پیش کرتا ہوں۔ میں مسلم کاؤنسلر بننے کے لیے تیار ہوں۔“ کمرے میں میری بات سن کر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا، وہ سب ہی میری جانب دیکھ رہے تھے۔..... (جاری ہے)





.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سائے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک ثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



میری رضا مندی کا اعلان سن کر کچھ دیر تو وہ سب سکتے میں رہے اور پھر جب عامر بن حبیب نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا، تو وہاں ایسا شور مچا کہ گونج میں میرے کفارے کا ذکر کہیں گم ہی ہو کر رہ گیا۔ میں نے کئی بار عامر سے کہا کہ میں اُس سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان سب کو تو میرے مسلم کاؤنسلر شپ کے فارم بھرنے کی جلدی تھی کہ اگلے دن اس کی آخری تاریخ تھی۔ بھاگ بھاگ تمام کام کیے گئے اور مجھ سے بہت سی جگہوں پر دستخط لینے کے بعد اگلی صبح احمر نے میرے کاغذات جمع کر دئیے۔ یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر جب ڈین کی طرف سے یہ اعلامیہ چپکا یا گیا کہ ”آیان احمد کے مسلم کاؤنسلر بننے پر اگر کسی بھی مسلم طالب علم کو اعتراض ہے، تو وہ تین دن کے اندر ڈین کے دفتر میں درخواست جمع کر سکتا ہے۔“ تو یہ نوٹس پڑھ کر چاروں طرف ایک بھونچال سا آگیا۔ میرے دوست تو میرا مسلم گروپ جوائن کرنے ہی پر مجھے روک چکے تھے۔ کاؤنسلر بننے کا اعلان سُن کر تو ان کے حواس ہی گم ہو گئے۔ ”آیان..... تم اپنے ہوش میں تو ہو، جانتے بھی ہو تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ یہ وہ راستہ ہے، جس سے واپسی کی کوئی راہ نہیں نکلتی“، ”میں اپنی تمام کشتیاں جلا کر ہی اس ساحل پر اُتر اہوں۔ میرے پاس فتح یا فنا کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اب.....“ پُر والا بہت بہت پُر جوش تھی ”یہ ہوئی نابات! مسلم اسٹوڈنٹس کو عامر بن حبیب کے بدلے میں ایسا ہی جوشیلا اور نڈر کاؤنسلر چاہیے تھا، جو یونیورسٹی انتظامیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔“ میں اکیڈمک ہلاک سے نکلا تو مجھے سامنے سے شمعون اور مائیکل اپنے گروپ کے دو یہودی لڑکوں کے ساتھ آتے نظر آئے۔ دونوں نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ”تم تو ہماری توقعات سے بھی زیادہ تیز نکلے، تو عامر بن حبیب کی سیٹ پر نظر تھی تمہاری۔ بہر حال، ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہمارا ہی ایک ساتھی مسلم کاؤنسلر بن کر اب ہمارا کام کرے گا۔ سنا ہے تم آج کل اپنے بھائی کی گرفتاری کی وجہ سے بہت پریشان ہو۔ اب تمہیں اُس کی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شمعون نے تمہارے بھائی کے لیے ایک بہت اچھا وکیل کرنے کا سوچ لیا ہے۔ بس، اب تم اطمینان سے مسلم طلبہ کے بچ رہتے ہوئے ہمارا کام کرتے جاؤ اور اپنے تمام مسائل ہم پر چھوڑ دو۔“

میں چپ چاپ مائیکل کی تقریر سُنتا رہا۔ وہ خاموش ہوا تو میں بولا ”میں نے تم لوگوں سے ایک معاہدہ کیا تھا، جسے میں نے تکمیل تک پہنچا دیا۔ اب ہمارا ایک دوسرے پر کوئی قرض باقی نہیں۔ بہتر ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کے راستے میں نہ آئیں۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“ میں اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھنے لگا، تو شمعون نے پیچھے سے آواز دی ”تم شاید یہ بات بُھول رہے ہو کہ تم نے مسلم کاؤنسلر کی سیٹ، جس عامر بن حبیب کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر حاصل کی ہے، اُس کے وفادار مسلم طلبہ ابھی تک اسی یونیورسٹی میں موجود ہیں اور اگر ہم نے انہیں تمہارے پچھلے کارنامے کے بارے میں ہلکا سا اشارہ بھی دے دیا، تو وہ تمہاری تلتہ بوٹی کر دیں گے۔“ میں نے رُک کر شمعون اور اس کے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی ”جب وہ مقام آیا، تو تب دیکھا جائے گا، فی الحال، تم لوگ میرا مشورہ گرہ سے باندھ لو، تو تم سب ہی کے لیے بہتر ہوگا۔ میں کوئی نیا جھگڑا نہیں چاہتا، لیکن مجھے کم زور سمجھنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔“ میں اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میرا اصل امتحان شروع ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر اپنے خدا سے دعا کی کہ مجھے اس امتحان میں کام یاب کر دے۔

دو دن بعد یونیورسٹی کے قانون کے مطابق مسلم طلبہ کے اکثریتی ووٹ سے میرا مسلم کاؤنسلر کا نوٹی فکیشن جاری کر دیا گیا، کیوں کہ میرے مقابلے پر کسی دوسرے مسلمان طالب علم نے کاغذات جمع نہیں کرائے تھے۔ عامر بن حبیب اور باقی سب نے فردا فردا مجھے مبارک باد دی۔ وہ سب بہت خوش



تھے۔ باہر سیدی کے چہرے پر بھی میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے مجھے گلے لگا کر اپنی نم آنکھیں چھپانے کی کوشش کی ”بس اتنا یاد رکھنا آیاں، اب مسلم طلبہ کی ہر امید تم ہی سے وابستہ ہے، کیوں کہ شاید امریکا کی تاریخ کا یہ سب سے مشکل وقت ہم مسلمانوں پر آیا ہے۔ مجھے امید ہے، تم ہماری امیدوں پر پورے اتر دو گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ”میں آخری دم تک اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کروں گا۔ بس، ایک بات دھیان میں رہے کہ مجھے میرے ماضی سے نہیں، میرے حال سے پہچاننا۔“ باہر اور عامر نے زور سے میری پیٹھ تھکی۔ ”فکر مت کرو۔ ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

اگلے روز صبح ڈین آفس میں میری بہ طور مسلم کاؤنسلر، پہلی تعارفی ملاقات تھی، جس میں اُس نے شمعون اور عیسائی کاؤنسلر جارج کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ ڈین نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا ”مبارک ہو جنہیں۔ ویسے کافی کچھ سن رکھا ہے تمہارے بارے میں۔ امید ہے تم مسلم طلبہ کی ٹھیک طرح سے نمائندگی کر پاؤ گے اور پچھلے کاؤنسلر کی طرح بات بے بات طلبہ کو مظاہروں اور جلسوں کے لیے اکٹھا کر کے ان کا تعلیمی وقت ضائع نہیں کرو گے۔“ شمعون اور جارج نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈین نے اپنی بات جاری رکھی ”تم نے یونیورسٹی آئین میں اپنی حدود کے متعلق تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ شہر کے تازہ حالات کے پیش نظر یونیورسٹی کمپس کے باہر بھی ہر قسم کے مظاہروں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ لہذا تم تینوں کاؤنسلرز کو اب ڈسپلن کی بہت پابندی کروانی ہوگی اور خود بھی محتاط رہنا ہوگا۔“ میں نے پہلی مرتبہ اپنی زبان کھولی ”آپ مطمئن رہیں۔ عامر بن حبیب کی معطلی کے بعد مسلم طلبہ کافی محتاط ہو گئے ہیں۔ ویسے اگر یونیورسٹی انتظامیہ کلاسز کے اوقات کے دوران کمپس سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دے، تو ایسے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مسلم طلبہ کو سنبھالنے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ امید ہے باقی دو کاؤنسلرز بھی اپنے اپنے گروپ کو رضامند کر لیں گے۔“ ڈین نے کچھ سوچ کر سر ہلایا ”تجویز مذکور نہیں، میں آج ہی ڈپٹی ڈین سے کہہ کر یہ حکم نامہ جاری کروا دیتا ہوں۔“ ڈین نے شمعون اور جارج کی طرف دیکھا، ”تم دونوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے، اس تجویز پر.....؟“ دونوں اس اچانک سوال سے گڑبڑا سے گئے ”نہیں نہیں، ہمیں بھی منظور ہے۔“ تعارفی میٹنگ ختم ہوئی، تو ہم تینوں ڈین کے دفتر سے باہر نکل آئے۔ شمعون کچھ الجھا ہوا تھا۔ ”تم نے اتنی بڑی بات اندر کہہ تو دی ہے، لیکن کیا تمہارا مسلم طلبہ پر واقعی اتنا کنٹرول ہے بھی کہ تم انہیں باہر جانے سے روک سکو گے؟“ جارج البتہ خوش نظر آ رہا تھا ”ویسے ہے تو یہ ہمارے فائدے ہی کی بات، آئے دن یونیورسٹی کی بیرونی سڑک پر مظاہروں سے یونیورسٹی کی بہت بدنامی ہو رہی تھی۔“ میں نے غور سے جارج اور شمعون کو دیکھا۔ ”لیکن اس طرح مسلم طلبہ کی بات میڈیا کے ذریعے براہ راست پورے نیویارک تک بھی تو پہنچ رہی تھی۔ تم یونیورسٹی کی نیک نامی سے نہیں، میڈیا کی مسلم طلبہ سے توجہ ہٹ جانے پر زیادہ خوش ہو۔“ وہ دونوں چونک گئے۔ شمعون مسکرایا ”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بہت آگے تک دیکھنے کی عادت ہے، کسی بھی لیڈر کے لیے یہ دور بنی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے، لیکن خیال رہے، تمہارے کسی بھی اقدام سے ہمیں نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ورنہ انجام سے تم بھی واقف ہو۔“

وہ دونوں مجھے دھمکی دے کر آگے بڑھ گئے۔ شام چار بجے تک انتظامیہ کی جانب سے کلاسز ٹائمنگ میں یونیورسٹی کے احاطے سے بلا اجازت باہر جانے پر عارضی پابندی کا نوٹس لگا دیا گیا۔ وجہ اعلان شہر کے بگڑتے ہوئے حالات اور نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کی گئی درخواست کو بتایا گیا تھا۔ احرار دیگر طلبہ نے مجھ سے حکم نامے کے خلاف اپیل جمع کروانے کی اجازت طلب کی تو میں نے انہیں دو دن انتظار کرنے کا کہہ دیا۔ اگلے روز شیخ الکریم کا چوتھا لیکچر تھا۔ پادری ٹیری جونز کے اعلان کے بعد مسلمانوں کے لیے شہر کی فضا کافی تناؤ کا شکار ہو چکی تھی اور جیسے جیسے گیارہ ستمبر کا دن قریب آ رہا تھا، مسلمانوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اتفاق سے اس بار مسلم ممالک میں عید گیارہ ستمبر یا ایک دن پہلے آرہی تھی اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بات بھی کسی بڑے ہنگامے کے لیے وجہ تنازع بن سکتی ہے۔ ہم سب شیخ الکریم کا لیکچر سننے یونیورسٹی سے ڈین کی اجازت لے کر نکلے تو ٹائمز اسکوائر پر میری نظر "Lion king" نامی اسٹور کے بڑے سے پیلے بورڈ پر پڑی، جس کے قریب گاڑی کھڑی کر کے دھماکا کرنے کی سازش کا الزام اُس پاکستانی لڑکے پر لگا دیا گیا تھا۔ ٹائمز اسکوائر سے کچھ فاصلے پر اُس دھان پان سی ڈاکٹر کی رہائی کے حق میں بھی نعرے لگائے جا رہے تھے۔ یوں میڈیا کی تمام تر توجہ ان دو پاکستانیوں پر مرکوز تھی یا شاید کسی خاص مقصد کے تحت مرکوز کروائی گئی تھی، کیوں کہ یہ دونوں پاکستانی انتہائی خطرناک ملزمان کی فہرست میں شامل اور امریکن پولیس کی قید میں تھے، لہذا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی یہ توجہ کم از کم مسلمانوں کے حق میں ہرگز نہیں جاتی تھی۔ ہم جب چائنا ٹاؤن کی مسجد کے باہر پہنچے تو وہاں سیکورٹی کے غیر معمولی انتظامات نظر آئے۔ پتا چلا کہ کسی نے ٹیلی فون پر پولیس کو چائنا ٹاؤن کی مسجد کے باہر بم بلاسٹ کی دھمکی دی ہے۔ بنگالی طالب علم ٹکیل نے دھیرے سے بڑبڑا کر کہا ”سارا منصوبہ جامع مسجد کے گرد شیخ الکریم پر نظر رکھنے کے لیے پولیس جمع کرنے کا ہے اور کچھ نہیں“ میں حیرت میں پڑ گیا۔ آخر نیویارک پولیس کو شیخ الکریم جیسے صلح پسند بزرگ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب کے آج کے لیکچر کا موضوع تھا ”جو آسمان سے اُترا وہی سب کے لیے مقدس ہے“ انہوں نے حسب معمول ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا۔ ”نیویارک کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص یہ وقت بڑی آزمائش کا ہے۔ ہر روز کوئی نیا فتنہ کھڑا کیا جاتا ہے اور پھر اسے میڈیا کے ذریعے ہوا دے کر دنیا بھر میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں کے ساتھ مل کر مگر چھ کے آنسو بھی بہائے جاتے ہیں کہ امریکا اپنے مسلمان شہریوں کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ معروف قلم کار نامس ہارڈی، نعوذ باللہ کہتا ہے ”اگر اس کائنات کا کوئی خدا نہیں، تب بھی ہمیں ایک خدا ایجاد کر لینا چاہیے، تاکہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی اقدار قائم رہ سکیں“ لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکیوں کا خدا تو ہمیشہ سے برقرار ہے، پھر اس معاشرے کی اقدار دن بہ دن مرتی کیوں جا رہی ہیں۔ آپ لوگوں کو خبر مل چکی ہوگی کہ گستاخانہ بنانے والے ویسٹر گارڈ کو انٹرنیشنل میڈیا کانفرنس 2010ء کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جو ہمارے دلوں میں جس قدر اندر تر برجھی گھونپے، وہ اسی قدر زیادہ متحرم کیوں؟ ہم ان پر مبعوث ہوئے ایک لاکھ تیس ہزار نو سو ننانوے پیغمبروں کو اپنے دل کی مسند پر بٹھا رکھتے ہیں کہ یہی ہمارا ایمان ہے، لیکن اُن سے ہمارے ایک نبی برداشت نہیں ہوتے، حالاں کہ ان سے پہلے آنے والے ہر نبی نے اُن کے آنے کی شہادت دی اور بارہادی ہے کہ اس تمام کائنات کے ظہور پزیر ہونے کا مقصد ہی ان کی آمد ہے، پھر بھی یہ انکار کیوں.....؟“ کیوں بار بار یہ اپنے ہی وجود کی نفی کرتے ہیں، یہ کیا انداز دشمنی ہے، کیا مسلمان اس قدر ضعیف ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پیارے نبی کی حرمت کے لیے بھرپور احتجاج بھی نہیں کر سکتا۔ آخر ہم کب تک مختلف حیلے بہانوں سے اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتے رہیں گے؟ حد یہ ہے کہ ایک ملعون کے عمل کو بار بار دہرانے کے لیے انٹرنیٹ کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ ویب سائٹس پر اس موذی عمل کے لیے مقابلے منعقد کروائے جا رہے ہیں اور ہمارے ایمان کی کم زوری کا یہ عالم ہے کہ ہم صرف ایک ویب سائٹ کا بائیکاٹ نہیں کر پائے۔ کچھ عقل مندوں نے کہا کہ ایک ویب سائٹ کا بائیکاٹ کرنے سے کیا ہوگا؟ کچھ اور ذہین لوگوں نے اسے ”علم و تمدن سے دوری“ کا خطرہ بنا کر ظاہر کیا اور کچھ نے اسی سائٹ پر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے لاکھوں پیغامات بھیج کر اُسی ویب سائٹ کی برسوں کی کمائی ہفتوں میں کروادی۔ جس قوم کا ایمان اس قدر کم زور ہو چکا ہو کہ وہ اپنا احتجاج رجسٹرڈ کروانے کے لیے اجتماعی طور پر صرف ایک ویب سائٹ بھی نہ چھوڑ سکے، وہ کسی شکایت کی حق دار نہیں۔ بات صرف احساس کی ہے۔



احساس اللہ ہمارے دلوں میں ڈالتا ہے اور جب آپ اپنے اندر اس احساس کی کمی یا غیر حاضری پائیں تو سمجھ جائیں کہ آپ کے دل پر مہر لگنے والی ہے۔ ہزار بہانے، لاکھ توجیہات خود آپ کے اندر سے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے جواب تلاش کر لائیں گی، لیکن فاری میں کہتے ہیں کہ ”خوئے بدرابہانہ بسیار.....“ ہم اس ملعون و فیش کارٹونسٹ کو تو دن رات بُرا بھلا کہتے ہیں، لیکن ڈنمارک کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ پھر وہی بہانہ کہ میرے ناشتے میں صرف مکھن یا پنیر کا ایک ٹکڑا نہ کھانے سے بھلا ڈنمارک کی معیشت پر کون سا آسمان گر جائے گا۔ یاد رکھیے، ہر بارش کا ایک پہلا قطرہ ضرور ہوتا ہے اور ہر سیلاب ایسے ہی ہزاروں قطروں سے مل کر جنم لیتا ہے۔ اگر ہم سب ہی یہی سوچ کر صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے تو وہ دن دور نہیں، جب ہمارا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ اور یہ درندے ہمارا سب کچھ نگل جائیں گے۔ ان لوگوں کا مقابلہ اس وقت تیر و تگوار سے نہیں، ایک متحد سوچ ہی سے ممکن ہے۔ مغرب ایک دولت پرست اور کاروباری ذہن کا معاشرہ ہے، جہاں دن اور رات کی کتنی صرف منافعی کے شمار سے کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے دن، ہفتے، مہینے اور برسوں کے ٹارگٹس ہوتے ہیں۔ اگر وہ یہ مالی منافعی کا سنگ میل عبور نہ کر سکیں، تو ان کے دن رات بے سکون ہو جاتے ہیں۔ انہیں دنیا اپنے ہاتھ سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ ان سے مقابلے کا کافی الوقت بس ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ایسی حرکتیں کر کے یہ اپنے ہاتھوں سے مسلمان ممالک کی ایک بہت بڑی تجارتی منڈی کھودیں گے۔ یہ لوگ مالی مفاد کے لیے خود اپنوں کو بھی دفن کتے ہیں۔ ایک بار..... صرف ایک بار ان کے دل میں اس تجارتی خسارے کا خوف تو پیدا کر کے دیکھیں۔ اگر یہ خود گھنٹوں پر چل کر نہ آئے تو کیسے گا.....“

”پھر چاہے وہ خسارہ (شیخ الکریم نے اپنی تقریر جاری رکھی) ان کی ویب سائٹس کے بائیکاٹ سے ہو یا انہیں آپ کے ناشتے کی میز پر مکھن کی ایک ٹکیہ کی کمی سے بھگتنا پڑے، لیکن ہم میں سے ہر ایک کو اس خسارے کے لیے اپنا حصہ ڈالنا ہی ہوگا۔“ مجھے میں سے ایک جوشیلا نوجوان اٹھا ”لیکن ہم ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے، مسلمان یہ سب کچھ کیوں برداشت کر رہے ہیں؟“ شیخ الکریم نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا ”ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس میں یہ عمل بھی کسی جہادِ اصغر سے کم نہیں اور جس جہاد کا تم ذکر کر رہے ہو، اس کے لیے بھی پہلے اپنے اندر لطم و ضبط پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ جس دن آپ سب اپنی کمپیوٹر سکرین اور ناشتے کی ٹیبل سے یہ جہادِ اصغر شروع کر دیں گے، آپ کا ہر گز رتا دن آپ کو اس جہادِ اکبر کے قریب تر کر دے گا۔ اپنی تربیت آپ خود کرنا سیکھیں۔ جو اپنے گھر بیٹھ کر اپنے ایمان کو آزمانے کی ہمت نہ کر سکے، وہ میدان میں آکر اپنا زور بازو بھلا کیا آزمائے گا؟“ شیخ کا لیکچر ختم ہوا تو سارا مجمع سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی جب ہم بہت عرصے تک اپنے اندر کا آئینہ نہیں دیکھ پاتے، تو اچانک باہر کسی کے دکھائے آئینے پر نظر پڑتے ہی خوف زدہ سے ہو جاتے ہیں۔ خود سے نظریں چرانے لگتے ہیں۔ آج وہاں مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا پورا ہجوم بھی ایک دوسرے سے نظر ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

مسجد سے باہر نکلتے وقت شیخ الکریم نے مجھے آواز دے کر روک لیا ”نئی ذمہ داری مبارک ہو، لیکن راہ بڑی دشوار ہے۔ ثابت قدم رہنا“ میں نے سر جھکا لیا ”میں خود کو اس ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھتا۔ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے مجھے۔“ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور چلتے چلتے جیسے کوئی بات یاد آگئی ”ہاں، ہو سکے تو میرے ہوتے ہوئے یہاں آکر نماز سیکھ جایا کرو۔ تین دن بعد میرا آخری لیکچر ہے، پھر ہفتہ بھر رہنے کے بعد میں مصر چلا جاؤں گا۔ جلد یا بدیر تمہیں یہ کی پوری کرنا ہوگی۔“ وہ میرا کاندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گئے۔

اگلے روز ڈین کے دفتر میں تمام کاؤنسلرز کی پندرہ روزہ میٹنگ تھی۔ ڈین پابندی کا معاملہ خوش اسلوبی سے منٹ جانے پر کافی خوش دکھائی دہا تھا۔ شمعون نے یہودی طلبہ کی جانب سے آنے والے ہفتے کے روز اپنے کسی اسکا لرو ایک سیمینار میں دعوت دینے کی اجازت مانگی، جو اسے مل گئی۔ جارج نے پچھلے سمسٹر کے دوران چند عیسائی طلبہ کی غیر حاضریوں کا جرمانہ معاف کرنے کی درخواست کی۔ ڈین نے آدھا جرمانہ معاف کر دیا اور میری جانب متوجہ ہوا ”تمہارے پاس کوئی خاص معاملہ ہے مسلم کاؤنسلر!!“ ”جی ہاں..... آپ کے حکم نامے کی تعمیل میں تمام مسلم طلبہ نے کلاسز کے اوقات میں کیسپس سے باہر جانے کی پابندی قبول کر لی ہے اور اب وہ کوئی جلسہ، جلوس یا مظاہرہ بھی آپ کی اور انتظامیہ کی اجازت کے بغیر نہیں کریں گے“ تمام جیوری ممبرز نے تعریفی انداز میں میری طرف دیکھا ”لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس چھوٹی سی بات کے لیے میری اور آپ سب لوگوں کی یہ تمام محنت ضائع نہ ہو جائے“ ڈین پریشان ہو گیا ”نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔“ میں نے ترچھی نظر سے شمعون کی طرف دیکھا ”اس پابندی کی وجہ سے مسلم طلبہ کی ظہر کی نماز کا وقت بھی کیسپس ہی میں گزرنے لگا ہے۔ ابھی تو ابتدائی دن ہیں، لہذا وہ سب کسی نہ کسی طور نماز قضا کر رہے ہیں، لیکن کچھ دن گزرے تو یا تو وہ اس پابندی کے خلاف متحد ہو کر انتظامیہ کے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دیں گے یا پھر پابندی توڑ کر نماز کے وقت کیسپس سے باہر جا کر کہیں اور نماز ادا کر آیا کریں گے اور ایک مرتبہ اگر ان طلبہ نے پھر سے باہر ملنا جلنا شروع کر دیا تو ضرور بات ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔“ ڈین اور انتظامیہ نے پریشانی سے پہلو بدلے۔ شمعون اور جارج نے کڑی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ جیوری کے ایک ممبر نے مجھ سے پوچھا ”تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے تمہارے پاس؟“ ”حل بہت آسان ہے۔ ہمیں صرف ظہر کے وقت کے لیے مسلم طلبہ کو کیسپس میں نماز ادا کرنے کی اجازت دینی ہو گی۔ اس طرح ان کے دل میں یونیورسٹی انتظامیہ کے لیے وہ مخالفت کے جذبات بھی شہدے پڑ جائیں گے، جو عامر بن حبیب کی معطلی سے پیدا ہوئے ہیں۔“ شمعون تڑپ کر بولا ”لیکن اس طرح سے تو یہودی اور عیسائی طلبہ کی مانگیں بھی بڑھ جائیں گی۔ ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا ”یہودی طلبہ صرف ہفتے کے روز عبادت کرتے ہیں اور عیسائی طلبہ صرف اتوار کے روز۔ اوّل تو یہ دو دن یونیورسٹی بند رہتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلم طلبہ کی طرح انہیں بھی یہ حق ملنا چاہیے، لہذا ہمیں ان سب کو ان کے مقررہ اوقات، جو کلاسز کے دوران کیسپس میں گزارنا پڑیں، اپنی اپنی عبادت کی اجازت دے دینی چاہیے۔ سب ہی کا دوران یہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ ہو۔“ ڈین اور جیوری ممبرز آپس میں کسر نہمصر کرتے رہے اور پھر ڈین ہی نے اعلان کیا ”ٹھیک ہے، ہمیں مسلم کاؤنسلر کی یہ تجویز منظور ہے۔“ شمعون نے احتجاجاً کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن ڈین نے یونیورسٹی کے ”بہتر ماحول“ کی خاطر اس کا احتجاج مسترد کر دیا۔

ہم سب ڈین کے کمرے سے باہر نکلے تو شمعون نے قبر برساتی نظروں سے میری جانب دیکھا ”ٹھیک ہے، یہ کھیل تم نے شروع کیا ہے، لیکن اب اسے ختم میں کروں گا۔“ وہ غصے سے جھپٹتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مسلم طلبہ کو جب یونیورسٹی میں ظہر کی نماز کی اجازت ملی تو نمازی لڑکوں نے خوشی سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ عامر بن حبیب اور بارسیدی نے مجھے گلے لگالیا ”بہت دنوں بعد یہ پہلی خوش خبری سننے کو ملی ہے اور وجہ تم ہو.....“ میں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے عامر بن حبیب کی جیب میں ڈال دیا۔ ”کل مجھے اپنے مسلم طلبہ کے اجلاس میں اعتماد کا ووٹ لینا ہے، لیکن تم ہال میں آنے سے پہلے میرا یہ خط ضرور پڑھ لینا، ہو سکتا ہے، اسے پڑھنے کے بعد تمہارا ووٹ میرے خلاف ہو جائے۔“ میں عامر کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اگلے روز ہال نمبر تین مسلم طلبہ سے کچھ کھج بھرا ہوا تھا۔ آج مجھے یہ طور مسلم کاؤنسلر، ان سب سے اعتماد کا ووٹ لینا تھا۔ احمر نے اسٹیج سیکرٹری کے طور پر اجلاس کا مقصد بیان کیا اور مجھے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ پُرے وا کے ہاتھ میں مائیک تھا اور اس نے اعتماد کے ووٹ سے پہلے میرا تعارف اور ظہر کی نماز کی اجازت ملنے کو میری پہلی کامیابی کے طور پر بیان کیا، تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا، لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز عامر بن حبیب کو طلبہ کی نشستوں میں تلاش کر رہا تھا، مگر ہر بار نظر نام کام لوٹ رہی تھی۔ بارسیدی تو پہلے ہی آچکا تھا، لیکن عامر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر دوونگ کا مرحلہ بھی آگیا۔ احمر نے اسٹیج پر آکر اعلان کیا کہ جو طلبہ میری کاؤنسلر شپ کے حق میں ہیں، وہ اپنا ہاتھ کھڑا کریں۔ اتنے میں دروازے کی جانب سے شمعون کی تیز آواز ابھری۔ ”ظہر جاؤ..... اس سے پہلے کہ تم لوگ اسے اپنا کاؤنسلر بنانے کا حتمی اجازت نامہ فراہم کر دو، میرے پاس تم سب کے لیے ایک اطلاع ہے۔ تمہارا یہ لیڈر آیان غدار ہے“ ہال میں ایک سنا سنا چھا گیا اور سب کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں۔

(جاری ہے)

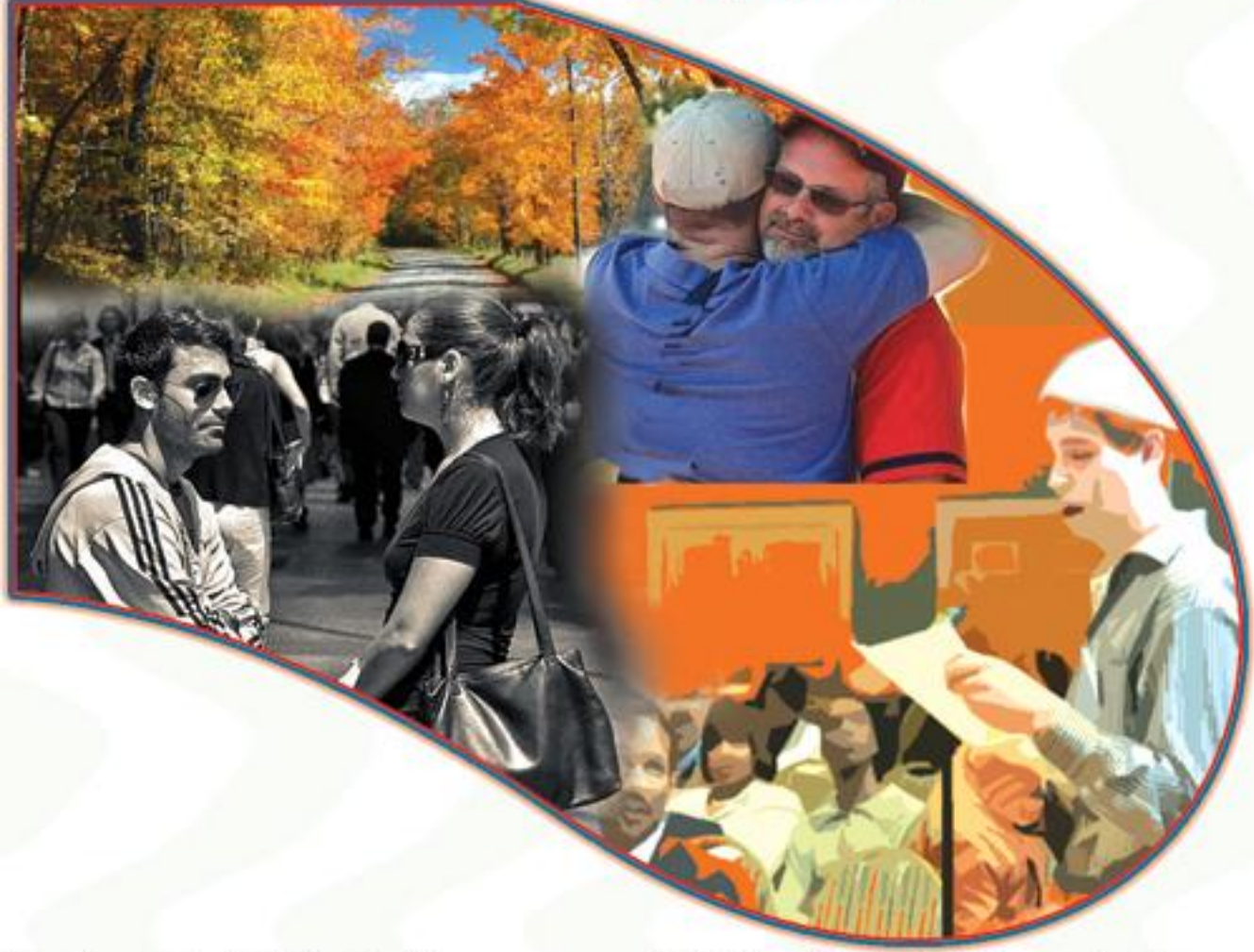




.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبد اللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبد اللہ بنی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroupp.com.pk



بارسیدی نے زور سے چلا کر شمعون کو ہال سے نکل جانے کو کہا ”تم لوگ ہمیشہ ہمارے درمیان نفاق پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہو۔ بہتر ہے تم خود ہی چلے جاؤ، ورنہ میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“ شمعون نے جیب سے چند کاغذ نکال کر ہوا میں لہرائے۔ ”تم لوگوں کی اسی جذباتیت نے ہمیشہ تمہیں ڈبوایا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ کاغذ ضرور پڑھ لینا۔ میں نے تم لوگوں کی سہولت کے لیے اس کی بہت سی نقول تیار کروالی ہیں۔“ یہ اسی عہد نامے کی نقل تھی، جس پر میں نے اور شمعون نے میری مسلم گروپ میں شمولیت کے وقت دستخط کیے تھے۔ مائیکل اور شمعون کے ساتھ آئے دوسرے لڑکوں نے پل بھری میں وہ تمام نقول ہال میں موجود تمام طلبہ میں بانٹ دیں اور اسے پڑھ کر جیسے ہال میں ایک بھونچال سا آگیا۔ سب ایک دم چلانے اور شور مچانے لگے۔ آدھے طلبہ میرے حق میں تھے کہ یہ سب کچھ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے اور آدھے اس عہد نامے کی وضاحت چاہتے تھے۔ آخر بارسیدی ہی نے سب سے پہلے چلا کر مجھ سے پوچھا ”آخر یہ سب کیا ہے آیان! تم خود کیوں نہیں کچھ بتاتے؟“ شمعون نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ بھلا کیا بتائے گا، آج تک کسی مجرم نے اپنے جرم کا اقرار خود کیا ہے بھلا، لیکن میں تم لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ اسی نے تم لوگوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر تمہارے پچھلے کاؤنٹر عامر بن حبیب سے اس کی نشست چھینی ہے۔ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ یہ تم سب خوب جانتے ہو۔“ شمعون نے میری جانب ایک طنزیہ مسکراہٹ اچھالی اور اپنے ساتھیوں سمیت واپسی کے لیے پلانا۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”ٹھہر جاؤ، میرا انجام بھی دیکھتے جانا، کیوں کہ تم نے کہا تھا کہ اس کہانی کا خاتمہ بھی تمہارے ہاتھوں ہی ہوگا اور وہ گھڑی اب آن پہنچی ہے۔“ پُروانے پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھا ”یہ سب کیا ہے آیان! تم کہتے کیوں نہیں کہ یہ تمہیں بدنام کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے، کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے، ہمیں تم پر پورا اعتبار ہے۔“ ”نہیں..... شمعون ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا ان لوگوں سے عامر بن حبیب گروپ توڑنے کا معاہدہ ہوا تھا اور اس صلے میں انہوں نے میری اور بسام کی سمسٹر فیس بھی جمع کروائی تھی۔ میں آج اس تمام ہال کے شرکاء کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔“ میری بات سن کر پُروانے کا رنگ سی ہوگئی، جبکہ دوسری جانب غصے اور قہر کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ بارسیدی اور احمر تو صدمے کے مارے اپنی نشستوں ہی پر ڈھسے گئے، جب کہ بگالی ٹکلیل نے چلا کر کہا۔ ”اس غداری کے صلے میں ہم تمہیں عبرت کا نشان بنادیں گے، تاکہ آئندہ کسی کو ہمارے جذبات سے کھیلنے کی ہمت نہ ہو۔“ ہال میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا اور قریب تھا کہ لڑکے اسٹیج پر چڑھ آتے کہ اچانک کہیں سے عامر بن حبیب کی گرج دار آواز گونجی ”رک جاؤ، یہ میرا حکم ہے۔“ ہال میں دھیرے دھیرے خاموشی چھا گئی۔ عامر ہال کے دروازے کے پتھوں بچ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں میرا کل شام کا تھمیا ہوا خط لہرا رہا تھا۔ احمر نے چلا کر عامر سے کہا۔ ”تم نہیں جانتے عامر، اس آیان نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے، یہ غدار ہے۔“ عامر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ آیان نے کل شام ہی یہ سب مجھے لکھ کر دے دیا تھا اور مجھ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اگر میں یہ سب پڑھنے کے بعد تم لوگوں کو اعتماد کا ووٹ دینے سے روکنا چاہوں، تو تم لوگوں کو اجلاس سے پہلے ہی منع کر دوں۔ میں کل رات سے آیان کا یہ خط درجنوں بار چڑھ چکا ہوں، لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے میں مجھے اتنا وقت آج سے پہلے کبھی نہیں لگا۔ اسی لیے آنے میں بھی تاخیر ہوگئی۔“ سب لڑکے حیرت سے عامر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ عامر بن حبیب نے میرا خط کھولا اور سب کے سامنے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہال میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں، جب تم میری یہ تحریر پڑھو گے، تو تمہارے اندر کی دنیا میرے



لیے مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی۔ کل مجھے مسلم طلبہ سے اعتماد کا ووٹ لینا ہے، اس لیے آج تمہیں اس بات سے آگاہ کر رہا ہوں کہ میں کس نیت سے مسلم طلبہ کی حمایت میں شامل ہوا۔ میری مجبوری چاہے کچھ بھی رہی ہو، لیکن اس سے میرے جرم کی نوعیت کم نہیں ہو سکتی۔ مجھے شمعون اور مائیکل نے تمہارا گروپ توڑنے کے لیے باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت اس شمولیت پر آمادہ کیا تھا اور مجھے اپنا کام ختم کر کے واپس لوٹ جانا تھا، لیکن قسمت ہمیشہ ہمارے ارادوں کے مخالف سمت کی لکیر ہی ہماری ہتھیلیوں پر ابھارتی ہے۔ تمہارا گروپ تو نہ ٹوٹا، البتہ تمہاری کاؤنسلر شپ ختم ہو گئی اور تم لوگوں نے مجھے اس عہدے کے لیے نامزد کر دیا۔ تمہاری اور بارسیدی کی بسام کے حق میں نکالی گئی ریلی نے میرا اندر بھی ٹپٹ کر کے رکھ دیا۔ میں ہمیشہ تم سب کو ایک جذباتی گروہ سمجھتا رہا، لیکن جب آگ میرے گھر تک پہنچی، تو مجھے ان جذبات کی قدر و قیمت کا احساس ہوا، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے یہ عہدہ ایک کفارے کے طور پر ہی قبول کیا تھا اور میرا اصل کفارہ اب شروع ہو گا، لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے حتمی چنناؤ کے ووٹ سے پہلے میرے ماضی کا نہ صرف علم ہو، بلکہ تم اپنے تمام گروپ کو بھی میرے اس دہرے کردار کی حقیقت سے آگاہ کر دو۔ ہاں، اگر اس کے بعد بھی تم لوگوں کا مجھ پر ذرہ برابر اعتبار باقی رہ جائے، تو اس بات کا یقین رکھ کر مجھے یہ ذمے داری سونپنا کہ میں اس کفارے اور اپنے دامن پر لگے دھبے کو مٹانے کے لیے ہر حد سے گزر سکتا ہوں۔“

عامر بن حبیب نے خط تہہ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا، لیکن اس کے چپ ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک ہال میں کوئی کچھ نہ بول سکا، پھر عامری نے کھٹکھار کر سب کو اپنی جانب متوجہ کیا ”یہ خط آیان نے کل شام مجھے دیا تھا اور میں کل رات ہی سے اس کش مکش میں مبتلا ہوں کہ میں ایک شخص کے ماضی کی جرم کی سزا سناؤں یا اسی کے ہاتھ میں اپنے حال اور مستقبل کی ڈور تھما دوں۔ دماغ کہتا تھا کہ ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد دوبارہ اسی پر اعتماد حقاقت ہوگی کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاسکتا، لیکن دل کہتا تھا کہ ہمارا رب انسانوں کی کا یا بھی تو پلٹ دیتا ہے اور اگر ایسا ہو چکا ہے تو ہم ایک انسان کو بچ کے رستے پر چلنے سے پہلے ہی کہیں دوبارہ بھٹکا نہ دیں۔ ساری رات اپنا دل و دماغ جلانے کے باوجود میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس لیے اب میں یہ فیصلہ آپ سب پر چھوڑتا ہوں، کیوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے دل کے فیصلوں کو دماغ پر ترجیح دی ہے۔ آیان کے بارے میں بھی میں اپنے دل ہی کی ماننا چاہتا تھا، لیکن یہ صرف میرا معاملہ نہیں، لہذا آپ سب کا بھی اس فیصلے میں شریک ہونا بہت ضروری ہے۔“ عامر اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ شمعون اور مائیکل پہلے ہی ہال سے جا چکے تھے۔ میں نے سوچ میں گھرے ہال کو مخاطب کر کے کہا ”میں نے خود کو ہر سزا کے لیے پیش کر دیا ہے۔ میں چاہتا تو شمعون کے الزام کی نفی بھی کر سکتا تھا۔ اس کاغذ سے مکر سکتا تھا اور تم سب بھی میری بات پر یقین کرنے میں کوئی تامل نہ کرتے کہ شمعون کے مقابلے میں، میں بہر حال تم سب کی نظر میں زیادہ معتبر ہوں، لیکن میں نے آج سچ بتانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے جو بھی سزا سنائی جائے گی، قبول ہوگی۔ ہاں، لیکن اگر مجھ پر یقین کرنے کو جی چاہے تو دل سے ہر شب، دھڑکا نکال کر پورا یقین کرنا، کیوں کہ ادھر ا یقین، پورے شک سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مجھے تم سب کے فیصلے کا انتظار رہے گا۔“ میں ان سب کو سوچوں کے بھنور میں ڈوبا چھوڑ کر ہال سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی راہ داری میں ایرک، جم، فرہاد اور جینی تیزی سے میری جانب آتے دکھائی دیے۔ ان کے چہروں سے شدید پریشانی ٹپک رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے۔ فرہاد نے جلدی سے میرا بدن ٹٹولا ”تم ٹھیک تو ہونا۔ ہمیں پتا چلا کہ تم پر عامر بن حبیب کے ساتھیوں نے حملہ کیا ہے۔“ ایرک اور جم بھی شدید غصے میں تھے ”تم صرف نام بتاؤ ان کے، ہم ابھی زندہ ہیں آیان۔“ جینی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے دوبارہ ہال کی جانب کھینچا ”تم چلو ہمارے ساتھ، دیکھتے ہیں کس میں ہمت ہے، تمہیں چھو کر تو دکھائے۔“ میری آنکھیں بھر آئیں۔ دل تو جانے کب سے بھرا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ چاروں میرے لیے چار سو سے بھی بھروسہ کرتے ہیں۔ ”میں ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ فرہاد چلا یا ”لیکن ہم ان لوگوں کو ان کے کیسے کی سزا ضرور دیں گے۔“ میں نے ہال کی طرف جاتے ہوئے فرہاد کی کلائی پکڑ لی۔ ”نہیں! اس بار سزا دینے کا اختیار ان کا ہے۔ چلو، تم لوگ میرے ساتھ۔“ میں آگے بڑھ گیا اور وہ چاروں بھی بادل نخواستہ میرے پیچھے چل پڑے۔ پھر میں زیادہ دیر کیسپس میں نہیں ٹھہرا۔ مجھے بسام سے ملنے کے لیے بھی جانا تھا اور جب لاک اپ پہنچا تو ملاقات کے ناٹم میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ بسام بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ”کہاں رہ گئے تھے، آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ میں نے بسام کو آج کی روداد سنا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”ہاں سب ٹھیک ہے، دو دن بعد تمہاری بخوشی ہے، میں تمہارے لیے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرنا۔“ بسام کے ہونٹوں پر ایک شکستہ سی مسکراہٹ ابھری۔ ”نہیں! اب میں نے فکر کرنا چھوڑ دی ہے۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔“ بسام کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں اتنی مایوسی تھی کہ میرے اندر جھل سا گیا۔ ”ایسے کیوں کہہ رہے ہو؟ میں تمہیں ان دیواروں کے پیچھے زیادہ دن قید نہیں رہنے دوں گا اور یہ بھی غور سے سن لو کہ میں اپنا خیال بالکل بھی نہیں رکھوں گا۔ تم کو باہر آ کر میرا خیال رکھنا ہوگا، تم جانتے ہو، مجھے اپنا خیال رکھنے کی بالکل عادت نہیں ہے۔“ بسام نے کچھ نہیں کہا، بس چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ جب بچپن میں چھٹی کے بعد دیر گئے اسکول خالی ہو جانے پر بھی ڈیڈی ہمیں لینے کے لیے نہ آتے، تو ہم دونوں بھائی خوف کے مارے اسی طرح بڑے میدان میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جب تک بیٹھے رہتے، جب تک کوئی آ کر ہمیں وہاں سے گھر نہیں لے جاتا تھا، لیکن آج ہم دونوں کو پیار کر کے گھر لے جانے والے می، ڈیڈی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ آج ان کے دونوں لاڈلے اسی طرح خوف زدہ بیٹھے تھے، لیکن اس شام ہمیں وہاں سے لے جانے کوئی نہیں آیا۔

میں بسام کو جھوٹی تسلی دے کر باہر نکلا تو ستمبر کی اداس شام ڈھل رہی تھی۔ ان شاموں کو جانے ہمارے اندر کے موسم کی خبر کیسے ہو جاتی ہے، جیسا سرمئی اندھیرا ہمارے اندر اتر رہا ہوتا ہے، ٹھیک ویسا ہی روپ باہراک افق بھی دھار لیتا ہے اور پھر ہمارے اندر اور باہر ایک ہی وقت میں روشنی کی آخری کرن بھی ڈوب جاتی ہے۔ میں اسی اندھیرے میں اپنا آپ ٹٹولا، بایک نیویارک کی مصنوعی روشنیوں سے بھری سڑکوں پر دوڑاتا ہوا مین بیٹن میں کھیل کا انتظام کرنے والے ٹیگروز کے اپارٹمنٹ کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ سب اپارٹمنٹ کے پکے فرش پر بنے کورٹ میں باسکٹ بال کھیل رہے تھے، آس پاس گلی کی روشن لائٹس نے ایک دائرہ سا بنا رکھا تھا، مجھے دیکھ کر ان کا لیڈر کیلی چلا یا۔ ”ہے آیان..... کہاں ہو مین، ہمیں بھول گئے کیا.....؟“ ”نہیں! تمہیں یہ یاد دلانے آیا ہوں کہ میرے پرانے زخم بھر چکے ہیں اور میں اب پھر سے کھیلنے کے لیے تیار ہوں۔“ کیلی خوش ہو گیا، ”یہ ہوئی ناں بات، لیکن میرا کچھ پرانا ادھار بھی باقی ہے تم پر۔“ ”ہاں، مجھے یاد ہے۔ میرا بیچ ڈلوادوٹم کے ساتھ۔ جیت گیا تو سارا ادھار کل رات ہی چکا دوں گا۔“ کیلی ہنسا ”اور اگر ہار گئے تو.....؟“ ”تو بدلے میں تم مجھ سے کوئی بھی بانڈ بھروالینا۔ میں اگلے دس بیچ تمہاری جانب سے بلا معاوضہ کھیلنے کے لیے تیار ہوں اور تم جانتے ہو کہ میں اپنے وعدے کا پکا ہوں۔“ کیلی نے سر ہلایا۔ ”ہاں، خیر اس میں تو کوئی شک نہیں، لیکن ٹم کے ساتھ ہی کیوں کھیلنا چاہتے ہو؟ پہلے بھی تمہیں ہرا چکا ہے اور اس وقت وہ نیویارک کا بہترین رائیڈر ہے۔ خواہ مخواہ اپنی جان مصیبت میں نہ ڈالو۔ وہاں جیتنے کے چانسز سو میں سے دس فی صد بھی نہیں۔“ ”اسی لیے میں اس کے ساتھ کھیلنا



چاہتا ہوں، اس سے جیتنے کی صورت میں رقم بھی دس کے مقابلے میں 100 فیصد زیادہ ملے گی۔“ کیلی نے کندھے اچکائے ”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی، کل رات 10 بجے تک پہنچ جانا ہمارے پرانے ٹھکانے پر۔“ میں نے سر ہلا کر بائیک کا ایکسی لیٹر دبا دیا۔ میرے پاس بسام کے لیے نئے وکیل کی فیس جمع کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا، اب چاہے انجام تخت ہوتا یا تختہ، مجھے یہ بازی کھیلنا تھی۔ واپسی پر ٹائم اسکوائر کے مشہور کیفے کے باہر میں نے لوگوں کو کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے دیکھا، تو ان کی خوش نصیبی پر رشک آنے لگا۔ ہم انسان بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں، جب ہمارے پاس فرصت اور خوشی کے لمحات ہوتے ہیں، تو ہم انہیں کھل کر جینے کے بجائے خود کو مستقبل کی الجھنوں میں کھپائے رکھتے ہیں اور جب وہی مستقبل حال بن کر ہم پر کسی نئے عذاب کی صورت کھلتا ہے، تو ہم بیٹھ کر اس سنہرے ماضی کی یاد میں آہیں بھرتے اور خود کو کوستے رہتے ہیں کہ کتنا اچھا وقت ہم نے یونہی ضائع کر ڈالا۔ شاید انسان کا مستقبل سدا ہی سے دھندلا، حال ہمہ وقت بے کیف و بے چین اور ماضی ہمیشہ دل فریب رہا ہے۔

اگلے روز میرا یونیورسٹی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن میں یہ سوچ کر چلا آیا کہ کہیں اسے کسی فرار کے طور پر نہ لیا جائے۔ کاش انہیں کوئی بتاتا کہ اب میرا اصل فرار ان سب کے درمیان میری موجودگی ہی ہے، ورنہ تنہائی تو مجھے اب کسی بُرے خواب کی طرح ڈرانے لگی تھی۔ اس روز صبح سویرے ہی سے بخ بستہ ہوائیں نیویارک کی بھرپور خزاں کی آمد کا پتا دے رہی تھیں اور ہماری یونیورسٹی کی طرف جانے والی سنان سڑک زرد اور پیلے پتوں سے یوں ڈھکی ہوئی تھی، جیسے کسی نے سونے کے پانی سے بھرے کئی تھال وہاں الٹ دیے ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہلکی بوند باندی بھی شروع ہو گئی اور شاخوں پر جموتے وہ خشک پتے، جنہیں تیز ہوا بھی گرا نہیں پاتی تھی، بوندوں کی سازش کی وجہ سے اپنی محبوب ٹہنیوں کی بانہوں سے چھوٹ کر زمین پر گرنے لگے۔ فنا اور جدائی ہی دنیا کے ہر رشتے کا حاصل ہے۔ کیفے میں مجھے اپنے دوستوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میرا کلاس لینے کا بالکل بھی من نہیں تھا، لہذا میں اسٹڈیم کی بھیگی سڑکیوں پر آکر بیٹھ گیا، آج اسٹڈیم بھی ابھی تک خالی تھا اور تیز بوند باندی کی وجہ سے اسٹڈیم کی خزاں سے خشک ہوتی سنہری گھاس ایک مٹلی قالین کی طرح لگ رہی تھی، جس پر بہت سی چاندی کے موتی ٹانک دیے گئے ہوں۔ میں اپنے خیالوں میں گم جانے کتنی دیر تک بارش کے قطروں کو گھاس کا سنگھار کرتے دیکھتا رہا، پھر اچانک ہی ایک مانوس سی خوش بو اور جانی پہچانی سی قدموں کی آہٹ نے سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دُور واہی تھی، سفید جینز پر کالی شال لپیٹے، اداس اور نڈھال سی۔ کچھ لڑکیاں اداس ہو کر زیادہ حسین کیوں ہو جاتی ہیں؟ یا شاید ان کا اصل ”اندازِ حسن“ اداسی ہی کی دین ہوتا ہے۔ شاید کچھ چہرے خوشی یا عام معمول کے حالات میں وہ روپ اختیار نہیں کر پاتے، جس سے ان کا اصل حسن نمایاں ہو، گویا ہم اپنی زندگی میں اپنے آس پاس کے بہت سے لوگوں کی اصل خوب صورتی کو اپنی نظر سے پرکھ ہی نہیں پاتے؟ اور کون جانے اس فہرست میں اول نمبر پر ہمارے کمرے میں لگے آئینے کے اندر بیٹھا شخص خود ہی ہو؟ ”یہاں اکیلے بیٹھے ہو آ یاں..... تمہارے دوست کہاں ہیں.....؟“، ”شاید وہ سب کلاس میں ہوں گے۔ کچھ دیر تنہا بیٹھے کو دل چاہ رہا تھا، اس لیے یہاں چلا آیا۔“ پُر وا کچھ دیر خاموش رہی۔ ”جانتے ہو، میں کل سے کئی بار ٹوٹی اور پھر ٹوٹ کر جڑی ہوں۔ میرے اندر شکست و ریخت کے اس مسلسل عمل نے مجھے ایک رات ہی میں برسوں کی تحسین عطا کر دی ہے۔ تم تو اعترافِ جرم کر کے سکون سے چلے گئے، لیکن مجھے ایک عذاب میں ڈال گئے۔ بولو آ یاں! میں کس سے کہوں، میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تم سے خوب لڑوں..... اتنا کہ میرے اندر کا سارا غبار نکل جائے، لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ایسا کر نہیں پا رہی، تم نے مجھ سے میرا اپنا آپ بھی چھین لیا ہے آ یاں۔ بہت برا کیا ہے تم نے“ پُر وا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا دل چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس کی پلکوں کے یہ ستارے اپنی ہتھیلی کے چاند میں جذب کر لوں اور اس کی بھیگی آنکھیں پونچھ کر کہوں کہ موتیوں کا یہ خزانہ وہ مجھ جیسے ضمیر کے مجرم کے لیے ضائع نہ کرے کہ ایک خلقت انہیں پھٹنے کے لیے اپنی دعا یہ ہتھیلیاں لیے بیٹھی ہوگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہاں! جانتا ہوں کہ میں نے بہت برا کیا، لیکن ایک برے سے برائی کی توقع ہی کی جاسکتی ہے پُر وا۔ تم آئندہ کبھی بھی کسی برے شخص سے کسی اچھائی کی توقع نہ رکھنا۔ امیدیں ٹوٹ جائیں تو واقعی بڑا درد ہوتا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ پُر وا نے تڑپ کر اپنی پلکیں اٹھائیں، اس کی پلک پر انکا ایک ننھا سا آنسو ٹپک کر اس کے سردی سے نیلے پڑتے ہاتھ کی پشت پر گر ا، ”کاش میرا دل تمہیں مجرم مان کر مجھے اس مقام تک تو لاتا، جہاں میں تمہیں معاف کرنے کا سوچ پاتی۔ میرا دل تو مجھے تمہارے جرم کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا۔ مجھ سے غداری پر اتر آیا ہے، میری ایک نہیں سنتا۔ شاید مجھے تم سے محبت ہو رہی ہے

تیز ہوا کے ایک بھیکے جھونکے نے ہڈیوں کے چہرے پر بال بکھرا دیے۔ میں زور سے چونکا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو اس عذاب میں مت دھکیلو۔ یہ تمہاری روح کا آخری ریشہ بھی اوجڑ کر تمہارے جسم کو نیا کر دے گا۔ محبت کے زہر کا کوئی تریاق نہیں ہوتا۔“ ہڈیوں کے جھونکے نے بیٹھی رہی ”جانتی ہوں، پر افسوس ہمیں اپنی اس دھیرے دھیرے قضا ہوتی روح کا پتا بہت دیر سے چلتا ہے۔ مجھے بھی بہت دیر ہو چکی ہے آیان۔“ اتنے میں میرے عقب سے بابر سیدی کی تیز آواز ابھری۔ ”اچھا تو تم یہاں بیٹھے ہو۔۔۔۔۔ کب تک اپنی سزا سے بچو گے مسٹر آیان۔۔۔۔۔“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بابر سیدی کے ساتھ عامر بن حبیب اور دوسرے بہت سے مسلم طلبہ اسٹیڈیم کے گیٹ نمبر 7 سے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ ”میں اپنی سزا کے انتظار ہی میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ چنانچہ کے قیدی کو سولی پر زیادہ انتظار نہیں کروایا جاتا۔ اپنا فیصلہ سناؤ۔“ ہڈیوں کے جھونکے نے کھڑی ہو گئی۔ عامر بن حبیب اور بابر سیدی باقی سب لڑکوں کے ساتھ میری جانب بڑھے۔ عامر اور بابر میرے بالکل مقابل آن کھڑے ہوئے اور کچھ دیر تک ہم تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ عامر بولا ”سزا تو ہم نے تمہارے لیے بہت کڑی تجویز کی ہے، لیکن ہم تمہیں اپیل کا حق بھی دینا چاہتے ہیں، تم چاہو تو سزا میں کمی کے لیے اپیل کر سکتے ہو۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”جو پہلے ہی سے فنا ہو چکے ہوں، انہیں دوبارہ آتی موت کا بھلا کیا غم۔۔۔۔۔ تم آخری سزا سناؤ۔ میں اپیل کر کے وقت ضائع نہیں کروں گا۔“ عامر بن حبیب نے بابر سیدی کی جانب دیکھا۔ بابر ایک قدم آگے بڑھا ”تو پھر سنو، ہم نے تمام مسلم طلبہ کی ذمہ داری کی سزا تمہارے لیے تجویز کی ہے۔ تمہیں بطور مسلم کا وٹس لائن سب کا ساتھ دینا ہوگا اور ہر مرحلے پر اپنے تن، من اور روح کی آخری گہرائی سے ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھنا ہوگا۔ بولو ایک سال کی یہ سزا قبول ہے تمہیں۔۔۔۔۔“ میں گنگ سا کھڑا تھا اور پھر اچانک میری آنکھوں سے کفارے کے دو آنسو ٹپک کر نیچے زمین پر بارش کے پانی میں مل گئے۔ کاش کفارے کے لیے بہائے گئے آنسوؤں کا رنگ عام جتے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا، تو شاید بہت سی باتیں ان کہی رہ جاتیں، بہت سے کہنے سے لفظ بچ جاتے۔ عامر بن حبیب نے گھبرا کر کہا ”ارے۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔ اتنا بہادر لڑکا، یوں رو رہا ہے، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔“ عامر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر وہاں موجود سب ہی کی آنکھیں نم ہو گئیں اور میں جب رو یا تو یوں ٹوٹ کر رو یا کہ کئی جنموں کا قرض ادا ہو گیا۔ وہ سب ہی مجھے تھپکیاں اور دلا سے دیتے رہے۔ ہڈیوں کے جھونکے نے بے حد گھٹاں تھی، اپنے آنسوؤں سے چھپا نہیں پائی اور پھر وہاں نہ رک سکی، تیز قدموں سے چلتی ہوئی اسٹیڈیم سے باہر نکل گئی۔ بابر نے مجھے شانوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا اور اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ ڈالے۔ ”اچھا کیا، تم آج جی بھر کر رو لیے، لیکن اب یہ آنسو میں ان کی آنکھوں میں دیکھنا پسند کروں گا، جنہوں نے ہم سب کو رو لایا ہے۔ تم

کچھ ہی دیر میں تمام یونیورسٹی میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ مسلم طلبہ نے مجھے بطور اپنا مسلم کاؤنسلر کنفرم کر دیا ہے اور انتظامیہ کو بھی قاعدے کے مطابق اطلاع کر دی گئی۔ شام تک بے حد مصروفیت رہی، لیکن مجھے یاد تھا کہ آج رات مجھے ٹم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے بسام کی رہائی کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت تھی، لہذا میں ٹھیک وقت پر رات دس بجے مین ہیٹن کی اس سنان گلی میں پہنچ چکا تھا، جہاں آج وہ آخری بازی کھیلی جانی تھی، گلی میں ٹیگروز اور دوسرے کھلاڑیوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا، کیوں کہ آج ان کے چیمپئن ٹم کا مقابلہ مجھ سے ہونا تھا۔ کیلی نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا کہ میں مقابلے کے لیے تیار ہوں اور میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کچھ ہی دیر میں ٹم بھی اپنی سپر بائیک پر گلی میں داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظریا ایک دوسرے سے ٹکرائی اور پھر ٹم سے ہوتی





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



ٹم نے اپنی بائیک کو ڈبل سائمنس کر دیا تھا، یعنی اب اس کی بائیک پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو چکی تھی۔ ٹم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”کیوں پھر اپنی جان جو حکم میں ڈالنے آگئے ہوڑ کے.....؟ سچ مانو تو اب تمہیں ہرانے کو جی نہیں چاہتا۔ اب بھی وقت ہے، مقابلے سے دست بردار ہو جاؤ۔“ میں اپنی جگہ جم رہا۔ ٹم نے بات جاری رکھی۔ ”میں دیکھ رہا ہوں، تمہاری بائیک وہی پرانی ہے، جب کہ میں نے بائیک میں نئے پاور سائمنس بھی لگوا لیے ہیں۔ یہ تو برابر کا مقابلہ نہ ہوا۔“ میں نے اطمینان سے ٹم کو جواب دیا۔ ”تم نے اس دن خود ہی تو کہا تھا کہ مقابلہ جیتنے کے لیے صرف مشین کا نیا ہونا ہی آخری وجہ نہیں ہوتی، کچھ سوا چاہیے ہوتا ہے۔ آج میں صرف اپنی بائیک کے بل پر مقابلہ لڑنے نہیں آیا، کچھ اور بھی ہے، جو مجھے اکسار ہا ہے۔“ ٹم نے غور سے میری جانب دیکھا ”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، لیکن ہار جاؤ تو پھر کوئی بہانہ نہ کرنا، جیت کا مزہ کر کر اہو جاتا ہے“، ”بے فکر رہو۔ مجھے بہانے بازی کی عادت نہیں۔ چاہے جیت ہو یا ہار، مکمل اور بھرپور ہوگی۔“ ٹم اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا۔ ہم آج اسی پرانی گلی کے کشادہ حصے میں ایک بار پھر جمع تھے، جہاں آگے چل کر یہ گلی آدھی رہ جاتی تھی۔ کھیل کے تمام انتظامات مکمل تھے اور گلی کے تنگ دھانے کو آج ایک دروازے کے آدھے پٹ سے نصف بند کیا گیا تھا۔ آخری اشارہ ہونے سے پہلے ٹیکرو، کیلی میرے پاس آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا ”ہے آیان! تم نے شاید ٹم کی بائیک نہیں دیکھی، وہ تمہاری بائیک کی دگنی رفتار سے بھی تیز دوڑ سکتی ہے۔“ ”جانتا ہوں، لیکن گلی کا تنگ دھانہ شروع ہونے سے پہلے وہ جس آخری حد تک اپنی بائیک پر کنٹرول قائم رکھ سکتا ہے، اتنی تیز میری بائیک بھی بھاگ سکتی ہے، مجھے صرف گلی تنگ ہونے تک ٹم کے ساتھ پوری رفتار سے اپنی بائیک دوڑانی ہوگی، جس میں میری بائیک کے کنٹرول سے نکل جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے، کیوں کہ میری بائیک پوری رفتار سے دوڑ رہی ہوگی، جبکہ اُس کے پاس بائیک کی آدھی رفتار باقی ہوگی، لہذا وہ اپنی بائیک پر کنٹرول رکھ سکے گا۔ ہاں، البتہ اگر ہم دونوں ایک بار گلی کے تنگ حصے میں داخل ہو گئے، تو وہاں صرف انیس بیس ہی کا فرق رہ جائے گا اور جو انیس رہ گیا، وہ دوڑ ہار جائے گا۔“ کیلی نے اپنے ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ”خداوند تم پر رحم کرے۔ تم جان بوجھ کر خودکشی کر رہے ہو، کیوں کہ آج تک میں نے تو کسی کی پوری رفتار سے بھاگتی ایک بے قابو بائیک کو ہٹا کر اس تنگ سرنگ میں جاتے نہیں دیکھا اور نگرانے کے بعد ان رائیڈرز کا کیا حال ہوتا ہے، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔“ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”کیلی..... تم خدا پر یقین کرتے ہو.....؟“ کیلی نے تیزی سے سر ہلایا ”ہاں..... ایسے مواقع پر تو بس ایک اُسی کا یقین باقی رہ جاتا ہے۔“ میں بائیک پر بیٹھ گیا۔ ”تو بس، یوں سمجھ لو کہ آج میں بھی اپنے اللہ کے بھروسے اور توکل پر یہاں اس گلی میں کھڑا ہوں اور سنو، بسام جیل میں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے، تو اسے خبر نہ کرنا۔ ایرک اور جم کو اطلاع دے دینا۔ سمجھ گئے ناں۔“ کیلی نے جلدی سے سر ہلایا، کیوں کہ ٹم اپنی بائیک کو بار بار ریس دے کر مقابلہ شروع کرنے کی ضد کر رہا تھا۔

الٹی گنتی شروع ہو گئی۔ ”تین، دو..... ایک.....“ اور ہم کمان سے نکلے دو تیروں کی طرح، گولی کی رفتار سے دوڑتی اور غزاتی ہوئی بائیکس پر سوار اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھے۔ گلی کے کھلے حصے سے تنگ حصے تک کا فاصلہ تقریباً ایک ہزار گز اور اتنا ہی فاصلہ تنگ گلی سے باہر نکلتے دروازے تک کا تھا۔ میں نے پانچ لچوں ہی میں بائیکس کا ایکسی لیٹر پوری قوت سے دباتے ہوئے بائیک کو پانچویں گیز میں ڈال دیا، تاکہ اس کی پوری رفتار حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں، لیکن ٹم کے پاس اپنی بائیک کی ابھی آدھی رفتار باقی تھی، اس لیے وہ ہٹا کوئی خطرہ مول لیے، بائیک کو قابو میں رکھ کر بھی میری بائیک جتنی رفتار حاصل کر سکتا تھا۔ پہلے ہزار گز کے لیے ہماری رفتار پہلے ہی انتہا سے زیادہ تھی۔ اس بار میرے اندر وہ کھرا انسٹنٹ پہلے لمحے ہی میں اپنی پوری قوت سے



جاگ چکی تھی۔ دوسرے کو کچل کر آگے بڑھنے کا جذبہ، اپنی جیت کے لیے دوسرے کو مسکنے اور برباد کرنے کے لیے پوری قوت لگا دینے کا شاید کوئی اپنا ہی نشہ ہوتا ہے اور یہی نشہ ہمیں ہر خطرے کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے۔ میں بھی ان لمحوں میں ہر ڈر، ہر خطرے سے آزاد ہو چکا تھا۔ ٹم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ گلیڈی ایٹرز اگر کنہرے میں چھوڑے جانے والے شیر کے گھائل ہونے کی فکر میں پڑ جاتے، تو پھر میدان سے ان کی ادھڑی ہوئی لاش ہی باہر جاتی۔ اس وقت ہم میں سے بھی کوئی ایک گلیڈی ایٹر تھا اور دوسرا کنہرے میں اترا ایک بھوکا آدم خور شیر۔ اب ہم دونوں میں سے کسی ایک ہی کو فاتح واپس لوٹنا تھا۔ گلی کا تنگ دھانہ تیزی سے قریب آرہا تھا۔ ٹم کی شروع کی ذرا سی احتیاط اور میری ابتداء ہی سے ہر حد پار کر دینے کی کوشش نے ہم دونوں کی بانیکس کو اب تک تقریباً ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹم مجھ سے چند سینٹی میٹر آگے تھا اور یہ چند سینٹی میٹر بھی میرے لیے میلوں جیسے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر ٹم کی بانیک کو ایک طرف دبائے رکھنے کے لیے اپنی بانیک کو خطرے کی حد سے زیادہ ترچھا جھکا دیا۔ اس صورت میں اگر ایک چیونٹی برابر کنکر بھی میری بانیک کے پیسے کے نیچے آ جاتا، تو میں پھسل کر نہ جانے کتنی قلابازیاں کھاتا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ ٹم نے چلا کر مجھے خبردار کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن میں اسے گلی میں ان چند سینٹی میٹرز کی برتری کے ساتھ داخل ہوتے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ٹم کو مجبوراً خود کو میری بانیک سے کچھ فاصلے پر رکھنا پڑا۔ نتیجتاً ہم دونوں ایک ساتھ تنگ گلی کی سرنگ میں داخل ہوئے۔ آس پاس قطاروں میں کھڑے تماشائی لڑکوں کے شور سے فضاء گونج رہی تھی۔ مجھے کہیں دور سے کیلی کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”شاباش لڑکے! مارو یا مر جاؤ، تم ایسا کر سکتے ہو۔“ لیکن اب ٹم کی تمام حیات بھی جاگ چکی تھیں۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بار اس کا مقابلہ صرف ایک بانیک سے نہیں، بلکہ اس کا اصل مد مقابل بانیک سوار ہے اور شاید دنیا کی ہر جنگ کا سب سے بڑا اصول اور راز بھی یہی ہے کہ جنگ ہمیشہ حریف کے حوصلے اور اس کے اندر کے انسان کی صلاحیت سے لڑی جاتی ہے، ہتھیار اور اوزار ایک اضافی قوت تو ہو سکتے ہیں، لیکن کسی بھی جنگ کی فتح کی ضمانت ہرگز نہیں۔ شاید اسی لیے دشمن کو کبھی کم زور نہ سمجھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ خود انسان سے بڑا اوزار اور اس کے حوصلے سے بڑا ہتھیار بھلا اور کیا ہوگا؟ میں اور ٹم ہرگز رتے لمبے کے ساتھ سرنگ کے دھانے سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت ہماری بانیکس تقریباً ایک دوسرے میں الجھی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ میرا ترچھا پنڈل ٹم کی بانیک کی ہیڈ لائٹ کو چھو رہا تھا اور ٹم کی بانیک کا جھکاؤ دونوں بانیکس کے ٹینکس کو بار بار ٹکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس وقت اگر غلطی سے ہم دونوں میں سے کسی ایک کا بھی پاؤں بریک کو صرف چھو لیتا، تو ہم دونوں ہی فضا میں قلابازیاں کھا رہے ہوتے۔ آخری سوگزن باقی رہ گئے تھے۔ میری کن پٹی سے شدید تناؤ کے باعث پسینے کا ایک قطرہ گر کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ٹم نے جھنجھلاہٹ میں اپنی بانیک کی اسپینڈ انہائی حد تک بڑھانے کی آخری کوشش کی، لیکن میں نے اپنی بانیک تقریباً آدھی ترچھی اس کی بانیک ہی پر جھکا رکھی تھی۔ فضا میں ہم دونوں کی بانیکس کی آپس میں رگڑ کی وجہ سے تیز چنگاریاں لپکیں۔ ٹم کی بانیک شدید طاقت و ترقعات سے کسی اندھے بھینسے کی طرح اچھلی اور میری الجھی ہوئی بانیک سے ٹکرا کر اسے بھی اپنے ساتھ دھکیلے ہوئے آگے کو بڑھی۔ میں نے اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر اپنی بانیک کو سیدھا رکھنے کی کوشش کی اور اگلے ہی لمحے میں اور ٹم دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دروازے کو توڑتے ہوئے فضا میں اچھلے۔ ہماری بانیکس پھسل کر ہمارے نیچے سے نکلیں اور ہم دونوں سمیت فضا میں لہراتی ہوئی باہر کھلی سڑک پر آ گریں، ٹھیک ایک لمحہ پہلے اس سڑک سے ایک 22 ویلر بھاری ٹرک تیزی سے ہارن بجاتا ہوا گزرا اور اس کے پیہوں کی سڑک سے رگڑ کی جلتی ہوئی مہک ابھی باقی تھی، جب میں اور ٹم زوردار آواز کے ساتھ منہ کے بل سڑک پر آ گئے۔ مجھے لگا، میری تمام ہڈیاں ایک ساتھ ہی کسی بڑے گرائنڈر میں مجھ سمیت ڈال کر پیس دی گئی ہوں۔ میں نے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اب مجھے دوبارہ کبھی یہ ٹکلیں اٹھانے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑے، کیوں کہ اس وقت مجھے اپنی پلکوں کا وزن بھی ہزاروں ٹن معلوم ہو رہا تھا۔ جب ہم اپنے اندر کے آخری ریشے تک کی قوت، شدید مشقت اور محنت کے بعد کوئی جنگ ہارتے ہیں، تو اس بار میں بھی ایک طمانیت چھپی ہوئی ہے۔ اپنے مطمئن ضمیر کے سراپے جانے کا سکون شامل ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آنکھیں بند ہوتے وقت میرے اندر بھی اسی طمانیت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

جانے کتنی صدیاں یوں ہی گزر گئیں۔ پھر مجھے ایک ساتھ بہت سی آوازیں اور ملا جلا شور سنائی دیا۔ کوئی میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر، میرے گال تھپتھپا رہا تھا ”ہے آیان.....! ہوش میں آؤ، تم ٹھیک تو ہو، تم جیت گئے ہو میں۔“ اور جیت کے اس لفظ نے مجھے واپس ہوش میں لانے کے لیے جیسے ایک زور آور (Atalyst) کا کام کیا۔ میں نے کراہتے ہوئے ٹکلیں اٹھائیں، تو وہ سب مجھ پر بجھکے ہوئے تھے۔ میری ضروری ”مرہم پٹی“ کی جا چکی تھی۔ دور میری اور ٹم کی بانیکس کے کچھ مر نماؤں حیر میں سے ہلکا ہلکا سادھواں اٹھ رہا تھا۔ کیلی نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا اور میرے منہ سے بہت سی آہیں اور کراہیں نکلیں۔ ”ٹم کہاں ہے.....؟“ دوسرا ننگر مارٹن زور سے ہنسا ”وہ بھی دوسرے فٹ پاتھ پر پڑا کراہ رہا ہے۔“ پتا چلا کہ آخری بیس گز میں جب ٹم کی بانیک نے انہائی تیز ترقعات کی وجہ سے میری بانیک کو اپنے راستے سے دھکیلنے کی کوشش کی تھی، تو ٹم کی بانیک کے جھٹکے کی وجہ سے میری بانیک بھی اچھل گئی تھی، لیکن یہی بات ٹم کی ہار کا باعث بن گئی، کیوں کہ اس کی بانیک کی بے پناہ طاقت نے میری بانیک اچھال کر دروازے کی جانب پھینک دی تھی اور پھر جب ٹم کی بانیک میری بانیک سے ٹکرائی، تو پہلے میری اور پھر ٹم کی بانیک، ہم دونوں سمیت ہوا میں اچھلتی ہوئی باہر سڑک پر آ گریں اور اس طرح میری بانیک چند انچ کے فاصلے سے آگے رہنے کی وجہ سے یہ مقابلہ جیت گئی۔ میں نے نظراٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ مجھے ٹھیک طرح سے اللہ کا شکر ادا کرنا بھی نہیں آتا یا شاید جتنی بڑی کام یابی یا خوشی وہ ہمیں عطا کرتا ہے، اسی قدر ہمارے اندر موجود الفاظ کا ذخیرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں اپنی دعاؤں میں بے حد نظم و نسق اور سلیقے سے جڑے الفاظ ادا کرنے والے شدید خوشی یا کسی ان ہوتی فتح کی صورت میں میری طرح بس ”غوں غاں“ کر کے ہی رہ جاتے ہوں گے۔ میں دوسری جانب اپنے ساتھیوں میں گھرے ٹم کی جانب بڑھا اور اسے بھی ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ٹم نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم نے تو آج مجھے ماری ڈالا تھا آیان۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم جیت چکے ہو۔“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا ”یہ مشورہ تمہارا ہی تو تھا کہ تم سے مقابلہ کرنے سے پہلے مجھے خود میں وہ کھرا سنٹک پیدا کرنی ہوگی۔“ ٹم نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ”آئندہ میں کسی کو اپنے راز بتاؤں، تو تم سب مل کر مجھے مارنا۔“ ٹم کے سب ساتھی بھی مجھ سمیت ہنس پڑے۔ کیلی نے مقابلے کی انعامی رقم میری جیب میں ٹھونس دی ”جاؤ، جا کر عیش کرو لڑکے۔ میں تمہاری بانیک کی ”باقیات“ تمہارے ملکینک کو بھجوا دوں گا۔“ میں لڑکھڑاتا ہوا سب سے ملنے کے بعد جانے کس وقت اپنے پارٹمنٹ پہنچا اور بستر پر ڈھے گیا۔ اگلے روز بھی میرا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، لیکن میں بستر پر پڑے رہنے کی عیاشی مول نہیں لے سکتا تھا، کیوں کہ آج مجھے کسی بھی حال میں بسام کے لیے کسی بہتر وکیل کا بندوبست کرنا تھا۔ 12 بجے دوپہر عرفی ماموں بھی میری طرف آ گئے اور ہم اکٹھے ہی گھر سے نکلے۔ عرفی ماموں میری لڑکھڑاہٹ دیکھ کر پریشان سے ہو گئے۔ ”خیریت تو ہے بھانجے! تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی؟“ ”نہیں..... میں ٹھیک ہوں، بس ہلکی سی موج ہے پاؤں میں۔“ ماموں نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا، لیکن چپ رہے۔ ہم شہر کے مشہور وکیل، آسٹن کے پاس جا رہے تھے، جس کی شہرت ایسے کیسز میں بہت اچھی تھی۔ ”آسٹن جیہیرز“ بروک لین برج کے قریب ہی تھا اور اس کی راہ داری میں باہر کی جانب کھلتی کھڑکیوں کی طویل قطار سے اندر آتی نرم دھوپ کے مستطیل ٹکڑے فرش پر یوں بچھے تھے، جیسے کسی نے باقاعدہ انہیں ”سو کھنے“ کے لیے زمین پر ڈالا ہو۔ برآمدے میں مٹی پلانٹ کی سبز بلیں بھی دور تک ستونوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ کافی دوستانہ ماحول قسم کا دفتر تھا وہ۔ کچھ دیر میں آسٹن کی اسارٹ سی بیکر ٹری



نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی اور میں ماموں کے ساتھ آسٹن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ آسٹن نظری عینک لگائے ایک دھان پان شخص تھا، جس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔ اس نے غور سے ہماری ساری بات سنی اور پھر کچھ دیر تک کیس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد بولا ”بہ ظاہر تو یہ کوئی خاص الجھا ہوا کیس نہیں لگتا..... تمہارے بھائی کو دو نہیں، تو چار پیشیوں کے بعد باہر آ جانا چاہیے، کیوں کہ اس پر کوئی جرم ثابت نہیں، نہ ہی کوئی چارج لگایا گیا ہے۔ پھر تم لوگوں نے سرکاری یا ریستوران کے وکیل پر اکتفا کیوں نہیں کیا؟ معاف کیجیے گا، شاید یہ بات کاروباری اصولوں کے خلاف ہو، لیکن اتنے سے کام کے لیے آپ کو میری بھاری فیس بھرنے کی کوئی خاص ضرورت نظر نہیں آ رہی مجھے..... آپ لوگ پھر سوچ لیں۔“ مجھے آسٹن کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی۔ میں نے جیب سے پیسے نکال کر میز پر رکھے۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس پیسے بھی بہ مشکل آپ کی دو پیشیوں کی فیس جتنے ہی ہیں، لیکن یہ پیسے میں نے صرف آپ کی فیس بھرنے کے لیے ہی کمائے ہیں۔ اب ان پیسوں کے بدلے کوئی مجھے امریکا کی صدارت بھی پیش کرے، تو وہ میرے لیے بے مصرف ہوگی۔ میں جانتا ہوں آپ چھوٹے موٹے کیس نہیں لیتے، لیکن یہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے اہم کیس ہے۔ سنا ہے، وکیل جذبات سے ہٹ کر سوچتے ہیں، لیکن میری درخواست ہے کہ آپ یہ مقدمہ جذبات کی بنیاد پر لڑیں۔ ہاں اگر میرا بھائی ان دو پیشیوں میں باہر نہ آسکا، تو یہ ہماری اور اس کی قسمت.....“ آسٹن غور سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ”بہت محبت کرتے ہو اپنے بھائی سے.....؟ اچھا لگا مجھے سن کر، رشتوں اور جذبات سے عاری اس امر کی معاشرے میں یہ محبت کسی تازہ پھول کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ چلو، ٹھیک ہے۔ اس بار جذبات ہی سہی، تم یہ فارم بھر دو اور یہ پیسے واپس جاتے ہوئے کاؤنٹر پر جمع کراتے جانا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بھائی کو زیادہ عرصہ قید میں نہ گزارنا پڑے۔“ عرفی ماموں کے چہرے پر بھی رونق سی آگئی۔ میں نے کاغذات بھر دیے اور ہم معاوضے کی رسید لے کر آسٹن کے دفتر سے نکل آئے۔ میں ماموں کو ان کے اسٹور چھوڑتا ہوا، یونیورسٹی چلا آیا۔ کل شام سے لے کر اب تک یہ سب کچھ اتنی تیزی اور تواتر سے پیش آیا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے بھی سنبھل نہیں سکا تھا۔ آج جب بسام کے لیے وکیل کا انتظام ہو گیا تھا، تو مجھے کچھ فرصت ملی تھی۔ مجھے گزشتہ روز پڑوا سے ہوئی وہ ملاقات یاد آئی، جس میں اس نے اپنے معصوم من کے کچھ راز مجھ سے ہانٹے تھے۔ وہ اتنی بھولی تھی کہ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ایسے کوئل رازدول کی سرحدیں پار کر کے دوسرے کی سماعتوں کے شریک بن جائیں، تو کئی بار اپنی حرمت کھودیتے ہیں۔ کون جانے سننے والے کا ظرف اتنا بلند ہو بھی یا نہیں کہ وہ اس نازک جذبے کی قیمت کو جان سکے اور پھر امریکا جیسے بے حد آزاد معاشرے میں محبت کا مفہوم زیادہ تر جنس کی صورت ہی لیا جاتا تھا۔ ایسے میں بھلا یہ نازک آب گینوں جیسی باتیں بھلا کسے سمجھ میں آتیں۔ میں نے سوچا کہ میں کسی وقت اطمینان سے پڑوا کو سامنے بٹھا کر یہ سب سمجھاؤں گا، لیکن وہ آج یونیورسٹی آئی ہی نہیں تھی۔ صنم کبیر بھی بسام کی گرفتاری کی وجہ سے روز بہ روز الجھتی سی جا رہی تھی۔ میرے سامنے وہ میری ہمت باندھنے کے لیے لمبی لمبی تقریریں کرتی رہتی، لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے چہرے پر پھیلی وہ شفق جیسی لالی دن بدن دھیمی کیوں پڑتی جا رہی تھی۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکیاں اپنے دل میں بہ یک وقت اتنے درد چھپا کر زندہ کیسے رہ لیتی ہیں۔

مسلم طلبہ نے ظہر کی نماز کے لیے یونیورسٹی کے عقبی والا ان کے ایک چھوٹے سے گوشے کو پختا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو بنگالی حافظ قرآن ٹھکیل کی معیت میں وہ سب باجماعت نماز پڑھ رہے تھے۔ ٹھکیل کے سلام پھیرنے تک میں غور سے ان سب کو دیکھتا رہا۔ آخر کچھ تو کشش ہوگی اس سجدے میں، جو انہیں تمام کام اور تمام مصروفیات بھلا کر یہاں اکٹھا ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر وہ سب میرے اطراف جمع ہو گئے۔ احمر نے جوش میں میرا ہاتھ تھام لیا ”آیا ان..... آج ہم نے یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کیسپس میں سجدہ کیا ہے اور یہ موقع اللہ نے تمہارے توسط سے ہمیں عطا کیا ہے۔ ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”یہ ہم سب کی مشترکہ جیت ہے، لیکن ابھی ہمیں اپنی شناخت کا بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔ تم سب میرا ساتھ دینا۔“ سب نے زور و شور سے سر ہلا کر اپنی وفاداری کی تجدید کی۔ جھوم میں سے کسی نے مجھے چھیڑا ”ہے کاؤنسلر!! تم خود نماز کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ ہمیں بڑی خواہش ہے کہ تمہاری سربراہی میں جماعت ادا کریں۔“ سب ہنسے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ”ہمارے یہاں ایک بڑی مشہور کہاوٹ ہے، ”نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم مٹلا خطرۂ ایمان۔“ وہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بات سے بات نکلی، لیکن مجھے شیخ الکریم کی نماز کیسے کرنے کے بارے میں کئی نصیحت یاد آگئی۔ جانے کیوں، لیکن مجھے ہمیشہ ہی سے نماز پڑھنے میں ایک عجیب سی جھجک مانع رہتی تھی۔ جیسے میں اس مقدس فرض کو ادا کرنے کے لائق ہی نہیں ہوں۔ میرے اندر ایک اور عجیب سا احساس بھی ہمیشہ پلتا رہتا تھا کہ جب ایک بار انسان نماز کی تمام تیاری کر کے وضو سے اپنے آپ کو پاک کر کے سر کو ڈھانپ کر اس اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہو جائے تو پھر اس کا دوبارہ اس دنیا کے جھمیلوں کی طرف پلٹنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے، لیکن یہ عبادت زندگی بھر میں اگر صرف ایک باری فرض ہوتی تو کیا تب بھی ہم اپنی عبادت ختم کر کے دوبارہ گناہوں کی طرف پلٹ نہ جاتے۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ دھڑلکا لگا رہتا تھا کہ میں نماز پڑھنے کے بعد پھر سے اپنی اسی آلودہ زندگی کی طرف لوٹ آیا، تو میری عمر بھر کی عبادت ہی ضائع ہو جائے گی۔ میں اپنے اس پہلے سجدے کو بچا کر رکھنا چاہتا تھا، تاوقت یہ کہ وہی ایک سجدہ میری نیا پار لگا دے اور پھر مجھے دوبارہ اس گناہوں سے آلودہ کنارے پر واپس پلٹ کر نہ آنا پڑے۔ جانے میرے نصیب کا وہ آخری سجدہ کب اور کس خاک کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہوگا۔ میں اپنے مسلم گروپ کے ساتھ یونیورسٹی کے اکیڈمک بلاک میں پہنچا، تو صحن کی سیڑھیوں پر ہماری مڈ بھیڑ اوپر سے آتے شمعون اور مائیکل سے ہو گئی، جو چند یہودی لڑکوں کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے ہم دونوں گروہ رک گئے۔ میں اور شمعون کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ شمعون نے مجھ پر طنز کیا ”بڑی تیزی سے مقبول ہو رہے ہو مسلم کاؤنسلر، لیکن یاد رکھنا، جو بہت تیزی سے اوپر جاتے ہیں، وہ اتنی ہی تیزی سے نیچے بھی آگرتے ہیں۔ خود کو گرنے سے بچا لینا، اگر بچا سکو تو.....“ احمر غصے میں ایک قدم آگے بڑھا، لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور شمعون کی طرف دیکھا۔ ”مجھے جتنا گرتا تھا، تم لوگوں کا ساتھ دے کر اس سے کہیں زیادہ گر چکا ہوں، اب میرے اٹھنے کی باری ہے اور یاد رکھنا، جس دن میں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو گیا، اس دن تم جیسوں کو شاید بیٹھنے کی جگہ بھی نہ ملے..... ہو سکے تو اپنا اور اپنے جیسوں کا پہلے ہی سے کچھ بندوبست کر لینا۔“ میرا جواب سن کر شمعون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اگر ٹھیک اسی وقت ڈپٹی ڈین کا وہاں سے گزرنہ ہوتا، تو بات کافی بڑھ جاتی۔ ڈپٹی ڈین نے ہمیں سیڑھیاں خالی کرنے کا حکم دے دیا، کیوں کہ ہماری وجہ سے بھیڑ جمع ہو رہی تھی، لہذا ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے مخالف سمتوں میں چل پڑے۔

شام کو میں بسام سے ملنے گیا، تو اس نے بتایا کہ اگلے روز نائن الیون کی وجہ سے ان سب لڑکوں کی پیشی کو دو روز کے لیے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ میں نے بسام کو تسلی دی کہ ہم نے اس کے لیے آسٹن نامی وکیل کر لیا ہے اور اب وہ جلد ہی باہر نکل آئے گا۔ بسام نے میرے جسم اور ہاتھوں پر پڑی خراشیں دیکھ کر مجھے گھورا ”تم نے پھر ریس لگائی ہے.....؟“ لیکن میں اس کی بات ٹال گیا۔ اگلی صبح نیو یارک میں ہوئے ایک ایسے خوف ناک حادثے کی یاد دلاتی تھی، جس نے تمام دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی۔ 11 ستمبر کی اس صبح جب میں یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلا تو شہر میں عجب ہو کا عالم تھا۔ حادثے ہو کر گزر جاتے ہیں، پر اپنی تکلیف دہ یادیں عمر بھر کے لیے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ گراؤنڈ زیرو پر ان عمارتوں کے انہدام کی جگہ پر گزشتہ رات ہی سے مرنے والوں کی یاد میں موم بتیاں جلا کر رکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو، وہ سب مرنے والے انسان تھے اور معصوم بھی۔ میں نے بھی ایک شیخ ان کی یاد میں روشن کر دی۔ میں بس سے اتر کر یونیورسٹی کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوا، تو نہ جانے کیوں، مجھے وہاں بھی شہر کی طرح ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ آج مسلم طلبہ نے کیسپس میں عید منانے کا اہتمام کیا تھا، لیکن مجھے اکیڈمک بلاک تک پہنچتے ہوئے کہیں بھی اس روایتی عید کی جھلک نظر نہیں آئی۔ اچانک سامنے سے احمر تیزی سے چلتا ہوا نظر آیا ”اوہ آیا ان! کہاں تھے تم، پولیس نے باہر سیدی کو نائن الیون پر یہودیوں پہ حملہ کرنے کے منصوبے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔“..... (جاری ہے)

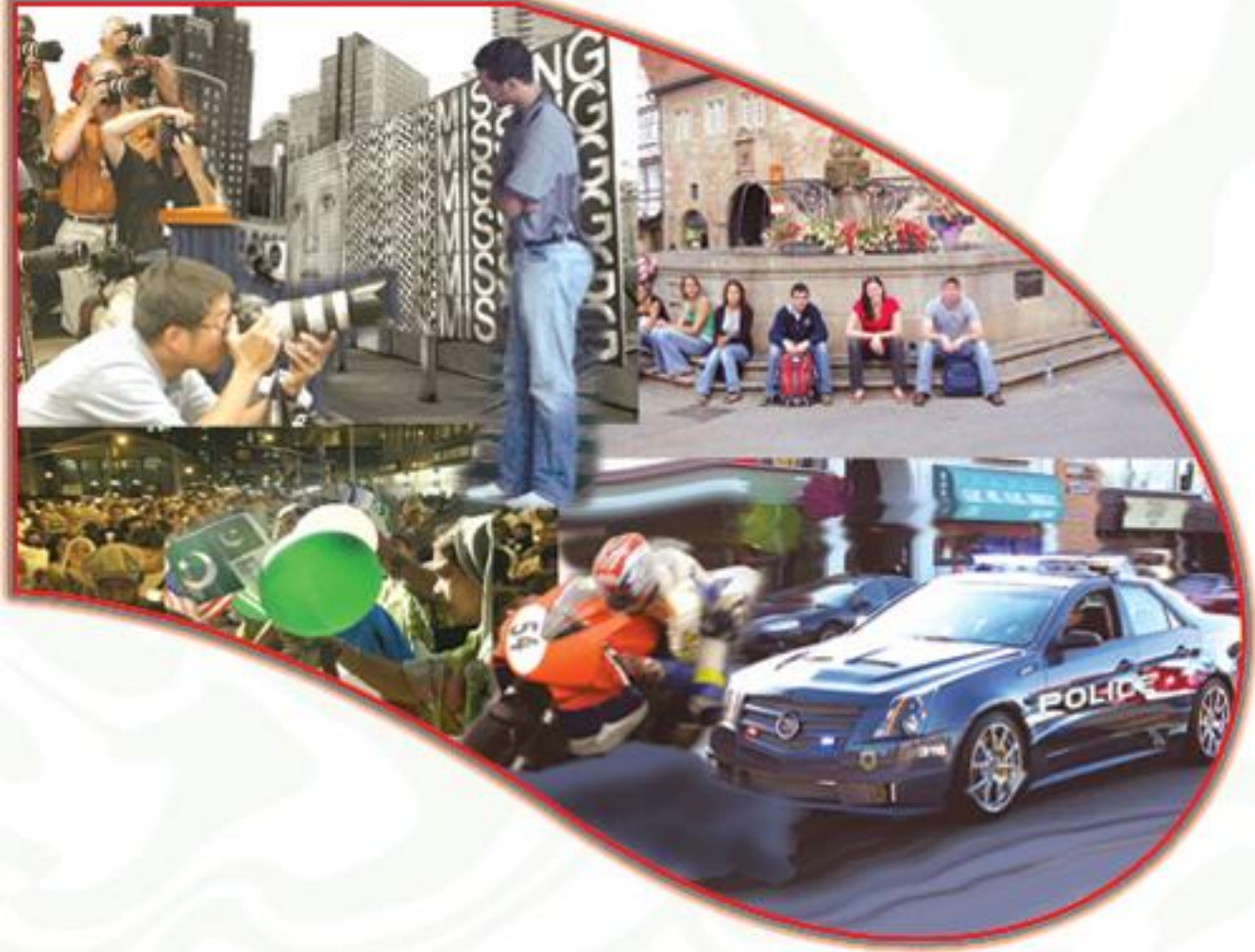




ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و قدرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



میرے ہاتھ میں پکڑا ہیلمٹ گرتے گرتے پچا۔ ”کیا..... یہ سب کب ہوا اور تم لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں.....؟“، ”ہمیں خود سچ پتا چلا۔ جانے رات کو کس وقت پولیس نے چھاپہ مارا۔ عامر بن حبیب اس وقت کمرے میں نہیں تھا، ورنہ اسے بھی ضرور گرفتار کر لیا جاتا۔“ میں تیزی سے مسلم ہاسٹل کی جانب پلٹا۔ ”عامر اس وقت کہاں ہے.....؟“ احمر میرے پیچھے ہی لمبے لمبے قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ ”اسے ہم لوگوں نے ضمانت ملنے تک روپوش کروادیا ہے۔ آج عدالتیں بند ہیں۔ کل اس کی ضمانت کی کوشش کریں گے۔“ یونیورسٹی میں بھی آج ٹائن ایون کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیاں موقوف تھیں۔ مجھے ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے راہ داریوں میں یونیورسٹی آڈیٹوریم میں آج کے دن کی مناسبت سے یہودی طلبہ کی جانب سے منعقد کیے گئے سیمینار کے بڑے بڑے سینر اور پوسٹر لگے نظر آئے۔ میرا جی چاہا کہ میں ہال میں زبردستی گھس جاؤں اور اسٹیج پر چڑھ کر زور زور سے چلا کر پوچھوں کہ ”یہ جو تم سب آج یہاں مگر چھ کے آنسو بہانے کے لیے جمع ہوئے ہو، مجھے صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دو کہ جس روز وہ جہاز عمارت سے نکلے تھے، تو پچاس ہزار ملازمین کے جھوم میں سے ساڑھے پانچ ہزار یہودی ہی کیوں کم تھے؟ اس روز اچانک وہ سب کہاں جا چھپے تھے؟“ مسلم ہاسٹل کی گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے بہت سے سفید اور سبز ہلالی نشان والے غبارے اور نکلین جھنڈیاں راہ داری میں لٹکتی نظر آئیں۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ مسلمان طلبہ نے اس دیار غیر میں، گھر سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی ملک کی یاد تازہ رکھنے کے لیے بہت محنت کی تھی، لیکن ان کی یہ عید نیویارک پولیس نے برباد کر دی۔ جو گھر سے دور ہوتے ہیں، صرف وہی جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر تہوار کتنے اہم ہوتے ہیں اور کتنا اداس کر جاتے ہیں۔ مجھے اس روز عید کی اصل اہمیت کا احساس ہو رہا تھا، ورنہ آج سے پہلے تو میں اور بسام بھی سوکر ہی یہ دن گزارتے تھے۔ جب تک والدین زندہ تھے، تو مئی بہت اہتمام کرتی تھیں عید کا۔ سوپاں بھی بنتی تھیں اور انکل فرینکی اور ماموں تو ویسے ہی ہمارے گھر کے شیر خوارے کے شیدائی تھے۔ عید کے روز مئی ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے اور بسام کو گرتا شلوار پہنا کر ڈیڈ کے ساتھ علاقے کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے بھیجا کرتیں اور میں اور بسام ایک دوسرے کو شلوار قمیص میں دیکھ دیکھ کر خوب ہنستے۔ مئی اور ڈیڈ کے جانے کے بعد اب تو ہر ”عید“ سراب ہو گئی تھی۔

کچھ ایسا ہی منظر مسلم طلبہ کے ہاسٹل کا بھی تھا۔ ان کی عید بھی خواب ہو چکی تھی۔ وہ سبھی سردی میں، ہاسٹل کے فوارے کے گرد بیٹھے جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ جونیئر طلبہ، جن کی گھر سے باہر یہ پہلی عید تھی، زیادہ پریشان اور اداس تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے ایک جونیئر اسٹوڈنٹ کے سینے پر ہلکا سا گھونسا مارا۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے چھوٹے! بھلا عید ایسے مناتے ہیں؟“ میرے بٹاش لہجے نے ان کی کچھ ہمت بندھائی۔ میں نے جان بوجھ کر خود کو ان کے سامنے ہلکا پھلکا پیش کیا تھا۔ میں بھی اپنا کتنا ہوا اندر ان کے سامنے رکھ دیتا، تو وہ بالکل ہی ڈھے جاتے۔ کبھی کبھی شدید پریشانی میں کسی کی ایک مسکان بھی، اندھیرے میں روشنی کی کرن بن جاتی ہے۔ سوڈانی بلال نے غصے سے کہا ”یونیورسٹی میں بہت دن سے ایک پمفلٹ گردش کر رہا تھا کہ ٹائن ایون کے سانحے کے دن عید منانے کا مزہ ہم مسلمانوں کو چکھا کر رہیں گے۔“ اس کی بات سن کر باقی سب طلبہ بھی جوش میں آ گئے۔ ”تو ہم کیا اپنی مرضی سے آج عید منا رہے ہیں، یہ تو چاند کا معاملہ ہے۔ آدھے امریکا میں کل عید منائی گئی۔ ہم باقی مسلم ممالک کے ساتھ منانا چاہتے ہیں، تو اس میں ایسا کیا گناہ کر ڈالا ہم نے۔“ لڑکوں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ چلو آئیے، ہم ابھی چل کر ان کا سیسینا خراب کرتے ہیں۔ ہم عید نہیں منا سکتے تو انہیں بھی ٹائن ایون نہیں منانے دیں گے۔ چلو، سب تیار کی کرلو۔“ سب لڑکے بھڑک کر کھڑے ہو گئے۔ ”ہاں بالکل ٹھیک ہے، اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، ہم آڈیٹوریم کی۔“ سب ہی جوش میں آ گئے بڑھے۔ ”رک جاؤ، پہلے میری بات سن لو۔“ لیکن وہ سب پھرے ہوئے تھے۔ ”نہیں آئیے، آج نہیں، آج ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔“ ”شیخ الکریم کی بھی نہیں.....؟“ میری زبان سے شیخ الکریم کا نام سن کر وہ سب رُک گئے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”تم سب لوگ شیخ الکریم کے لیکچر تو بڑے ذوق و شوق سے سننے جاتے ہو، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ مسجد سے نکلتے ہی سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ کل تک میں بھی تم جیسا تھا، جذباتی، پل میں بھڑک جانے والا، لیکن میں نے شیخ الکریم ہی سے یہ سیکھا کہ ہماری اسی جلد بازی اور جذباتی پن سے دوسرے فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔ وہ ہمیں بھڑکا کر مشتعل کرتے ہیں اور ہم ان کا باقی کام خود آسان کر دیتے ہیں۔ عامر بن حبیب اور بابر سیدی کو اس وقت ہماری مدد کی ضرورت ہے، لیکن ہم تو ڈھچھوڑ کر کے انہیں مزید مشکل میں ڈال دیں گے۔ ملزم کو مجرم بنانے میں اپنے دشمن کی مدد نہ کرو۔ میری بات مان لو۔“ احمر نے بے بسی سے سر پٹکا۔ ”تو ہم کیا کریں۔ یونہی چپ چاپ سب دیکھتے رہیں؟“ میں نے اس کی جھکی ہوئی ٹھوڑی اپنے ہاتھ سے اوپر کی ”نہیں، ہم



ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھیں گے۔ ہم انہیں جواب دیں گے، لیکن اپنے انداز سے۔ آج گیارہ ستمبر ہے۔ وہی دن، جس دن فلوریڈا کے پادری، میری جونز نے اُس گستاخی کا اعلان کیا تھا۔ آج ہم سب وہیں جائیں گے، جہاں میری جونز نے آنے کا اعلان کیا تھا۔ ہمارا جواب انہیں وہیں ملے گا۔“

پورے گروپ نے حیرت سے میری طرف دیکھا، لیکن چپ رہے۔ میں نے اسی وقت ڈین کے نام ایک درخواست لکھی اور بلال سے کہا کہ وہ جا کر کانفرنس ہال میں ڈین سے اس پر دستخط لے کر گراؤنڈ زیر و پینچے۔ تب تک ہم وہاں اس کا انتظار کریں گے۔ ہمارے گراؤنڈ زیر و پینچے کے آدھے گھنٹے بعد بلال بھی ڈین کا دستخط شدہ کاغذ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہاں آج ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کے گرنے سے ہلاک ہونے والوں کے پیاروں کا رش تھا۔ لوگ یادگار کی جگہ پر پھول اور گلہ سے نچھاور کر رہے تھے اور شمعیں روشن کر رہے تھے۔ میں نے حافظ کلیل کو اشارہ کیا اور اس نے دو سیڑھیاں چڑھ کر اپنی جگہ سنبھال لی۔ کلیل نے میری جانب دیکھا۔ ہم سب اس کے سامنے نیم دائرے میں جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سر ہلا کر اسے اجازت دے دی اور اس نے اپنی خوب صورت آواز میں تلاوت شروع کر دی۔ لوگوں نے چونک کر حافظ کو دیکھا۔ کلیل نے جب تک سورۃ اخلاص کی تلاوت ختم کی، لوگ پوری طرح ہماری جانب متوجہ ہو چکے تھے اور وہاں موجود میڈیا کا ہر کیمرہ ہماری فلم بنا رہا تھا۔ کلیل کی تلاوت ختم ہوئی، تو میں اس کی جگہ اوپر چڑھ آیا۔ ”میں آیان احمد سینٹرل امریکن یونیورسٹی کا مسلم کاؤنسلر آپ سے مخاطب ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج ہماری عید ہے، لہذا آج ہم سب نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنا یہ تہوار یہاں گراؤنڈ زیر و پرائنٹ ایون کے لواحقین کے ساتھ شمعیں روشن کر کے بتائیں گے۔ آج یہاں میری جونز تو نہ آیا، لیکن ہم نیویارک کے شہریوں کو یہ بتانے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ ہم نفرتوں کو پھیلانے نہیں، ختم کرنے آئے ہیں۔ کل رات ہمارے ایک پیارے ساتھی بابر سیدی کو پولیس نے دہشت گردی کے شبے میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہم پہلی شمع یہاں بابر سیدی کی جانب سے بھی روشن کریں گے۔ امید ہے، آپ سب ہمارے اس پیغام محبت کو میری جونز اور اس جیسے ہر نفرت کرنے والے تک پھیلائیں گے۔“ میں نے پہلی شمع اٹھائی اور کیمرے کی جانب دیکھ کر کہا ”بابر..... یہ پہلی تمہاری جانب سے..... اور بسام..... یہ دوسری تمہاری طرف سے.....“ سب مسلم طلبہ اپنے ساتھ لائی ہوئی شمعیں ایک ایک کر کے جلاتے گئے اور میں نے بلال کو جو گلہ سے لانے کا کہا تھا، وہ ہم نے دیگر پھولوں کے انبار کے ساتھ رکھ دیے۔ تمام حاضرین نے زوردار تالیاں بجا کر مسلم طلبہ کے اس اقدام کو سراہا۔ میں نے بلال کو ڈین کے نام یہی درخواست لکھ کر بھیجی تھی کہ ہم سب مسلم گروپ والے گراؤنڈ زیر و پراپر جا کر دعا کرنا چاہتے ہیں، لہذا ہمیں اجازت دی جائے اور میری توقع کے مطابق اس نے اجازت دینے میں ذرا بھی تاثر نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ آج نیویارک کا تمام میڈیا یہاں گراؤنڈ زیر و پراپر جمع ہوگا اور اپنا پیغام دینے کا اس سے بہتر موقع ہمیں پھر شاید کبھی نہ ملے۔ عام امریکی شہریوں اور نیویارک کے باسیوں کے لیے یہ ایک نیا منظر تھا کہ آج تک وہ جس قوم پر نائن ایون کے سانحے کا الزام لگاتے آئے، آج اسی قوم کی نوجوان نسل ان کے ساتھ مل کر مرنے والوں کے لیے دعا کر رہی تھی۔ دعا ختم ہوئی، تو وہاں موجود سب ہی لوگوں نے فردا فردا مسلم طلبہ کے ساتھ ہاتھ ملایا اور سہ پہر تین بجے جب ہم واپس یونیورسٹی پہنچے تو تمام میڈیا ہر پانچ منٹ بعد یہی خبر نشر کر رہا تھا۔ ہمارا پہلا پیغام نیویارک کے باسیوں تک پہنچ چکا تھا اور اس کے اثرات ہمیں یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی نظر آنے لگے تھے۔ ڈین نے ہمیں دیکھ کر اپنی گاڑی رکوائی اور چل کر ہماری جانب آیا۔ ”ویل ڈن آیان..... میں نے ٹی وی پر تمہارا پیغام سنا..... تم نے مسلم کاؤنسلر شپ کا فرض خوب نبھایا۔ کیپ اٹ اپ۔“ مسلم طلبہ ڈین کی مبارک باد اور اس کا نرم لہجہ سن کر حیران سے تھے، لیکن مجھے اس دن محسوس ہوا کہ ڈین رابن سن ایک اصول پرست، منطقی اور دلیل کا انسان ہے۔ مجھے شیخ الکریم کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ ان گوروں کو ان کی نفسیات کے مطابق برتنا ہی اصل مسئلہ ہے۔ یہ لوگ کڑوی سے کڑوی بات بھی برداشت کر جاتے ہیں، اگر بات اس زبان اور طریقے سے کی جائے، جو ان کی سمجھ میں آتا ہو۔ آج گراؤنڈ زیر و پراپر ہم نے اپنا پیغام ان کی زبان میں دیا تھا، لہذا سب کو سمجھ میں آ گیا تھا۔ شام کو ہم سب بابر سیدی سے ملنے اور اسے عید کے پھول اور کارڈز دینے کے لیے ہاسٹل سے باہر نکلے، تو سامنے سے ابھی ابھی اور خود سے روٹھی سی پُر واپلی آرہی تھی۔ اس نے آتے ہی ہمیں زور و شور سے مبارک باد دی۔ ”میں نے ٹی وی پر تم سب کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ آیان..... تمہیں بہت مبارک ہو۔ تم نہیں جانتے کہ اس کے اثرات کہاں تک جائیں گے۔“ احمر نے پُر واپسے شکایت کی ”وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن تم دو دن سے کہاں غائب ہو۔ گروپ کی تمام مسلم لڑکیاں تمہارے بارے میں پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہیں۔ انہیں حوصلہ دینے والا بھی تو یہاں کوئی ہونا چاہیے ناں۔“ پُر واپس کی نظر جھک گئی۔ ”بس، کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی میری، لیکن تم لوگ فکر نہ کرو۔ اب میں آگئی ہوں، پُر واپس خیر خان از بیک۔“ ہم سب مسکرا دیے۔ بابر سیدی بھی اسی لاک اپ میں تھا، جہاں بسام کو رکھا گیا تھا، البتہ ان دونوں کے ہرک علیحدہ تھے۔ ہم پہلے بابر کے پاس پہنچے، تو اسے پہلے ہی ملاقاتیوں والے لمبے بال میں لایا جا چکا تھا۔ بابر ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ تمہارے گراؤنڈ زیر و پراپر کا رٹا مے کے چرچے پہنچ چکے ہیں، مجھ تک آیان..... لگتا ہے، عامر بن حبیب کی روح اب تم میں حلول کر گئی ہے۔ اتنا صبر کہاں سے آ گیا تمہارے اندر.....؟“ ”پتا نہیں، میں خود نہیں جانتا، لیکن شاید یہ جنگ ہی صبر اور برداشت کی ہے۔“ بابر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ نیویارک پولیس نے ٹھیک رات بارہ بجے اسے اس کے کمرے سے گرفتار کیا تھا۔ اس پر چند دن پہلے یہودی طلبہ کے سامنے نائن ایون کے دن کے لیے دی جانے والی دھمکی کا الزام لگایا گیا تھا، جس میں اس نے کہا تھا کہ اگر میری جونز یا کسی نے بھی نائن ایون کے سانحے کو بہانہ بنا کر اس روز مسلمانوں کے ساتھ کوئی بھی زیادتی کی تو اس کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔ پولیس کے مطابق انہوں نے بابر سیدی کے کمرے سے کچھ متنازع لٹریچر وغیرہ بھی برآمد کیا تھا، جو بابر سیدی کے ارادوں کو ظاہر کرتا تھا۔ میں نے بابر سے لٹریچر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بے زاری سے کہا ”کچھ نہیں یار، ایسے پمفلٹ، پوسٹر اور کتابیں تو انہیں ہر فلسطینی کے کمرے سے نائن ایون سے پہلے بھی مل سکتی تھیں۔ ہماری پوری نسل دل میں یہودی قبضے کے خلاف نفرت لے کر پلی ہے اور یہ کوئی دھمکی چھپی بات بھی نہیں۔ اس کا نائن ایون سے کوئی تعلق نہیں اور آج اگر یہی نیویارک پولیس شمعوں اور مائیکل وغیرہ کے کمرے پر چھاپہ مارے تو انہیں اس سے کہیں زیادہ فلسطین مخالف مواد وہاں سے ملے گا، لیکن ہم کم زور ہیں، اس لیے ہر چندا ہماری گردن کے گرد گس دیا جاتا ہے۔ سو، یہ الزام بھی میرے ہی سر سہی۔“ میں نے بابر کا ہاتھ زور سے جکڑ لیا ”ہم کم زور تھے، لیکن ہمیشہ نہیں رہیں گے میرے دوست، چاہے ہزار الزام مزید لگ جائیں۔ بس، تم ہمت نہ ہارنا۔“ بابر ہنس پڑا ”یہ ہوئی نا مسلم کاؤنسلر والی بات۔“ میں انہیں بابر کے پاس چھوڑ کر بسام سے کچھ دیر ملنے جانے کے لیے اٹھا تو احمر اور پُر واپس بھی میرے ساتھ چلے آئے۔ بسام کچھ نڈھال سالگ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے گلے لگا کر خوب زور زور سے جھنجھوڑا، میں گھر میں ایسا تب کرتا تھا، جب وہ کبھی ست پڑ جاتا تھا۔ آخر وہ ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈال کر ہنس پڑا۔ ”بس کرو یار! ہڈیاں توڑو گے کیا.....؟“ میں نے پُر واپس اور احمر کا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے دونوں سے ملا اور پُر واپس کو دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں مجھ سے بولا ”اچھا! تو یہ پُر واپس بھی خوب ہے۔“ میں نے بسام کو گھورا، پُر واپس پڑی ”تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا میرا۔ سو، آیان کے ساتھ چلی آئی۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟“ ”بسام مسکرایا“ نہیں، مجھے خوشی ہوئی، البتہ اس گدھے کے ساتھ اتنی اچھی لڑکی مجھ سے ملنے آئی ہے۔ اس بات کی حیرت ضرور ہے مجھے۔“ جینی کے بعد تم دنیا



کی دوسری لڑکی ہو، جس نے اسے شرف دوستی بخشا ہے اور مجھے تم دونوں لڑکیوں کی عقل پر کافی شبہ ہے۔“ اسنے میں عارفین ماموں بھی ہاتھ میں مٹائی کا ڈبا لیے وہاں پہنچ گئے ”عید مبارک.....“ اور پھر کچھ ہی دیر میں سارا ہال میرے گروپ کے لڑکوں سے بھر گیا۔ بسام نے حیرت سے سب کو دیکھا۔ حافظ کلیل نے سوئوں کاٹن بسام کے ہاتھ میں تھمایا۔ ”ہم سب تمہیں عید کی مبارک باد دینے آئے ہیں بسام..... بابر کو اجازت نہیں ملی، ورنہ وہ بھی اپنی ہیرک سے کچھ دیر کے لیے یہاں آنا چاہتا تھا۔“ سب فردا فردا بسام سے گلے ملتے رہے اور بسام کی پلکیں نم ہوتی گئیں۔ میں جانتا تھا، اسے بھی آج میری طرح ممی اور ڈیڈ یاد آ رہے ہوں گے۔ کاش! دنیا میں ہر چیز کو موت آتی، بس ماں باپ سدا زندہ رہتے، تو کتنا اچھا ہوتا.....

ہم لاک اپ سے باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی اور نیویارک کی رات چاگنے والی تھی۔ میں پورے گروپ سے اگلے روز کی ملاقات کا وعدہ کر کے سڑک کی دوسری جانب بڑھنے لگا، تو پروانے آواز دے کر روک لیا ”آیاں..... دو منٹ میری بات سنتے جاؤ.....“ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ باقی جھوم سے علیحدہ ہو کر میری جانب چلی آئی۔ ہم سب کچھ دیر پہلے یونیورسٹی کی بس سے وال اسٹریٹ کے گر جا گھر کے قریب اترے تھے، جہاں سے ہم سب کو علیحدہ سمتوں میں جانا تھا۔ گر جا گھر کے اندر روشنیاں جل چکی تھی اور اندر شاید کسی شادی کی تقریب چل رہی تھی۔ پُر دا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میری جانب چلی آئی۔ ”میں تم سے اپنے اس روز کے جذباتی پن کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میں نے زندگی میں پہلے کبھی اس طرح اپنے جذبات پر اختیار نہیں کھویا، لیکن ہر چیز کا پہلا دن ہوتا ہے۔ میں تمام عمر جس جذبے کو محض حماقت سمجھتی رہی، جب مجھ پر طاری ہونے لگا، تو شاید میں بری طرح بوکھلا گئی۔ مجھے خود بھی اپنے اندر ہونے والی اس تبدیلی کا بہت دیر سے پتا چلتا، لیکن جب میں نے تمہاری شمعوں گروپ کے ساتھ ہوئی ڈیل کا سنا تو پل بھر میں ہی میرے اندر چھپا یہ احساس ایک دم ہی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا اور مجھ سے ایک لمحے میں ہزار بار یہ سوال پوچھ پوچھ کر مجھے نشتر چھبوتا رہا کہ وہ پُر دا ضمیر خان، جو خود کو ایسے ہر جذباتی احساس سے بالاتر سمجھتی تھی، اسے پسند آنے والا شخص بھلا غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن تب تک شاید میں یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کا اپنا ہی غلط اور صحیح ہوتا ہے۔ محبت دنیا کا قانون بھلا کب مانتی ہے کہ اس کے تو اپنے قاعدے ہوتے ہیں۔ وہ دن میں نے بہت اذیت میں گزارے ہیں آیاں اور اسی اذیت میں، میں نے تمہیں وہ سب بتا دیا، جو شاید کسی جذبے کی حرمت کو باقی رکھنے کے لیے پوشیدہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔“ میں چپ چاپ پُر دا کی بات سنتا رہا، کیوں کہ مجھے احساس تھا کہ اس وقت اسے تو کتنا مناسب نہیں تھا۔ وہ میلوں دور کا سفر طے کر کے آئی ہوئی ایک شہزادی تھی، جس کے لہجے میں نئے دیس کا خوف اور سفر کی تحکین نمایاں تھی۔ میں نے اسے تسلی دی ”اگر تم میرے بارے میں تھوڑا سا بھی جانتی ہو، تو اتنا یقین رکھو کہ تم نے وہ سب کچھ کہہ کر اپنی حرمت کھوئی نہیں، اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے ہر احساسِ ندامت کو اپنے دل سے مٹا کر ہمیشہ سراٹھا کر چلو۔ محبت کو تو ہمارے اندر فخر، غرور کا احساس بھرنا چاہیے، نہ کہ کسی ندامت و شرمندگی کا۔“ پُر دا نے پلکیں اٹھائیں۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو آیاں! اور بالکل یہی میرے اندر کی آواز بھی تھی، بس یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں تم مجھے غلط نہ سمجھ لو۔ آج یہ الجھن بھی دور ہوئی۔ اب میں اپنی محبت کے ساتھ فخر سے جی سکوں گی اور تم مطمئن رہنا، یہ محبت کبھی تمہارے راستے کی دیوار یا پھروں کی زنجیر نہیں بنے گی، کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ تم نے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔ ایک پورا کارواں ہے، جسے لے کر تمہیں چلنا ہے اور شاید میں بھی کہیں دور اسی کارواں کی آخری مسافر ہوں۔ اس سفر میں، میں تمہارا ساتھ دوں گی آیاں..... لیکن ایک درخواست ہے کہ میری محبت کی وجہ سے خود پر کبھی کوئی پابندی لگانا، نہ مجھے کوئی خصوصی رعایت دینا۔ یہ تو بس میرا اور میرے دل کا آپس کا معاملہ ہے۔“ میں محویت سے اس صاف گو اور بہادر لڑکی کو دیکھتا رہا، جو اس دور میں بھی سچ بولنے کا حوصلہ رکھتی تھی، جب جھوٹ اور منافقت نے چار سو ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں نے اس بار اسی کے انداز میں خود ہاتھ آگے بڑھایا ”ٹھیک ہے، تو پھر طے رہا کہ دوستی رہے گی اور آخری سانس تک رہے گی۔ کیوں، مس پُر دا ضمیر خان.....؟“ پُر دا نے میرے انداز پر چونک کر سر اٹھایا اور پھر میری زوردار آواز اور بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر زور سے ہنس پڑی اور اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولی ”بالکل ٹھیک مسٹر آیاں احمد۔“ دُور وال اسٹریٹ کے چرچ کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اگلے روز ایک ہی کورٹ کے احاطے میں دو مختلف ججوں کے سامنے پہلے بسام اور پھر بابر سیدی کی پیشی تھی۔ آسٹن پوری تیاری کے ساتھ عدالت آیا تھا اور اس نے آتے ہی سرکاری وکیل کو آڑے ہاتھوں لیا کہ صرف ناٹم اسکوائر کے دھماکے کی بنیاد پر کیا، وہ نیویارک کے ہر مسلمان طالب علم کو نیویارک پولیس کے ہاتھوں قید کروانا چاہتا ہے؟ اگر بسام نے کوئی جرم کیا ہے، تو اسے عدالت کے سامنے ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے، ورنہ بسام سمیت اس کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے سبھی بے گناہ طالب علموں کو رہا کیا جائے۔“ جج نے غور سے آسٹن کی تمام بات سنی اور پولیس حکام کو حکم دیا کہ اگر وہ اگلی پیشی پر مکمل ثبوت کے ساتھ حاضر نہ ہوئے، تو سب کو رہا کر دیا جائے گا۔ آسٹن کی کوشش کے باوجود ہمیں اگلی پیشی کی تاریخ پانچ دن بعد کی ملی۔ میں نے بے چارگی سے بسام کی طرف دیکھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے اطمینان رکھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے نکل کر ہم بھاگ بھاگ بابر سیدی کی پیشی والے کورٹ میں پہنچے۔ کارروائی شروع ہو چکی تھی اور حکومت کا وکیل بابر سیدی کے کمرے سے ملے کاغذ لہرا کر اسے خطرناک دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بابر سیدی کے لیے مسلم طلبہ نے چندہ اکٹھا کر کے وکیل کیا تھا اور اس چندے کی آدھی سے زیادہ رقم عامر بن حبیب نے اپنے اکاؤنٹ سے ادا کی تھی۔ بابر کا وکیل اچھے انداز میں بابر کا دفاع کر رہا تھا، لیکن بابر نے خود ایک ایسا جملہ کہہ دیا، جو اس روز کے بعد ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ جس وقت بابر کا مخالف وکیل بابر کے کمرے سے ملنے والے پمفلٹ اور پوسٹر لہرا کر بھری عدالت میں چنچ رہا تھا کہ ”جناب والا! یہ دیکھیں، اس لڑکے کے کمرے سے یہود کے خلاف کیسے کیسے خطرناک پوسٹرز اور لٹریچر لٹکا رہے۔“ تو بابر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا ”تم جسے الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو، وہ ہماری تاریخ ہے۔ جن قوموں کے آبائی وطن قبضہ کر کے ہتھیالے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ سدا ایسے ہی پوسٹرز اور پمفلٹس سے بھری رہتی ہے۔ اب میں اپنی تاریخ کو کیسے بدلوں۔ تم لوگ میرا وطن آزاد کروادو، میرے کمرے سے بھی محبت نامے ملا کریں گے۔“ چند لمحوں کے لیے کورٹ میں سناٹا چھا گیا، پھر جج نے بابر کو سرزنش کی کہ جب اس کا وکیل عدالت میں موجود ہے تو اسے بولنے کی ضرورت نہیں۔ بابر کو بھی اگلی پیشی تک پابند سلاسل رکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس دن عدالت سے نکلنے وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک جہد مسلسل کا شکار ہیں۔ مسلمان کے لیے تو یہ جہاں بڑی مشکل جگہ ہے۔ چاروں طرف ”لٹیروں کے پہرے“ ہیں اور مسلمان یرغمال اور پھر دو دن بعد..... اس پاکستانی ڈاکٹر کی سزا کا فیصلہ بھی سنا دیا گیا۔ امریکا کی تمام ”اعتدال پسند“ تنظیموں اور ”انصاف پسند“ جماعتوں کی امید کے برعکس، اسے ”صرف“ چھبیس سال کی قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ نیویارک میں اس سزا پر مختلف قسم کا ملا جلا رد عمل دکھائی دے رہا تھا، لیکن مسلم طلبہ اس فیصلے سے بے حد مایوس تھے۔ فرہاد نے چلا کر کہا ”یہ تو اذیت در اذیت والی بات ہے۔ اس انصاف سے تو بہتر تھا کہ وہ اس مجبور عورت کو ایک ہی بار زہر کا انجکشن دے کر مار ڈالتے.....“ کیفے کی دوسری میز پر احمر کے ساتھ بلال بیٹھا تھا۔ اس نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا ”وہ اسے ہم سب کے لیے عبرت کا نشان بنانے کی بات کرتے ہیں اور عبرت کا نشان بنانے کے لیے ایک ہی بار نہیں مارا جاتا۔ روز روز کی موت دی جاتی ہے۔ بار بار زندہ کر کے مارا جاتا ہے۔“ جم اور ایریک بھی خاموشی سے بیٹھے تھے۔ پہلی بار ایریک کے پاس امریکا اور نیویارک کی حمایت میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ فرہاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے مسلم گروپ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ ”ہاں آیاں..... اب میں تم سب کے ساتھ مل کر یہ احتجاج کروں گا۔ اگر مذہب ہی اس دور میں وجہ شناخت ہے، تو یوں ہی سہی..... اور مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے۔“ یونیورسٹی کی فضا عدالت کے اس فیصلے سے کافی کشیدہ ہو گئی تھی۔ آج شام شیخ اکرم کا آخری لیکچر تھا۔ ہم سب چائنا ٹاؤن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے احمر اور بلال کو باقی تمام طلبہ کو بس میں سوار کرا کے وہاں پہنچنے کا کہا اور خود آج ہی گیراج سے واپس آئی اپنی بایک پر یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلا، تو چائنا ٹاؤن کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے چوراہا کر اس کرتے ہی میری بایک کے پیچھے ایک سادہ کیڈلک کار لگ گئی۔ میں کچھ دیر تک سائینڈ کے شیشے میں اسے اپنی بایک کے ہمپر سے تقریباً چھوٹے کی حد تک قریب دوڑتا دیکھتا رہا۔ پھر کار کی چھت پر کسی نے ہاتھ نکال کر نیلی بتی رکھ دی اور ہوٹل بجنے لگا۔ میں نے بایک سڑک کے کنارے روک دی۔ کار بھی رک گئی اور اس میں سے دو افراد اتر کر میری جانب چلے آئے۔ پہلے نے مجھے غور سے دیکھا ”تمہارا نام ہی آیاں ہے.....؟“، ”ہاں، میں ہی آیاں ہوں.....“ اس شخص نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دکھایا ”میں سی آئی اے سے ہوں..... آفیسر فورڈ۔ ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے.....“ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھے گھیرے میں لے چکے ہیں..... (جاری ہے)

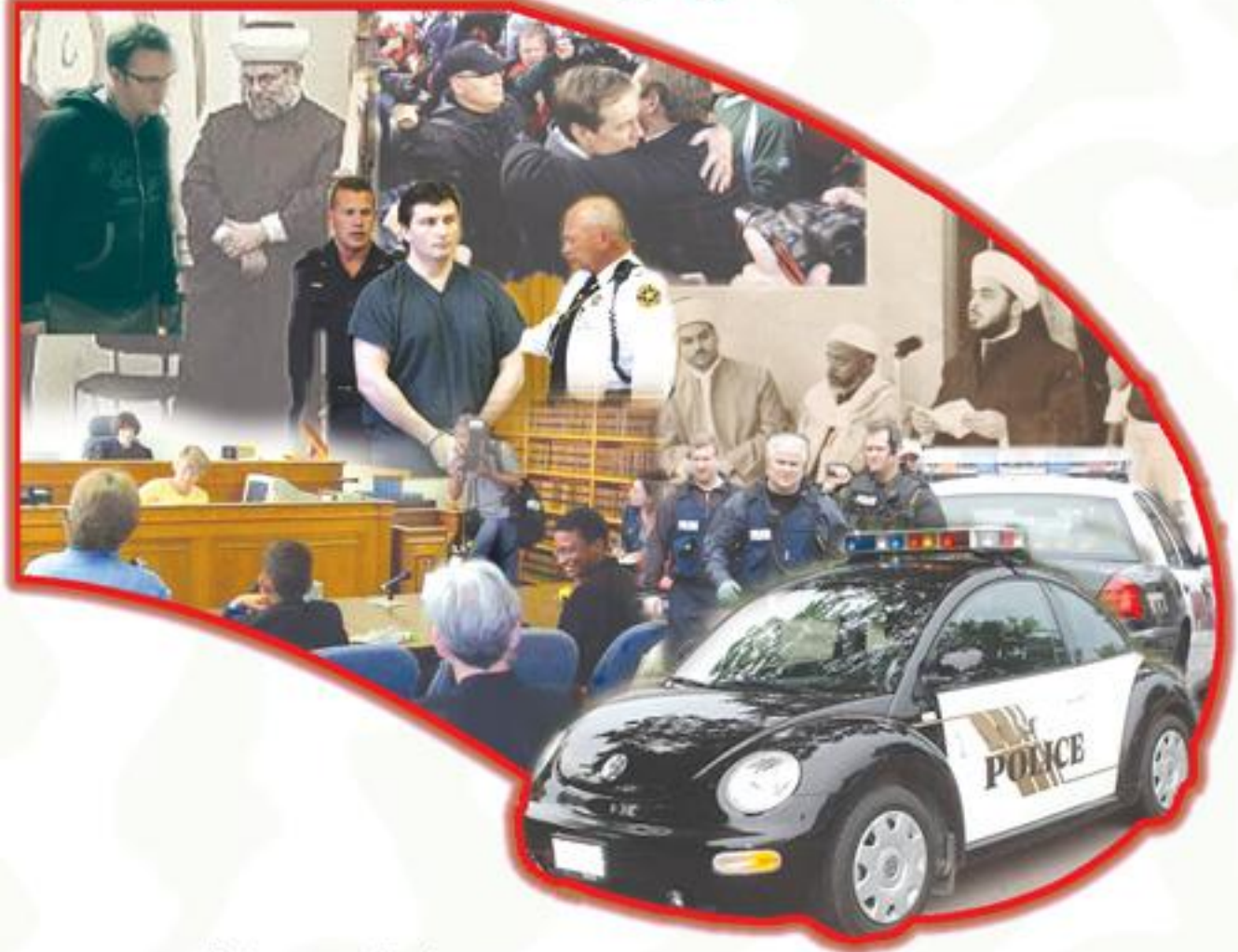




ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور نائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و قدرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



میں نے آفس فورڈ کے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو غور سے دیکھا۔ فورڈ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور واکس وگن آکر کھڑی ہو گئی تھی، جس میں سے دو افراد نکل کر غیر محسوس طریقے سے کچھ فاصلے پر میرے دائیں بائیں کھڑے ہو چکے تھے۔ میں نے فورڈ سے پوچھا۔ ”کیا مجھے گرفتار کیا جا رہا ہے.....؟“ فورڈ مسکرایا۔ ”کافی حقیقت پسند لگتے ہو۔ نہیں، ہم تمہیں گرفتار نہیں کر رہے۔ بس، تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں، تم شاید چائنا ٹاؤن کی طرف جا رہے ہو؟ میرا آدمی تمہاری بایک لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ تم ہماری وین میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں مسجد تک ڈراپ بھی کر دیں گے اور راستے میں بات بھی ہو جائے گی۔ اس طرح تمہارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔“ ان کی معلومات سے لگتا تھا کہ وہ بہت دن سے میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں نے بایک کی چابی فورڈ کے حوالے کر دی، جسے اس نے میرے جانب کھڑے شخص کی جانب اچھال دیا اور ہم وین میں جا کر بیٹھ گئے، جس کے شیشے گہرے سیاہ تھے۔ وین چل پڑی۔ فورڈ کے علاوہ پچھلے حصے میں دو اشخاص بھی موجود تھے۔ ڈرائیور والے حصے کو مونے شیشے کی پارٹیشن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ فورڈ نے وین کے چھوٹے سے ریفریجریٹر سے کوئی مشروب نکال کر ٹن کھولا اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے مشروب لینے سے انکار کر دیا۔ ”تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟“ فورڈ نے لمبی سی ہاں کی ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس، تم جیسے ایک ماڈریٹ مسلمان لڑکے کو یوں اچانک ان مسجدوں کے چکر لگاتے دیکھ کر کچھ حیرت ہو رہی ہے۔ دیے تم نے اپنے بھائی کے لیے بالکل ٹھیک وکیل چنا ہے۔ آسٹن اسے اگلی پیشی میں ضرور رہا کر دالے گا۔“ میں نے چونک کر فورڈ کو دیکھا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ امریکن سی آئی اے میں تم جیسے قابل اور ہوشیار افسر موجود ہیں، لیکن اس بات کا افسوس بھی ہے کہ سی آئی اے اپنی تمام صلاحیتیں مجھ جیسے ایک امریکن شہری کی نگرانی پر صرف کر رہی ہے۔ جب ہی تو ایک عام سیدھا سادہ طالب علم بھی ٹائم اسکوائر پر بم نصب کر کے آرام سے چلتا بنا۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ توجہ ادھر بھی ہونی چاہیے۔“ فورڈ نے میرا طنز بہت آرام سے برداشت کیا۔ ”کافی بدتمیز ہو، لیکن نڈر ہو۔ ہم مسلمانوں کی اسی خصوصیت سے خائف رہتے ہیں۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ اچانک تم پر اسلام کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے؟ مسلم کاؤنسلر بننے سے پہلے تو تم ان مسلمان لڑکوں کے قریب پھٹکتے بھی نہیں تھے۔“ اب یقین ہو گیا تھا کہ آج مجھے یوں سر راہ روکنے سے پہلے ان سی آئی اے والوں نے ہفتوں میرے متعلق معلومات اکٹھی کر کے ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا۔ میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا۔ ”اسلام میرا مذہب ہے اور مسجد ہماری عبادت گاہ۔ اس میں ایسی حیرانی کی کیا بات ہے۔ کیا تم اپنے گرجا گھر نہیں جاتے؟“ فورڈ نے مشروب کی چمکی لی۔ ”پچھلے کمرس پر گیا تھا۔ اب اس کمرس پر دوبارہ جانے کا ارادہ ہے۔ خدا کو یاد رکھنے کے لیے عبادت گاہ کے چکر لگانا ضروری تو نہیں.....؟“ میں نے سر ہلایا۔ ”اوہ..... میں اب سمجھا کہ تم بھی ایک ”ماڈریٹ“ عیسائی ہو اور تمہاری نظر میں سال میں ایک مرتبہ عبادت گاہ جانا ہی ماڈریٹ ہونے کی نشانی ہے۔“ فورڈ نے بات بدل دی۔ ”چلو مان لیا کہ یہ تمہارا ذاتی فعل ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس فلسطینی لڑکے کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے، جس کے لیے تم نے گراؤنڈ زیرو پر مشعل جلائی تھی۔ تم خود کو امریکن شہری بھی مانتے ہو اور امریکا دشمن لوگوں کے لیے دل میں ہمدردی بھی رکھتے ہو۔ یہ تو بڑا دوغلا معیار ہوا۔“ ”بار سیدی میرے گروپ کا متحرک کارکن، طالب علم اور ایک سچا دوست ہے۔ مجھے اس کی امریکا دشمنی کے بارے میں کبھی کوئی اشارہ تک نہیں ملا۔ ہاں، اس کی پوری نسل کا یہودیوں سے جھگڑا ضرور ہے اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ کیا یہودی دشمن، امریکا دشمن بھی ہوتا ہے؟“ فورڈ نے میرا جواب سن کر پہلی مرتبہ بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”ہاں اگر یہودی، امریکن شہری بھی ہو..... تب.....“ وین تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی، لیکن مجھے راستوں کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ فورڈ نے بات جاری رکھی۔ ”اچھا یہ بتاؤ اسامہ بن لادن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے برجستہ کہا ”کبھی ملاقات نہیں ہوئی“ فورڈ زور سے ہنسا۔ ”اچھا القاعدہ کے بارے میں تو ضرور جانتے ہو گے۔ تمہارے اندازے کے مطابق وہ لوگ کہاں کہاں تک جاسکتے ہیں؟“ ”میں تو آج تک یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ یہ القاعدہ آخر ہے کیا بلا۔ کوئی خیالی یا فرضی تنظیم یا ایک حقیقت یا پھر خود کو مصروف رکھنے کا ایک بہانہ ہے، کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ جب کسی قوم کے تمام دشمن ختم ہو جائیں یا کم زور پڑ جائیں تو پھر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتی ہے..... ایسے میں اسے یکجا رکھنے کے لیے کوئی فرضی دشمن تراشا پڑتا ہے، شاید القاعدہ کوئی ایسی ہی ایک تنظیم ہے؟“ وین رک گئی۔ میں اور فورڈ گاڑی سے نیچے اتر آئے، جبکہ باقی دو افراد اسی طرح لالتلق سے اندر بیٹھے رہے، جیسے انہیں اس تمام



معاملے سے کوئی سروکار ہی نہ ہو، لیکن پتا نہیں، مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ میری اور فورڈ کی باتیں ریکارڈ کر رہے تھے۔ ہم چائنا ٹاؤن کی مسجد کی پرلی سڑک پر کھڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر میری بایک کھڑی تھی اور اس کے انکسٹن میں چابی جھول رہی تھی۔ فورڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”مجھے ایک بات نے متاثر ضرور کیا ہے کہ تم نے اپنے اندر کی ہر بات بلا جھجک کہہ دی۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم تمہارے بھائی کی گرفتاری سے لے کر اب تک تمہاری نگرانی کرتے آئے ہیں۔ دراصل ہائمنر اسکو اردھما کے کے کیس میں گرفتار کر کے کے بیان کی روشنی میں ہمیں سب ہی پاکستانی نژاد یا پاکستانی طالب علموں پر نظر رکھنے کی ہدایات موصول ہوئی ہیں اور جب تک ہم اس کیس کی آخری کڑی کو بھی گرفتار نہیں کر لیتے، یہ پوچھ گچھ اور تحقیق جاری رہے گی۔ تم دونوں بھائیوں کا اب تک کا ریکارڈ صاف ہے، لیکن تمہاری اس روزگراؤنڈ زیرو پر کی جانے والی دعائے پورے میڈیا کی توجہ تم پر مبذول کروادی ہے۔ میں تمہیں بس اتنا ہی مشورہ دوں گا کہ امریکی شہری ہونے کے ناتے تمہاری وفاداریاں کسی اور سمت کا رخ نہ کریں تو تم سب کے لیے بہتر ہوگا۔“ فورڈ نے مجھ پر الوداعی نظر ڈالی۔ ”شاید! یہ ہماری آخری ملاقات نہ ہو.....“ وین چل پڑی۔

میں جب مسجد پہنچا، تو شیخ الکریم کا آخری لیکچر سننے کے لیے طلبہ کی ایک کثیر تعداد جمع ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں جو سوالات تھے، وہ میں پہلے ہی ایک کاغذ پر لکھ کر لایا تھا، جسے میں نے بلال کے ہاتھ شیخ صاحب تک پہنچا دیا۔ کچھ دیر میں شیخ الکریم نے اپنی جگہ سنبھالی اور مسجد کے صحن میں سنا سنا سا چھا گیا۔ ”آج میں آپ لوگوں سے چند الوداعی کلمات کہنا چاہوں گا۔ گزشتہ تین ہفتوں میں، نیویارک کی پرسکون فضا میں کافی بل چل رہی۔ بد قسمتی سے یہ فضا ہمارے حق میں بہتر نہ تھی، مذہب کسی بھی شکست خوردہ قوم کا لٹنے والا آخری اثاثہ ہوتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے، جب فاتح ہمارے مذہب پر آخری ڈاکہ مارنے کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے ہیں۔ جب دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو تاریخ ہمیشہ فاتح کے ہاتھوں میں لکھی جاتی ہے اور اس تاریخ میں مفتوح کی اچھائیوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نپولین نے کہا تھا کہ ”تاریخ کیا ہے؟“ بس چند تسلیم کردہ اوراق کا پلندہ.....“ لیکن یاد رہے کہ اگر ہم اب بھی نہ سنیں، تو شاید تاریخ کے ان چند تسلیم شدہ صفحات میں، ہمارا ذکر کہیں نہ ملے۔ جنگیں تیاری سے لڑی جاتی ہیں اور خود کو اس تاریخ کی لڑائی کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رکھیں۔ وہ (نعوذ باللہ) برن قرآن ڈے مناتے ہیں، تو آپ لرن قرآن ڈے (Learn Quran-day) منائیں۔ وہ (استغفر اللہ) نبی ﷺ کی تضحیک کا شیوہ اپناتے ہیں، تو آپ اسی پیارے نبی ﷺ کی تعلیمات کی تبلیغ کر کے ان کو جواب دیں۔ یاد رکھیں، میانہ روی ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ ابھی بات شروع کرنے سے پہلے مجھے مسلم کاؤنسلر کا ایک خط ملا، جس میں بڑا دل چسپ سوال پوچھا گیا ہے کہ ”اپنی زندگی کے پہلے سجدے کی حرمت کو آخری سجدے تک کیسے قائم رکھا جاسکتا ہے اور زندگی کی تمام عبادت کا حاصل کیا ہے، اسے لا حاصل ہونے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے.....؟“ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک سوال نہیں، تمام عمر کا ایک نظریہ اور شبہ ہے، جسے اگر ہم سمجھ جائیں، تو سب کی دنیا پار لگ جائے۔ بہت مشکل ہے کہ پہلے سجدے کی حرمت کو آخری سجدے کی عظمت تک قائم رکھا جاسکے، لیکن ناممکن نہیں۔ انسان جب اپنی عمر کا پہلا بے لوث سجدہ، خالص خدا کی رضامندی کے لیے کرتا ہے، تو زمین پر ماتھا ٹیکتے ہی اس کے ماضی کے تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ مسلمان کا پہلا سجدہ تو ویسے بھی عموماً معصومیت کے دور کی ایک خوش گوار یاد ہوتا ہے، لیکن پھر انسان دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے۔ پہلے سجدے سے لے کر آخری سجدے کے درمیان کئی بار گناہوں سے آلودہ شب و روز اس کا مقدر ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کو سجدہ کرتا ہے، اپنے اللہ کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اگلی صبح پھر اسی خدا کی نافرمانی شروع کر دیتا ہے۔ سچ بتاؤں، میں خود بھی کبھی اپنے پہلے سجدے کی حرمت برقرار نہیں رکھ پایا، لیکن میرے دوست مسلم کاؤنسلر کے دل میں یہ ڈر ہے کہ جب ایک بار ماتھا ٹیک ہی دیا تو پھر کہیں کوئی لغزش اس کی تمام ریاضت ضائع نہ کر دے۔ واہ، سبحان اللہ، ایسا تزکیہ نفس تو اب سوچ کی حدوں سے بھی پرے کی بات ہے، روزانہ ہم سے نہ چاہتے ہوئے بھی کیا کچھ سرزد نہیں ہو جاتا۔ آنکھ، کان، زبان، دل اور دماغ..... کسی کا بھی پردہ نہیں رکھ پاتے ہم لوگ، لیکن میں ایمان کے جس کم زور ترین درجے پر فائز ہوں، اس حوالے سے اس مشکل تر سوال کا بس ایک ہی جواب ہے میرے پاس کہ جب تک سانس رہے اور جب تک اللہ کی طرف سے سجدوں کی توفیق باقی ہو، انسان کو اپنے ہر سجدے کو آخری سمجھ کر ماتھا ٹیکنا چاہیے اور ہر بار پہلے سجدے کی طرح سراٹھانا چاہیے، یعنی ہر سجدہ ہی اس کا آخری اور پہلا سجدہ ہے۔ اور ہر باری، عطا کردہ درمیانی مدت صرف عبوری سمجھ کر گزرنی چاہیے۔ یاد رہے، صرف سجدہ ہی وہ واحد عبادت ہے، جو ابلیس کو شیطان بنا گئی، ورنہ وہ تو فرشتوں کا بھی فرشتہ تھا۔ ایک سجدے کے انکار نے اسے کیا بنا ڈالا..... لہذا اس سجدے کو معمولی ہرگز نہ جانے گا..... یہی ایک سجدہ ہی تو آدم کو ابلیس ہونے سے بچاتا ہے، ورنہ خدا کو سجدہ کرنے والے فرشتوں کی بھلا کیا کمی تھی۔ ان میں سے کچھ تو شاید ازل سے ابد تک سجدے ہی میں پڑے رہتے، لیکن یہ آدم کا سجدہ ہے، جو اسے صرف مخلوق سے ”اشرف المخلوقات“ بناتا ہے، لہذا اپنے سجدوں کو ضائع نہ جانے دیں۔ پوری خلقت جب مسلمان کے درپے ہو تو اسے اپنے خالق ہی کا سہارا ہوتا ہے۔ سو، اس خالق کو بھی خود سے ناراض نہ کر دیجیے گا۔ وما لینا الا لبلاغ.....“ شیخ الکریم کا آخری لیکچر بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا، لیکن مجھے اب بھی کچھ عقلی محسوس ہو رہی تھی۔ تین دن بعد شیخ الکریم یہاں سے قاہرہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے اور پھر وہاں کے لیکچرز دینے کے بعد انہیں واپس تل ابیب جانا تھا۔ طلبہ ان سے الوداعی ملاقات کے لیے انہیں گھیرے کھڑے تھے اور میرا نمبر آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”ہاں بھئی، کسی حد تک تو تمہیں اپنے سوال کا جواب مل ہی گیا ہوگا۔ بہر حال، میں کوشش کرتا رہوں گا کہ کوئی کامل جواب ملے، تو تم تک ضرور پہنچاؤں۔ تم نماز سیکھنے نہیں آئے میرے پاس.....؟“، ”جی، میں یہی کہتا چاہ رہا تھا کہ کیا میں کل شام سے، آپ کے جانے تک روزانہ دو گھنٹے یہاں آسکتا ہوں۔ جو وقت بھی آپ کو مناسب لگے۔“ ضرور ضرور، کیوں نہیں..... ماشاء اللہ تمارا ذخیرہ تو پاکستان کی مٹی سے اٹھا ہے۔ بچپن کی یاد کردہ آیات دہرانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا تمہیں..... تم یوں کرو، عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت مقرر کر لو۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔“ ہم یونیورسٹی واپس پہنچے، تو شام ڈھل چکی تھی اور صرف لاہریری اور چند دیگر شام کی کلاسز کے شعبے کھلے تھے۔ ایک اور جینی مجھے کیفے کے باہر والے بڑے والا ان کی ایک شیخ پر سرگوشیاں کرتے نظر آئے اور میں ان کی جانب بڑھ گیا۔ ”مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر تم دونوں روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر کیا کھسر پھسر کرتے رہتے ہو۔ تم دونوں کی باتیں کبھی ختم کیوں نہیں ہوتیں.....؟“ جینی زور سے ہنس پڑی۔ ”کچھ مسلم کاؤنسلر بنتے جا رہے ہو۔ چند دن میں تم ہماری ملاقاتوں پر بھی پابندی لگا دو گے آیاں۔“ ایک بھی مسکرایا۔ ”میری بددعا ہے کہ کبھی تم بھی کسی کی ان پیار بھری سرگوشیوں کو ترسو، لیکن شاید تمہارے ہاں تو محبت گناہ کے زمرے میں آتی ہے؟“ جینی نے گرہ لگائی۔ ”حالاں کہ میں نے ٹی وی پر پاکستانی چینلوں پر ہمیشہ موبائل فونز کے اتنے زیادہ سے سے پکچیز کے اشتہارات چلتے دیکھے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ تمام رات مفت بات کرنے کا ہیکسج، وغیرہ وغیرہ..... تم ان کی پیش کش پر کیوں تبصرہ نہیں کرتے کہ آخر تمام رات مفت کال کا یہ ہیکسج ایک اسلامی ملک میں کس طبقے کے لیے متعارف کروایا جاتا ہے؟“ میں بھی مسکرا دیا ”وہ تمام ہیکسجز بھی تم جیسے احمقوں کے لیے ہی متعارف کروائے جاتے ہیں، جو آئندہ زندگی کی تمام باتیں، چند راتوں ہی میں ختم کر کے، پھر رشتہ ہو جانے کی صورت میں تمام عمر ایک دوسرے سے باتیں ختم ہو جانے کی شکایتیں کرتے کرتے گزار دیتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا، تو وہاں بھی زندگی بھر کا رومانس چند راتوں میں نچوڑ لینے والی، ایسی ہر پیش کش پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دیتا۔“ ایک نے میرے سر کے بال پکڑ کر مجھے خوب جھنجھوڑا۔ ”او محبت کے دشمن! کبھی کسی کو ملانے کی بات بھی کر لیا کرو۔ یو



سپر ایئر..... جدائی کے فرشتے“ میں اور جینی ایرک کی یہ دُہائی سن کر زور سے ہنس پڑے۔ اتنے میں مجھے احمر نے عقب سے پکارا ”آیان! کچھ ضروری بات کرنی ہے“ جینی نے لقمہ دیا ”جاؤ، تمہارے ”جدائی گروپ“ کا ایک اور ہرکارہ آیا ہے، دیکھنا آیان، تمہیں جب بھی محبت ہوئی، ایسی جان لیوا ہوگی کہ اس کاٹے کا پانی بھی نہیں مل پائے گا تمہیں.....“ میں مسکراتا ہوا وہاں سے پلٹ گیا ”تم جیسے دوستوں کی موجودگی ہی میں دشمنوں کو اضافی کہا گیا ہے۔“

احمر کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ ”تمہیں عامر بن حبیب نے بلایا ہے، ہمیں ابھی چلنا ہوگا.....“ عامر بن حبیب کی روپوشی کو آج تین دن پورے ہو چکے تھے اور ان تین دنوں میں یہ ہماری پہلی ملاقات ہو رہی تھی۔ عامر بن حبیب بار کھلے اسٹریٹ کے ایک کشادہ سے پارٹمنٹ میں روپوش تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گیا، جیسے کوئی برسوں پرانا رفیق اس سے ملنے آیا ہو۔ کبھی کبھی ہمارے آس پاس ہی کیسے کیسے نادور اور مخلص لوگ موجود ہوتے ہیں، لیکن ہمیں نظر نہیں آتے اور ہم زمانے میں وقفا اور خلوص کی دُہائیاں دیتے پھرتے ہیں۔ عامر بن حبیب بھی ایسا ہی ایک نایاب صفت تھا، جسے پہچاننے میں، میں نے کتنی دیر لگا دی۔ عامر نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھالیا ”آیان! یقین جانو، اب میں بہت مطمئن اور ریلیکس ہوں، مجھے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ میری گرفتاری یا کسی اور ناگہانی آفت کی صورت میں یہ پورا گروپ بکھر جائے گا اور ہم نے اتنے برسوں میں اپنی جو ایک پہچان بنائی تھی، وہ مٹ جائے گی، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم آخری سبسٹریک مسلم کاؤنسلرشپ کی ایسی مضبوط روایت ڈال جاؤ گے کہ ہمارے جانے کے بعد بھی اس یونیورسٹی میں مسلم کاؤنسلر کا عہدہ ہمیشہ برقرار اور مضبوط رہے گا۔“ میں نے عامر کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی ”لیکن تم اتنی لمبی منصوبہ بندی کیوں کر رہے ہو.....؟ کچھ دن بعد تم اور بارسیدی دوبارہ یونیورسٹی جوآن کرلو اور ہم سب مل کر یہ جدوجہد جاری رکھیں گے..... اور تیسرا مہینہ ختم ہوتے ہی میں تمہیں دوبارہ مسلم کاؤنسلر بنا کر تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دوں گا۔ جب تک تم یونیورسٹی میں ہو، تم ہی مسلم کاؤنسلر ہو گے اور میں اور بارسیدی آخری دم تک تمہارے بازو کی طرح، تمہارا ساتھ دیں گے۔“ عامر نے گہری سی سانس لی ”میرا دوبارہ یونیورسٹی جوآن کرنا اب اتنا آسان نہیں ہے میرے دوست۔ سی آئی اے میرے پیچھے پڑ چکی ہے اور یہ بات بہت پہلے ہی سے متوقع تھی۔ اسی لیے میں یہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح کوئی امریکی شہریت رکھنے والا مسلمان طالب علم مسلم کاؤنسلر بن جائے، تاکہ اگر وہ مجھے کسی زندان میں ڈال بھی دیں یا ملک بدر کریں تو میرے جانے کے بعد وہ یہ ذمہ داری سنبھال سکے، کیوں کہ کسی امریکی شہری کو ملک بدر کرنا ان کے لیے ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہوگا۔“ میں نے عامر کو وہ بری خبر سنانے کا فیصلہ کر لیا، جسے میں پہلے اس کی پریشانی کا سوچ کر چھپائے رکھنے کی سوچ رہا تھا۔ ”سی آئی اے کی تو مجھ پر بھی نظر ہے عامر بن حبیب.....“ وہ میری بات سن کر زور سے چونکا اور میں نے عامر کو آج دن کی ہوئی تمام واردات بتا دی۔ عامر گہری سوچ میں ڈوب گیا ”نائن الیون کے بعد یہ لوگ ہر اس مسلمان سے کھٹک جاتے ہیں، جو ذرا سا بھی دل جمعی کے ساتھ اپنے مذہب کی جانب متوجہ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ ہماری مسجدوں میں صرف دہشت گرد پلٹے ہیں اور شیخ الکریم جیسے بزرگ استاد، وہاں طالب علموں کو بم بنانے اور خودکش حملوں کی تربیت دیتے ہیں۔ آیان تم امریکی شہری ہو، تب ہی اس آفیسر نے تمہاری اتنی بات برداشت کر لی۔ ایسی بات مجھ سا کوئی عرب یا با بر جیسا فلسطینی کرتا، تو وہ اب تک ہمیں اسامہ بن لادن کا دایاں ہاتھ ثابت بھی کر چکے ہوتے۔ ہم ہجرت زدہ مسلمانوں کے لیے یہاں زندگی بڑی عذاب ہے دوست..... تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ آخر کار تم ان کے لیے مسلمان پہلے اور امریکی بعد میں ہو۔ کوشش کرنا کہ ان سے الجھے بنا ہی معاملات طے پا جائیں۔“ ”لیکن انہیں تم سے اب ایسی کیا پر خاش ہو گئی ہے.....؟“ عامر مسکرایا ”پر خاش تو انہیں نائن الیون کے بعد ہر عرب مسلم کے ساتھ ہے، کیوں کہ نکرانے والے جہازوں کے پائلٹ زیادہ تر عرب ہی تھے، لیکن امریکی اپنے کچھ مفادات کی وجہ سے اب تک کھلم کھلا عربوں کی مخالفت نہیں کر پائے، البتہ سارا نزلہ پاکستان اور افغانستان پر جا گرا۔ عراق کا نمبر بعد میں آیا، لیکن یہ کسی عرب کو یہاں نیویارک میں ایسی کسی سرگرمی میں ملوث ہوتے بھی برداشت نہیں کر سکتے، جو ان کے لیے کسی انتظامی مشکل کا باعث بن جائے۔“ اس روز عامر بن حبیب نے کافی تفصیل سے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک متمول عرب خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ ہے اور اس سے پہلے وہ قاہرہ کی اسلامک یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کر چکا ہے۔ اس کے والد کا ریاض میں قالینوں کا بہت بڑا کاروبار ہے اور ان کی جائیداد دنیا کے چھ ممالک میں موجود ہے۔ عامر کے والد اسے اپنے کاروبار میں شریک کر کے سب انتظام اسی کے حوالے کرنا چاہتے تھے، لیکن قاہرہ یونیورسٹی میں کچھ ایسا ہوا کہ اس کا من مذہب کی اس جدوجہد کی طرف پلٹ گیا اور وہ ماسٹرز کے لیے نیویارک آ گیا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگا، جیسے عامر کا چہرہ قاہرہ یونیورسٹی کے ذکر پر کچھ شکن زدہ سا ہو گیا تھا، لیکن میں نے اسے کرید کر مزید اس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے عامر کے شانے کو سہلایا ”فکر مت کرو، ٹھیک ہو جائے گا..... اگر یہ جنگ ہے تو ہم اسے بھرپور لڑیں گے اور اگر ہار ہی مقدر ہے تو پھر آخری مات تک لڑیں گے۔“ عامر مسکرایا ”مجھے تمہاری یہ فائننگ اسپرٹ ہی سب سے زیادہ بھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں، تمہیں ہرانا اتنا آسان نہیں ہوگا ان کے لیے۔ تم ہارتے ہارتے ہارو گے آیان.....“

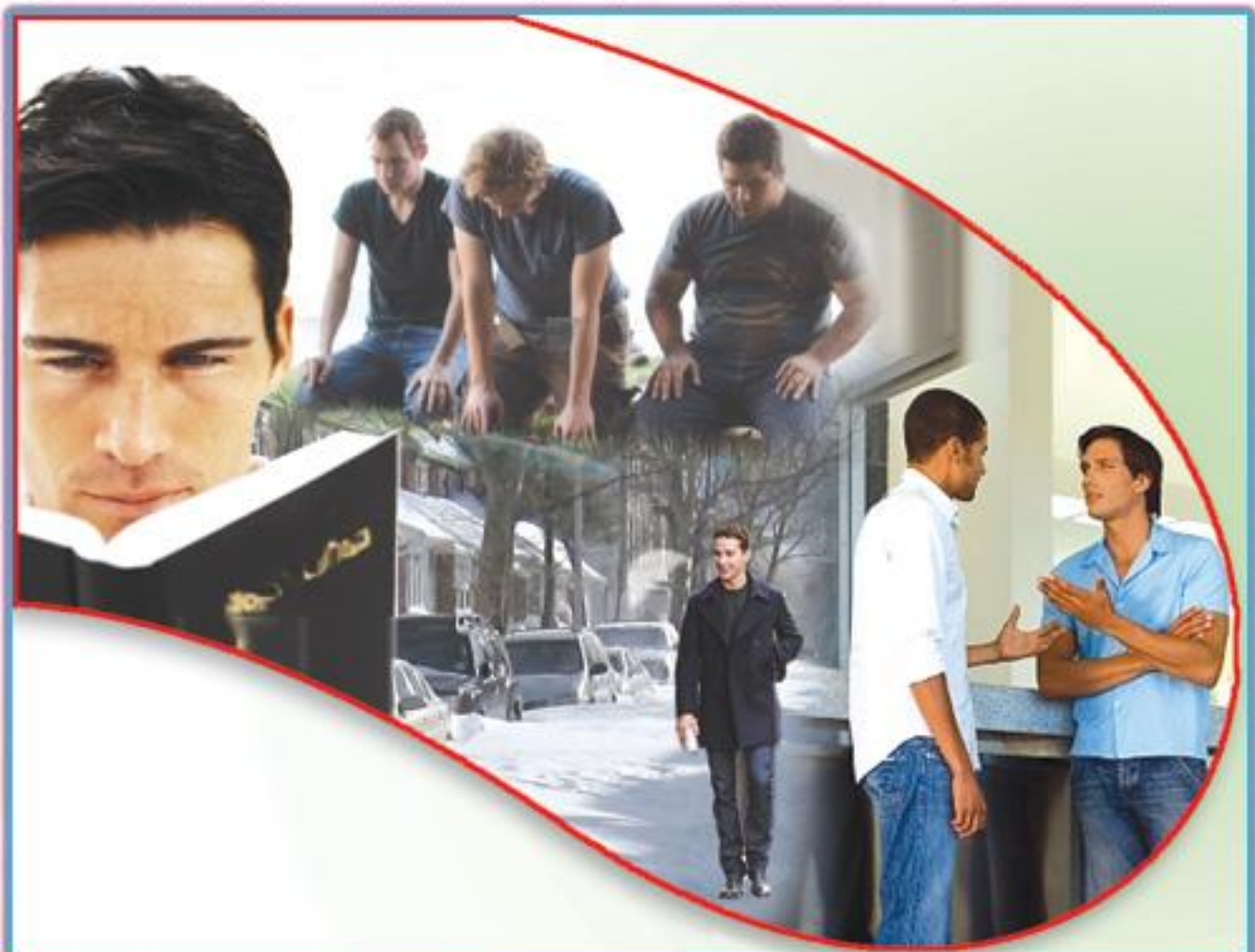
اگلے روز بسام کی پیشی تھی، میں کورٹ پہنچا تو سیز جیوں ہی پر صنم کبیر اور ماموں سے ملاقات ہو گئی، کچھ ہی دیر میں جینی، ایرک، جم اور فرہاد بھی آ گئے۔ میں نے آج جان بوجھ کر مسلم گروپ کے لڑکوں کو عدالت آنے سے منع کر دیا تھا۔ میں اب ذرا محتاط ہو کر ہر قدم اٹھانا چاہتا تھا اور ویسے بھی میں نے اپنے تمام دوستوں کو فی الحال بسام کو میرے مسلم کاؤنسلر بننے کی خبر دینے سے منع کر رکھا تھا۔ میں اسے تنہائی میں آرام سے یہ خبر سنانا چاہتا تھا۔ وہ میرے مسلم گروپ کو جوآن کرنے ہی پر بہت پریشان تھا۔ اس لیے اسے ایک دم ہی یہ خبر سنانا بہتر نہ ہوتا۔ اس روز آسٹن پوری تیاری کر کے آیا تھا اور اس نے سرکاری وکیل کی ایک نہیں چلنے دی۔ جج نے رسمی کارروائی کے بعد بسام کی ضمانت منظور کر لی۔ وہ عدالت سے باہر نکلا تو ہم سب اس سے لپٹ گئے۔ آسٹن نے میرا شانہ تھپکا ”لو بھئی، ضمانت تو ہو گئی تمہارے بھائی کی، لیکن اب ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا، کیس اور الزام ابھی ختم نہیں ہوا۔“ آسٹن دو قدم آگے بڑھا، پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا ”ارے ہاں، یاد آیا، بھئی تم اس دن نائن الیون پر خوب بولے تھے..... تم تو بڑے مشہور ہو گئے ہو لڑکے۔“ بسام کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”یہ وکیل کیا کہہ رہا تھا۔“ میں نے بات نالی ”کچھ نہیں، یونیورسٹی کی طرف سے کوئی تقریب تھی۔ تم چلو، دیر ہو رہی ہے۔“ ہم سب آگے بڑھے، لیکن سیز جیوں کے اختتام پر لوہے کی رینگ کے پاس آفیسر فورڈ کو دیکھ کر میں ٹھٹھک سا گیا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ وہاں کھڑا بے پروائی سے یوں ایک کے بعد ایک، مونگ پھلی کھا رہا تھا، جیسے اس نے آج وہ کاغذ کا بڑا سا تھیلہ ختم نہ کیا، تو کوئی غصہ ہو جائے گا۔ اس نے مجھ دیکھتے ہی گرم جوشی سے کہا ”ہے یو! مسلم کاؤنسلر، بھائی کی آزادی مبارک ہو۔ میں نے کہا تھا نا، آسٹن اسے چھڑالے جائے گا“ بسام فورڈ کے منہ سے میرے لیے مسلم کاؤنسلر کا لفظ سن کر بری طرح چونکا، میں نے فورڈ کو گھورا ”کیا تم مجھے یہاں یہ احساس دلانے کے لیے کھڑے ہو کہ سی آئی اے اب امریکی عدالتوں کے فیصلے پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔“ فورڈ مسکرایا ”نہیں! ہم تو کسی اور کام سے عدالت آئے تھے، لیکن یہاں تم سے ملاقات ہو گئی، بہر حال میں تمہیں بہترین قسمت کی دعا دیتا ہوں۔“ فورڈ اپنے ساتھیوں سمیت آگے بڑھ گیا، لیکن بسام کے پاؤں وہیں گڑ کر رہ گئے۔ ”آیان..... تم مسلم کاؤنسلر بن گئے ہو۔ بہت خوب، اور کیا کیا چھپایا ہے تم نے مجھ سے.....؟“ میں نے بڑی مشکل سے اسے پارٹمنٹ چلنے پر راضی کیا، لیکن گھر کا دروازہ بند کرتے ہی وہ مجھ پر برس پڑا۔ ”او! یہ سب کیا ہو رہا ہے، تم مسلم کاؤنسلر بن چکے ہو اور سی آئی اے تمہاری تفتیش کرتی پھر رہی ہے، تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ سب ہمارے بس کی باتیں نہیں ہیں، تم اسلام کے ٹھیکے دار کب سے بن گئے.....؟“ مجھے بھی غصہ آ گیا ”تب سے، جب عامر بن حبیب اور بارسیدی کو تمہاری حمایت کے جرم میں یونیورسٹی سے نکالا گیا اور عامر بن حبیب کی کاؤنسلرشپ میری وجہ سے ختم ہوئی۔“ آیان بھی زور سے چلایا۔ ”ہاں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم ان کی جگہ لے لو۔ عامر یا با بر اگر امریکا سے نکالا گیا تو وہ پھر بھی اپنے ملک، اپنے گھرواؤں لوٹ جائیں گے، لیکن ہم کہاں جائیں گے، ہمارا نہ تو کوئی اور ملک ہے، نہ گھر۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم بھی آخر کار اسی رستے پر چل پڑے ہو، جس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تم صبح یونیورسٹی جا کر پہلا کام یہی کرو گے کہ اس کاؤنسلرشپ اور مسلم گروپ کی ممبرشپ سے استعفیٰ دو گے۔ اور اگر تم خود نہیں دو گے، تو میں تمہاری طرف سے لکھ آؤں گا۔ اور مجھے اس سلسلے میں مزید کوئی بحث نہیں سننی ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے، میں تمہاری طرح احسان فراموش نہیں ہوں۔ اب میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔“ بسام نے طنز یہ لہجہ میں کہا ”واہ..... خوب برین واں کیا ہے، تمہارا ان لوگوں نے۔ انہیں اور آتا ہی کیا ہے؟ تم جیسے نادانوں کو ایسی ہی پٹیاں پڑھا کر وہ دہشت گرد بنادیتے ہیں، لیکن میں تمہیں دہشت گرد نہیں بننے دوں گا آیان۔“ میں زور سے چلایا ”تم کون ہوتے ہو مجھے یہ پٹیاں پڑھانے والے.....؟“ بسام غصے میں چلایا ”میں کون ہوتا ہوں، بہت خوب آج تم ان دہشت گردوں کی وجہ سے مجھ سے یہ پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں۔ لگتا ہے، چار دن میں کافی یاراندہ ہو گیا ہے۔“ میں اور بسام ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوئے۔ میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا ”اور مجھے لگتا ہے کہ امریکا میں رہتے رہتے تمہارا خون بھی انہی لوگوں کی طرح سفید ہو گیا ہے۔“ بسام زور سے چلایا ”آیان.....“ اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور ایک زوردار طمانچے کی صورت میرے کال پر پانچ انگلیوں کا نشان چھوڑ گیا۔..... (جاری ہے)





.....**ہاشم ندیم**.....

کمرے میں زوردار تھپڑ کی آواز گونجی۔ میری پوری زندگی میں بسام نے آج تک کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، تب ایک بار بسام نے یونیورسٹی کے لیے محض ہاتھ سے مارنے کا اشارہ کیا تھا، تو میں اگلے دو دن اس سے ناراض رہا اور بات چیت بند کر دی تھی۔ پھر ڈیڈ نے ہم دونوں بھائیوں کو زبردستی گلے ملوایا اور ہمیں ساحل پر ہماری پسندیدہ پولکا آکس کریم کھلانے بھی لے گئے تھے۔ اس سے اگلے برس ہم سب امریکا آ گئے اور تب سے آج تک کبھی بسام نے مجھے پھول سے بھی نہیں چھوا تھا، حالاں کہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ نازک مزاج تھا، لیکن اس نے ہمیشہ میرے



ہی ناز اٹھائے تھے۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی ساکت ہو گئے اور پھر میں شدید غصے میں پلٹا اور بسام کے روکنے کے باوجود زور سے دروازہ بند کر کے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ وہ رات میں نے نیویارک کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے گزاری۔ ستر چار ہاتھ اور نیویارک کی راتیں بہت سرد ہو چکی تھیں۔ راستے میں بہت سی جگہوں پر بے گھر افراد نے لوہے کے بڑے بڑے ڈمز میں ہاتھ سینکنے کے لیے آگ جلا رکھی تھی۔ آخر بسام کو بے گھر ہونے کا اتنا خوف کیوں تھا۔ یہ لوگ بھی تو تھے، جو یوں بنا کسی گھر، کسی چھت کے اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ کیا زندگی صرف ”چھت اور چھاپا“ کما لینے ہی کا نام ہے۔ صبح کے وقت میں بنا کسی ارادے کے، چائنا ٹاؤن جانے والی زیر زمین ریل میں آ بیٹھا، مسجد میں فجر کی نماز کی تیاریاں جاری تھیں۔ شیخ انکریم کی معیت میں جماعت کھڑی ہوئی، تو میں بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی وضو کر کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ شیخ نے سلام پھیرا تو مجھے وہاں دیکھ کر تعجب آمیز خوشی سے بولے ”ارے..... آج تو مسلم کاؤنسلر بھی یہاں موجود ہے، لیکن اتنی صبح، تمہیں تو عصر کے وقت آنا تھا لڑکے.....“ میں نے دبے لفظوں میں انہیں بسام سے ہوئی جھڑپ کے بارے میں بتا دیا۔ وہ مسکرائے ”دو بھائیوں میں ٹکرار نہ ہو، تو زندگی پھینکی ہے، اس کی یہ ڈانٹ بھی دراصل اس کی محبت ہی کا ثبوت ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں تم غلط ہاتھوں میں پڑ کر جنون کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اور اس میں اس کا ایسا کچھ قصور نہیں ہے۔ ہم نے کچھ عرصے سے خود ہی اپنی شناخت کو بھی تو، اسی جنون کی بھیئت چڑھا رکھا ہے، لہذا اب تو بے فی صد جھوٹ اور دس فی صد سچ کا سارا المیہ تو ہم پر گرنا ہی تھا۔“ میں اب بھی کسی اندرونی الجھن کا شکار تھا۔ ”لیکن یہ شناخت کا جھگڑا شروع ہی کیوں ہوا، کیا مذہبی پہچان واقعی اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ کئی تہذیبیں اس جنگ میں جھونک دی گئیں۔ آخر مسلمان سے ایسا کیا ہیرے باقی نسلوں کو؟“ شیخ انکریم مسکرائے ”انہیں اپنی شناخت چھین جانے کا خطرہ ہے، اس لیے وہ ہم سے لڑتے ہیں اور ہماری بے وقوفی دیکھو کہ ہم خود اپنی شناخت مٹانے کے درپے ہیں۔ یہود کیجا ہو چکے اور ہماری فرقہ در فرقہ تقسیم کا عمل رکنے میں نہیں آتا۔“ ”لیکن یہ یہودی بھی آخر ہمیں کیوں مٹانا چاہیں گے، جب کہ آپ نے ابھی خود کہا کہ ہم خود اپنے آپ کو مٹانے کے درپے ہیں، تو یہ بات پھر مسلمان دشمن نسلوں کو بھی اچھی طرح پتا ہوگی، پھر وہ اپنی تمام توانائیاں ہم ہی پر کیوں صرف کرنے لگے۔ وہ ہماری نسبت پہلے ہی بہت ترقی یافتہ ہیں اور انہوں نے کم از کم اس دنیاوی ترقی کا راز بھی پالیا ہے کہ کس طرح وقت کی اس دوڑ میں خود کو آگے رکھا جاسکتا ہے، پھر وہ اپنا قیمتی وقت ایک بارے ہوئے پسپا دشمن پر کیوں ضائع کرنے لگے۔ سچ کہوں، تو مجھے اب بھی یہ سب افسانوی لگتی ہیں۔ ہم نے اپنی ہر نا کامی کو ان یہودیوں کے سر تھوپنے کا آسان طریقہ ڈھونڈ لیا ہے اور بس.....“ شیخ انکریم نے اطمینان سے میری بات سنی ”شاید کسی حد تک یہ اندازہ درست ہے، لیکن یہود اور مسلمان کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس عداوت کی مثال بالکل شیطان اور آدم کی دشمنی کی ابتداء جیسی ہے۔ جس طرح ایلیم آدم سے پہلے اللہ کے مقرر ترین فرشتوں میں سے ایک تھا اور آدم کی تخلیق اور سجدے کے حکم سے اسے اپنی اہمیت اور لاڈلائپ ختم ہوتا نظر آیا، ٹھیک اسی طرح مسلمان سے پہلے یہود اللہ کی لاڈلی قوم تھی اور پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد اور نبی آخر الزمان کی امت نے جب یہود سے ان کا وہ اعزاز اپنے نام منتقل کروالیا، تو ٹھیک اسی ایلیم کی طرح، جس نے تا ابد آدم کو بہکا کر اس سے یہ نکریم چھیننے کا عہد کر لیا تھا، یہود سے بھی مسلمان کو ملا، یہ اعزاز کبھی ہضم نہیں ہوا۔ شیطان کی طرح یہود بھی جانتے ہیں کہ وہ غلط ہیں، لیکن بغض اور حسد اس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی خطا تسلیم کرنے کے بجائے اسے وجہ خطا مانتے ہیں، جسے عزت و رتبہ ملا اور اسے بے عزت اور ذلیل کر کے فنا کرنے کے درپے ہیں اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ آدم شیطان کی، اور مسلمان خود یہود کی مدد کر کے ان کا یہ کام آسان کرتا آیا ہے۔ سچ ہے، شیطان کی چال بڑی گھائل کر دینے والی ہے۔“ میں غور سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ان سوالوں کے جواب ملے، جو ہمیشہ سے میرے اندر کہیں موجود تھے، لیکن جواب نہ ملنے کے ڈر سے میں نے سدا نہیں دبائے ہی رکھا۔ دھوپ نکلنے کے کچھ دیر بعد شیخ نے مجھے وضو کرنے کو کہا اور مجھے دیکھتے رہے، پھر چند جگہوں پر میری تصحیح کی اور خود مجھے پورا وضو کر کے بتایا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے نماز سنی اور جہاں جہاں تصحیح کی ضرورت تھی، رہنمائی بھی کرتے گئے۔ ظہر تک میں ان کے ساتھ ہی رہا اور انہوں نے بہت سی بنیادی باتیں مجھے سکھادیں۔ ظہر کے بعد میں اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے مسجد سے نکل آیا۔

بارش کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور بادلوں نے آسمان سے افق تک اپنا خیمہ باندھنا شروع کر دیا تھا۔ نیچے گھاٹیوں میں سرمئی اندھیرا سا چھانے لگا اور جب میں نے یونیورسٹی کے گیٹ سے قدم اندر رکھا تو پہلی بوند میری جبین پر سجدہ کر چکی تھی۔ اکیڈمک بلاک میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے صنم کبیر کی مجھ پر نظر پڑی اور وہ بدحواس ہی میری جانب لپکی ”آیا..... کہاں تھے تم دن بھر، ہم سب تمہیں تلاش کر کر کے تھک گئے، کہاں چلے گئے تھے تم؟“



میں نے حیرت سے اسے دیکھا ”کیا ہوا، خیر تو ہے.....؟ میں کسی میلے میں کھو تو نہیں گیا تھا بس پہلوی.....“ ”بسام تمہیں کل رات سے پورے نیویارک میں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ چکا اب تک۔ تم ساری رات کہاں تھے، جاننے نہیں، تمہارا بھائی تمہارے لیے کتنا فکر مند ہو جاتا ہے؟“ مجھے رات والی جھڑپ یاد آگئی ”وہ تمہیں ملے تو اس سے کہنا کہ اسے میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے مسلم ہاسٹل میں کمرالینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میری ذمہ داریاں اب مجھے یونیورسٹی سے زیادہ دیر باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔“ اچانک میرے عقب سے بسام کی آواز ابھری۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری قید کے دوران تمہیں وہ لوگ اپنے بھائی سے زیادہ پیارے ہو گئے ہیں، اس لیے تم اپنا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہنے کی بات کر رہے ہو۔“ بسام جانے کس وقت وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ میں چپ رہا۔ صنم کبیر نے پریشانی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا ”کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔ پوری یونیورسٹی تم دونوں بھائیوں کی محبت کی مثالیں دیتے نہیں تھکتی، اور تم دونوں یوں.....؟“ ”بسام نے صنم کی بات کاٹ دی ”یہ تم اسے سمجھاؤ، میں اسی کے بھلے کے لیے اسے ان لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ عامر بن حبیب اور بابر سیدی نے میرے لیے تحریک چلا کر ہم پر بڑا احسان کیا۔ مجھے ذاتی طور پر ان دونوں لڑکوں سے کوئی پر خاش بھی نہیں ہے۔ وہ اچھے لڑکے ہیں، لیکن یہاں بات کسی کی ذات کی نہیں ہو رہی۔ یہ ایک اجتماعی تاثر کی بات ہے اور نیویارک کے آج کل کے حالات میں کسی یونیورسٹی میں مسلم کاؤنسلر ہونا بذات خود اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور آیان کے پیچھے تو پہلے ہی سی آئی اے کی عقابانی نظریں ہیں۔“ بسام اپنی بات کر رہا تھا کہ اتنے میں پُرہ اور جینی کے ساتھ ایرک اور جم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایرک نے میرا ہاتھ تھام لیا ”بسام ٹھیک کہہ رہا ہے آیان..... تمہارا بھائی بنا کسی قصور کے تین ہفتے جیل میں گزار کر آ رہا ہے۔ تم پر کوئی الزام لگانے میں تو انہیں شاید ایک لمحہ بھی نہ لگے۔ ہم سب دوستوں کی یہی رائے ہے کہ تم فی الحال خود کو سی آئی اے کی نظروں میں آنے سے بچانے کے لیے مسلم کاؤنسلر شپ سے استعفیٰ دے دو۔ تم پس منظر میں رہ کر بھی اپنے مسلمان دوستوں کی مدد کر سکتے ہو۔“ پُرہ نے ان کی باتوں میں کوئی دخل نہیں دیا۔ چپ چاپ کھڑی اُن سب کی سختی رہی۔ میں نے ان پر نظر ڈالی۔ ”آج تم لوگ پولیس اور سی آئی اے کے ڈر سے مجھے سچ کا ساتھ دینے سے منع کر رہے ہو، کل اگر یہی ادارے مجھے بسام کے رشتے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے کہیں گے، تو کیا تب بھی تم لوگوں کا یہی مشورہ ہوگا.....؟ بسام بھی تو ان کی نظروں میں مشکوک ہو چکا ہے۔ آخر ہم لوگ کب تک اس خوف کے اثر تلے اپنی زندگی گزارتے رہیں گے، آخر ہمارا جرم کیا ہے.....؟ ہم کیوں ان کی لگائی ہوئی فرد جرم سے پہلے ہی خود کو مجرم ثابت کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ کیا صرف نیویارک پولیس کے کہہ دینے سے ہم میں سے کوئی بھی دہشت گرد ثابت ہو جائے گا۔ ہمارا ہر فیصلہ، کیا اب صرف یہی سوچ کر ہوگا کہ یہاں کی کسی ایجنسی کو ہمارا کوئی عمل ناگوار نہ گزر جائے۔ سی آئی اے شاید ہمیں بعد میں گرفتار کرے، لیکن ہم اس سے پہلے ہی خود اپنے آپ کو قید کر چکے ہیں۔ موت آنے سے پہلے ہی ہم خود اس کے خوف کے مارے اپنا گلا گھونٹ چکے ہیں۔ یار پلیز! مجھے چند دن جی لینے دو۔ اگر میرا انجام انہی صیادوں کے ہاتھ لکھا ہے، تو کچھ سانس مجھے اپنی مرضی سے بھی بھرنے دو، پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ اتنے میں کسی جانب سے احمر بوکھلائے ہوئے انداز میں وہاں نمودار ہوا ”آیان! ٹائمز اسکوئر والے بم کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے، اس پاکستانی لڑکے کو عمر قید کی سزا ہو گئی ہے۔ سنا ہے، اس نے خود جج سے کہا تھا کہ اسے اپنے جرم پر کوئی شرمندگی نہیں اور اس نے عمر قید کا سن کر بھری عدالت میں ”اللہ اکبر“ کا نعرہ بھی لگایا ہے۔“ مسلم ہاسٹل میں سب طلبہ اس فیصلے پر اپنا رد عمل طے کرنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں اور تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے احمر سے کہا ”ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“ پُرہ نے بھی میرے ساتھ قدم اٹھائے۔ بسام نے زور سے کہا ”رُک جاؤ آیان! آج اگر تم ہاسٹل گئے، تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے اپنا ہر رشتہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے رُک کر بسام کی جانب دیکھا۔ اگر ہم دونوں کا رشتہ اتنا ہی کچا ہے کہ وہ میرے کسی ایسے قدم سے بھی ٹوٹ سکتا ہے، جسے میں صرف اپنی کھوج مکمل کرنے کے لیے اٹھانا چاہتا ہوں، تو پھر اسے ٹوٹ ہی جانا چاہیے۔“

میں نے دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرے دوست اور صنم کبیر کی مجھے بلانے کی آوازیں دور تک میرا پیچھا کرتی رہیں، لیکن ان آوازوں میں بسام کی کوئی آواز شامل نہیں تھی۔ جانے کیوں موڑ مڑتے وقت تک میرے کانوں کو بسام کی ایک ہلکی سی آواز کی آس رہی۔ جانے، وہ اتنا سنگ دل کیسے ہو گیا تھا۔ چند دن کی قید نے اسے کس قدر بدل ڈالا تھا یا شاید چند دن کی اسی قید نے اس کے اندر میرے مستقبل کے لیے اتنا سخت قدم اٹھانے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ پُرہ واغور سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہم تینوں مسلم ہاسٹل میں داخل ہوئے، تو سبھی لڑکے جمع ہو چکے تھے اور زوردار بحث جاری تھی۔ سب ہی کا ایک سوال تھا کہ اب ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو خاموش کروایا۔ ”یہ ایک عدالتی فیصلہ ہے، جسے ثابت کرنے کے لیے عدالت کو ثبوت اور گواہی بھی خود اسی لڑکے نے فراہم کی ہے۔ اس نے اپنا جرم قبول کیا اور یہاں کی عدالت نے قانون کے مطابق اسے سخت سزا سنادی۔ اس لیے اس فیصلے کو پاکستانی ڈاکٹر خاتون کے فیصلے کے ساتھ مشروط کیا جائے، نہ ہی اسے اُس تاظر میں دیکھا جائے، کیوں کہ یہ ایک بالکل الگ کیس ہے۔ رہی بات، سزا میں زیادتی یا کمی کی، تو یہ ایک الگ بحث ہے اور یاد رہے کہ اپنی سزا اس لڑکے نے خود عدالت کے سامنے تجویز کی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی ہوگی کہ امریکا ایک خود مختار ریاست ہے اور اسے اپنی سلطنت کی حدود میں ہوئے جرم کے خلاف ہر اس رد عمل کی اجازت ہے، جو یہاں کے قانون اور آئین کے مطابق جائز ہے۔ یہ جرم اس لڑکے نے پاکستان یا کسی اور اسلامی سلطنت میں کیا ہوتا، تب بھی اسے شاید یہی سزا ملتی، لہذا اس معاملے میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ شیخ الکریم نے کہا تھا کہ اس ماحول میں ہمیں علم اور قلم کے جہاد کی ضرورت ہے۔ یہ جنگ کسی اور دیس میں ایک اقلیت کی حیثیت سے لڑی جا رہی ہے۔ اس لیے یہاں تلوار نہیں، دلیل کی کاٹ سے کام چل جائے، تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“ میری باتیں سن کر لڑکوں کا جوش خنڈا پڑ گیا۔ احمر نے پوچھا..... ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو آیان، لیکن اگر ہم اس معاملے پر خاموش رہیں گے تو یہودی اور عیسائی گروپ ہمیں کم زور ہونے کا طعنہ دیں گے۔“ اس کی ”معصوم“ تشویش سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”اس بار اگر وہ لڑکے تمہیں کمزور ہونے کا طعنہ دیں تو جواب میں تم لوگ صرف ایک جملہ کہو گے کہ ”ہم سب امریکن قوانین کا احترام کرتے ہیں، اور کرتے رہیں گے تاوقت کہ وہ قانون صرف ہم مسلمانوں کے خلاف کوئی امتیازی شکل اختیار نہ کر لے۔ اور میں تم لوگوں کو احتجاج سے ہرگز نہیں روک رہا، مگر احتجاج تو بازو پر کالی بٹنی باندھ کر بھی کیا جاسکتا ہے، مسلم گروپ میں سے جس کسی کو بھی اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا ہے، وہ ایسا کوئی بھی مہذب احتجاج کر سکتا ہے۔ صرف شور شرابا، توڑ پھوڑ اور سڑکوں پر جلے جلوس ہی احتجاج نہیں، اور کل ہم سب بابر سیدی کی گرفتاری کے خلاف اپنے دائیں بازو پر سیاہ پٹی باندھ کر کلاس میں آئیں گے۔ آئندہ سے ہمارا احتجاج نوٹس بورڈ پر لگے ایک کاغذ اور اس پر لکھی تفصیل کی صورت میں بولے گا اور ہم خاموش رہ کر،



کارڈ اٹھا کر، پٹیاں باندھ کر یا پھر ہونٹوں پر شپ لگا کر اپنا احتجاج رجسٹر کروایا کریں گے۔ بولو، یہ طریقہ احتجاج سب کو منظور ہے؟“ سب لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا ”منظور ہے۔“ لڑکے مطمئن ہو کر منتشر ہو گئے۔ پُرہ اس تمام معاملے کے دوران ایک جانب خاموش کھڑی رہی۔ پانچ لڑکیاں بھی مسلم گروپ کی ممبر تھیں، لیکن ان تک یہ احکامات زیادہ تر پُرہ والے ذریعے ہی پہنچائے جاتے تھے اور جب ضرورت پڑتی، تب ہی انہیں لڑکوں کے ساتھ مشترکہ ایجنڈے کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ میں نے پُرہ والے سے کہا کہ وہ طالبات کو بھی کل کے اس احتجاج کا پیغام دے آئے۔ وہ کسی الجھن کا شکار تھی ”آیاں! کیا تم نے واقعی ہاسٹل منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ میں جانتی ہوں کہ بسام اوپری طور پر سخت نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ اندر سے اب بھی اتنا ہی کم زور ہے۔ تمہارے بنا، وہ دو قدم بھی نہیں چل پائے گا۔ تم ایک بار پھر سوچ لو“، ”میں جانتا ہوں، ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے ہنماکمل نہیں رہ پائیں گے۔ دونوں کا آدھا آدھا حصہ ایک دوسرے کے پاس ہی رہ جائے گا، لیکن شاید اب ہماری سوچ میں تضاد آچکا ہے۔ ہم ایک ہی گھر میں رہے تو یہ بحث روزانہ طول پکڑے گی اور ہم روز ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکلا کریں گے، لہذا اس وقت یہی بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر رہوں۔ ایک بار عمر بن حبیب اور بابر سیدی میں سے کوئی بھی، دوبارہ مسلم کاؤنسلر بن کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لے، تب میں خود اس عہدے سے دست بردار ہو جاؤں گا، لیکن اگلے دو مہینے تک ایسا ممکن نہیں، کیوں کہ مسلم کاؤنسلر کے عہدے کا چناؤ اب دو مہینے بعد ہی ہوگا۔“

شام تک میری مسلم ہاسٹل میں کمرے کی درخواست پر کارروائی مکمل ہو چکی تھی، کیوں کہ بہ طور مسلم کاؤنسلر، یہ سہولت مجھے ہمیشہ سے حاصل تھی۔ شام کو وارڈن نے مجھے کمرے میں بلایا ”ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے، تمہاری رائے چاہیے۔“ وارڈن نے بتایا کہ عمر بن حبیب کے معطل ہونے کے بعد ابھی تک مسلم کاؤنسلر کا کمرہ اس سے خالی نہیں کروایا گیا، کیوں کہ میں نے بطور نئے مسلم کاؤنسلر، ہاسٹل میں کمرہ لینے کی درخواست ہی جمع نہیں کرائی تھی، لہذا کمرہ ابھی عامر کے نام ہی پر الاٹ ہے۔ اگر مجھے وہی کمرہ چاہیے، تو انہیں عامر کا سامان وہاں سے نکال کر سیل کرنا ہوگا یا پھر مجھے ایک تحریری درخواست دینی ہوگی کہ میں اس کی ذاتی اشیاء کی حفاظت کا ذمہ دار رہوں گا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی اور کمرہ الاٹ کر دیا جائے۔“ میں نے وارڈن سے کہا کہ عامر بن حبیب کے ذاتی سامان کو وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کی ضرورت نہیں، اسے وہیں کسی الماری میں سیل کر دیا جائے۔ میں اس کا ذمہ دار رہوں گا، لیکن مجھے وہی کمرہ الاٹ کیا جائے“ کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ مسلم کاؤنسلر کے کمرہ نمبر 137 کی یہ شناخت ختم نہ ہونے پائے۔ میری درخواست منظور کر لی گئی اور دو گھنٹے بعد وارڈن نے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ اتنی دیر میں ایرک اور جم میرے اپارٹمنٹ سے چند کپڑے اور میری ضرورت کا سامان بھی لے کر آچکے تھے۔ مجھ میں خود اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر اپنے گھر سے یہ سب اٹھا کر لاسکوں۔ جانے بسام نے کس دل سے یہ سب اکٹھا کر کے جم اور ایرک کے حوالے کیا ہوگا؟ سامان نکالتے ہوئے اچانک وہ چھوٹا سا ٹکیہ نیچے گرا، جس کے لیے روز رات کو میرے اور بسام کے درمیان باقاعدہ دھینگا مشتی ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا تو میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ کبھی کبھی بے جان چیزوں کے ساتھ جڑی یادیں، انہیں بھی کیسا جان دار بنا دیتی ہیں۔ بُت میں روح سی پھونک دیتی ہیں۔ یا شاید ”یاد“ بذات خود ایک روح کی طرح ہوتی ہے۔ ”ہمارے گزرے دنوں اور ماضی کی روح“ رات کا کھانا ہم سب نے ہاسٹل کے میس میں کھایا اور پھر وہ سب رخصت ہو گئے۔ سب سے آخر میں جانے والی پُرہ والی تھی۔ میں اسے چھوڑنے کے لیے ہاسٹل کی پارکنگ تک آیا، جہاں اس کی چھوٹی نیلے رنگ کی شیور لیٹ کھڑی تھی۔ ”اچھا تو مس پرواضیر خان! اب صبح آپ سے ملاقات ہوگی۔ دعا ہے کہ آپ کو اردو زبان میں ڈب شدہ اچھے اچھے رنگین خوابوں والی نیند نصیب ہو۔“ پُرہ والی میری بات سن کر مسکائی۔ ”بلیک اینڈ وائٹ خواب بھی چل جائیں گے، خواب سچے ہوں تو رنگ اپنے آپ بھر جاتے ہیں۔“ وہ چند قدم چل کر اپنی گاڑی تک پہنچ کر پلٹی۔ ”آیاں! تم ٹھیک تو ہونا.....؟ شاید پہلی رات تمہیں یہاں ٹھیک سے نیند نہ آئے۔ میرے پاس ابھی کچھ سکون آور گولیاں ہیں، گاڑی کے ڈیش بورڈ میں، تمہیں دے جاؤں.....؟“ ”نہیں پروا! کبھی کبھی نیند کو روٹھنے دینا چاہیے، تاکہ خوابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔“ ”آیاں! تم اتنے بڑے بڑے فیصلے ایک دم کیسے کر لیتے ہو.....؟ میرا دل تو اتنی آسانی سے میری بات کبھی نہیں مانتا۔“ ”لیکن پھر بھی تم اسے منا کر ہی دم لیتی ہو، تم ایک بہادر اور بہت مضبوط لڑکی ہو، پرواضیر خان۔ کاش! میں بھی اتنا ہی مضبوط ہوتا۔“ پرواضیر کچھ کہہ نہیں پائی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکی۔ ”کبھی کبھی اتنا مضبوط ہونا ہمیں خود اپنے اندر ہی سے چٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ میرے لیے دعا کرنا آیاں! کہیں میں کسی روز ایک دم ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہ ہو جاؤں۔“ پُرہ والے گاڑی آگے بڑھادی اور میں تھکے قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں آ گیا۔

پُرہ والے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار یہی خیال آ جاتا تھا کہ جانے بسام کیا کر رہا ہوگا؟ وہ بھی میری طرح خالی دیواروں سے باتیں کر رہا ہوگا۔ کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہیں۔ مجھے رات کو بہت دیر تک لاؤنج کے صوفے پر لیٹ کر ٹی وی دیکھنے کی عادت تھی۔ اس لیے میں رات گئے اپنے اور بسام کے لیے ایک ایک مگ کافی بناتا تھا۔ بسام کو جان بوجھ کر سوتے سے جگا کر کافی اسے تھماتا، تو وہ اکثر تنگ آ کر میرے ساتھ ہی لاؤنج میں آ جاتا اور پھر میں کچھ دیر میں سو جاتا اور بسام ساری رات جاگتا رہتا۔ جانے اسے میری کافی یاد آ رہی ہوگی یا نہیں.....؟ انہی سوچوں میں گم میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر تنگ آ کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ کمرے سے عامر بن حبیب کا سامان جمع کر کے اسے الماری میں لاک کر دیا گیا تھا۔ بس، اس کی رائٹنگ ٹیبل پر کچھ کاغذ، چند سیاہی والے پارکر پین، اور میز کے سامنے لگے شیلف میں چند کتابیں ابھی تک ویسے ہی تکی ہوئی تھیں، جیسے عامر انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے میں چند مشہور عرب مصوروں کے فن پارے سجے تھے، جو عامر کے ذوق کا پتا دیتے تھے۔ چند عربی رسائل، لٹلی، بن خالد کا ایک پوسٹر بھی کمرے کی زینت تھے۔ میں نے یوں ہی بے خیالی میں ایک عربی ناول، شیلف سے اٹھا کر اس کے صفحے پلٹنا شروع کر دیے۔ ناول کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی کیا گیا تھا، اچانک ناول کے بند صفحات کے درمیان سے ایک تصویر نیچے گر پڑی، میں نے میز پر پڑی تصویر اٹھا کر اسے جھاڑا، تصویر کسی معصوم سی خوب صورت لڑکی کی تھی، جو سر پر اچھی طرح اسکارف لپیٹے اور جسم کو ایک بڑے سے اوور کوٹ سے ڈھانپے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لڑکی نے ہاتھوں پر دستاں پہن رکھے تھے اور پاؤں بھی بند جوتوں میں قید، مطلب وہ مکمل طور پر باپردہ تھی۔ تصویر کے پیچھے لکھا تھا، ”ماریا..... قاہرہ یونیورسٹی، دسمبر 2006ء“ جانے کیوں، مجھے وہ تصویر دیکھ کر اس روز عامر بن حبیب کی آنکھوں میں جھلکتی وہ بے نام سی اداسی یاد آ گئی۔ کہیں اس اداسی کے پیچھے بھی ایسی ہی کسی مٹھی یاد کی کسک تو شامل نہیں تھی۔

وہ رات، جانے کس عذاب سے کٹی اور صبح جب میں یونیورسٹی پہنچا، تو تمام مسلم طلبہ نے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور نوٹس بورڈ پر ایک تحریر جگمگا رہی تھی ”ہم بابر سیدی سمیت ہر اس مسلم یا غیر مسلم قیدی کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہیں، جسے صرف مذہبی تعصب کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔“ میں سیر حیوں سے اترتا تو شمعون سامنے سے اپنے ساتھیوں سمیت آتا دکھائی دیا۔ ہم چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ”اچھے جا رہے ہو مسلم کاؤنسلر..... لگتا ہے، تم انہیں تمیز اور تہذیب کے کافی گڑ سکھا چکے ہو۔“ شمعون کی بات سن کر اس کے ساتھی مسکرائے۔ میں نے ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی، ”ہاں! انہیں تو سکھا چکا۔ بس اب تم لوگ ہی باقی بچے ہو۔“ شمعون مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اچانک ہال نمبر 3 کی جانب سے عجیب سے شور کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی بہت زبردست بحث چل رہی ہو۔ ساتھ ہی کچھ جوشیلے نعروں کی آواز بھی سنائی دی۔ میں تیزی سے چل کر جب تک راہ داری میں پہنچا، تب تک گیلری مسلم طلبہ سے بھر چکی تھی۔ حافظ ٹکلیل نے مجھے دیکھا تو غصے میں بھرا میری جانب لپکا۔ ”آیاں! تم نے سنا کچھ..... اس بار تو انہوں نے وہ مکروہ سازش کی ہے اور ایسی گری ہوئی حرکت کا ارتکاب ہونے جا رہا ہے اس یونیورسٹی میں کہ ہم خود اس کے درود یوار کو آگ لگا کر بھسم بھی کر دیں تو کم ہوگا۔“ ”ہوا کیا ہے.....؟“ احمر نے ایک کاغذ پھاڑ کر ہوا میں پھینکا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”یونیورسٹی انتظامیہ نے گستاخانہ خاکوں پر مبنی ایک سیمینار کی اجازت دی ہے، جسے کوئی ڈینش این جی او اسپانسر کر رہی ہے۔ وہ لوگ ہماری یونیورسٹی میں توہین آمیز خاکوں کی نمائش اور سیمینار میں تقاریر کرنے کی اجازت لے چکے ہیں، لیکن اگر ایسی حرکت کا کسی نے سوچا بھی تو ہم یہ یونیورسٹی ہی جلا کر رکھ کر دیں گے۔ چاہے، پھر ہمیں پھانسی ہی کیوں ندے دی جائے۔ چلو چل کر ایڈمن بلاک کو آگ لگاتے ہیں۔“

..... (جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

سب لڑکے چلانے لگے۔ ”ہاں ہاں..... ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، ہم سب گرفتاریاں دینے کے لیے تیار ہیں، لیکن ہم اس یونیورسٹی کے گیٹ سے کسی کو اس مقصد کے لیے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ چاروں جانب سے ایک ساتھ بولنے اور چلانے کی آوازوں نے ایک طوفانی بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ ”سیمینار کی تاریخ کیا مقرر کی گئی ہے؟“ اصرار نے ایک کاغذ میری جانب بڑھایا۔



”تاریخ کا حتمی فیصلہ ابھی باقی ہے، کیوں کہ انہوں نے پہلے مرحلے کے طور پر یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی اس مکروہ عمل کا حصہ بنانے کے لیے، انہیں اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی ہے۔ ویسے اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ متوقع ہے۔ ایک آدھ دن میں تاریخ کا اعلان بھی ہو جائے گا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلبہ کا رد عمل جاننے اور ان کے جذبات کا اُبال ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت آزمودہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے صرف سیمینار کا شوشا چھوڑ کر خود خاموشی سے بیٹھ گئے۔“ کچھ ہی دیر میں، میں تمام لڑکوں سمیت ڈین کے کمرے کے باہر راہ داری میں موجود تھا۔ ہم نے اندر ڈین سے ملاقات کے لیے پرچی بھیجی اور اب ٹپاؤے کا انتظار تھا۔ میں نے لڑکوں کو نعرے بازی سے روک رکھا۔ پہلے میں ڈین سے بات کر کے اس معاملے کا سیرا ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈین کے پی اے نے صرف مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ڈین ہونٹوں میں پائپ دبائے اپنے کمرے کے شیف سے کوئی کتاب تلاش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”آؤ مسلم کاؤنسلر..... میں بس دو لمبے مزید لوں گا۔ جانے یہ میری کتابیں ہمیشہ کون آگے پیچھے کر دیتا ہے۔ تم کتابیں پڑھتے ہو کاؤنسلر! میرا مطلب ہے نصاب سے ہٹ کر.....“ میں کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ”نہیں، زیادہ نہیں۔ مجھے تو نصاب کی کتابیں بھی دل جمعی سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا کبھی۔“ ڈین نے آخر اپنے مطلب کی کتاب ڈھونڈ لی اور کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ”نہیں نہیں، تمہیں کتاب پڑھنے کے لیے زندگی میں سے تھوڑا بہت وقت تو ضرور نکالنا چاہیے۔ کتابیں ہمیں بہت کچھ دے جاتی ہیں۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں! سوچتا ہوں، کتابوں سے رشتہ جوڑ لوں، لیکن پھر جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کتابوں کا دیا ہمیں بدل نہیں پاتا، تو پھر رُک جاتا ہوں۔ صرف صفحے پلٹنے اور وقت گزاری کے لیے کتابیں پڑھنے کو میں وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔“ ڈین نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ کتابیں ہمیں بدل نہیں پاتیں۔ کتاب سے بڑا انقلاب تو شاید کُھوک بھی نہیں لاسکتی۔“ میں نے اصرار کیا ہوا کاغذ ڈین کے سامنے رکھ دیا۔ ”دُنیا کی ہر کتاب ہمیں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے۔ اگر ہم کتاب سے کچھ سیکھتے تو کیا یہ مذہبی تعصب اب تک ہمارے اندر پنپتا.....؟ آپ نے زندگی میں سیکڑوں کتابیں پڑھی ہوں گی، لیکن آپ بھی ابھی تک مذہبی رواداری کا سبق عام نہیں کر پائے سر..... پھر کتابوں کا اثر ہم انسانوں کو بدل دیتا ہے، یہ میں کیسے مان لوں؟“ ڈین کچھ دیر کے لیے خاموش سا ہو گیا۔ ”آیاں! کچھ باتیں ہمارے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ہمیں اپنے اندر کے فیصلوں کے خلاف بھی جانا پڑتا ہے۔ شاید میں اس معاملے میں تمہاری کچھ زیادہ مدد نہ کر سکوں۔“ میں نے کاغذ ڈین کی میز سے اٹھالیا۔ ”میں یہاں آپ سے مدد مانگنے نہیں آیا، آپ کو صرف اتنا بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں آپ کے کہنے کے مطابق اپنے ساتھیوں کو ہر اُس قانون کی پاس داری کا سبق دیتا آیا ہوں، جسے یونیورسٹی کے اندر اور باہر لاگو رکھا گیا، لیکن اس بار یہ وار ہم سب کے جگر کے پار ہو چکا ہے اور اگر یونیورسٹی نے اپنا فیصلہ جلد واپس نہ لیا تو شاید اس یونیورسٹی میں ایک بھی مسلم طالب علم نہ بچے۔ وہ سب گرفتار ہو کر جیل چلے جائیں گے، لیکن جاتے جاتے نہ جانے کیا کر جائیں، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“ میں اٹھ کر جانے لگا، تو ڈین نے آواز دے کر روک لیا۔ ”میں اب بھی تم سب کو یہی مشورہ دوں گا آیاں، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ جس کے بعد تم لوگوں کو بچھڑانے کے لیے وقت بھی نہ ملے۔ اگر ڈیفنڈ این۔ جی۔ او والے آزادی اظہار کا اپنا حق استعمال کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں اس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ مسلم طلبہ چاہیں، تو وہ بھی یونیورسٹی کے قوانین کے اندر رہتے ہوئے، اُسی روز کسی دوسرے ہال میں جلسہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے پلٹ کر ڈین کو دیکھا۔ ”بات صرف اگر ایک جلسے یا سیمینار کی حد تک رہتی، تو ہم ضرور تقریر سے ان کا مقابلہ کرتے، لیکن آپ اپنی یونیورسٹی کے اندر اُن گستاخانہ خاکوں کی تشہیر کی اجازت دینے کی بات کر رہے ہیں اور یقین کریں، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“ میں بات ختم کر کے ڈین کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہ داری میں سب ہی مسلم



طلبہ اسی طرح جمع تھے، جیسا میں انہیں اندر جاتے وقت چھوڑ گیا تھا۔ سب تیزی سے میری جانب لپکے۔ ”بات ہوگئی، انتظامیہ کا کیا فیصلہ ہے.....؟“ میں نے ان سب کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ ”اس بار فیصلہ یونیورسٹی انتظامیہ کا نہیں، ہمارا ہوگا۔ ہم اُن مکروہ گستاخانہ خاکوں کی نمائش یہاں کسی صورت نہیں ہونے دیں گے اور اس جنگ کے اصول و ضوابط میں طے کروں گا۔ کیا تم سب کو مجھ پر اعتماد و اعتبار ہے؟“ سب ہی نے زور سے چلا کر کہا۔ ”ہمیں تم پر اعتبار ہے کاؤنسلر۔“ کہیں پیچھے سے پُر واک آواز آخر میں سنائی دی۔ ”اور مجھے بھی..... ہم سب کو تم پر مکمل اعتماد ہے آیان۔“ میں نے تمام لڑکوں کو شام کو بائٹل میں جمع ہونے کا کہا۔ پتا نہیں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس لڑائی کا انجام ہم سب کا آخری انجام ثابت ہونے والا ہے۔ لڑکے اپنی اپنی کلاس میں واپس چلے گئے۔ پُر واک غور سے میری جانب دیکھا۔ ”اب کیا سوچا ہے.....؟“ ”کچھ فیصلے سوچے سمجھے بغیر بھی کیے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ ازل ہی سے ہمارے ضمیر میں اک طے شدہ حالت میں گندھے ہوتے ہیں۔ میری یونیورسٹی میں موجودگی میں تو وہ یہ سب کسی صورت نہیں کر پائیں گے۔ فی الحال، تمہیں تمام مسلم لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملا کر دوسرے مذہب کی طالبات کو اس بات پر قائل کرنا ہوگا کہ یہ صرف ہمارے دین اور پیغمبرؐ کے خلاف ہی نہیں، پوری انسانیت کے خلاف ایک ایسی گھناؤنی سازش ہے، جس کے اثرات ہماری آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے رہیں گے اور اگر ایک بار مذہبی جذبات کے قتل کا یہ سلسلہ اس معاشرے میں شروع ہو گیا، تو پھر کبھی نہیں رُکے گا..... پھر کوئی دین اور کسی کا بھی مذہب اس شر سے محفوظ نہیں رہ پائے گا۔“ پُر واک نے دھیان سے میری بات سنی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، ہم سب مسلم لڑکیاں آج ہی سے یہ پیغام یہاں کی ہر طالبہ تک منتقل کرنا شروع کر دیں گی۔ تم اپنا محاذ سنبھالو، میں اپنا سنبھالتی ہوں۔“

عصر کے بعد، میں کچھ دیر کے لیے چائنا ٹاؤن بھی گیا۔ شیخ الکریم سے عبادت کا درس لینے کے بعد، میں نے انہیں آج یونیورسٹی میں ہوئے اس واقعے کے بارے میں بتایا تو ان کے چہرے پر دُکھ کے سائے لہرا گئے۔ ”جانے یہ سلسلہ رُکنے میں کیوں نہیں آتا، کبھی لفظوں سے نُشتر مچھو کر ہماری روح تک کو لبو لہان کیا جاتا تھا اور اب یہ خاکے..... میں نے اس دن بھی کہا تھا کہ اگر مسلمان فیس بک پر ہوئے اس مقابلے کا ٹھیک انداز میں بائیکاٹ جاری رکھتے، تو فوبت آج یہاں تک نہ پہنچتی۔“ میں نے شیخ سے سوال کیا۔ ”لیکن ایسی زیادہ تر حرکات کے پیچھے یہ نارویجن یا ڈینش اقوام ہی کا کوئی فرد کیوں ہوتا ہے، انہیں مسلمانوں سے کیا پر خاش ہے، جب کہ ہماری اُن سے براہِ راست کوئی دشمنی بھی نہیں۔“ شیخ الکریم نے گہری سانس لی۔ ”یہ سب مادہ پرست اور مادر پدر آزاد معاشرے ہیں۔ انہیں اخلاقیات سے بھلا کیا واسطہ، انہیں تو اکثر اوقات اپنے اصل والدین کا بھی پتا نہیں ہوتا، جب کہ مذہب، تہذیب اور اخلاقیات کا پہلا درس تو ماں باپ ہی دیتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ایسے معاشرے مذہب اور تقدس کی حرمت سے نا بلند ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کے خون میں ملاوٹ ہوتی ہے، لہذا ان سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ رہی بات، خاص طور پر اسلام کو نشانہ بنانے کی، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت پیسا کمانے کا بہترین ذریعہ اسلام کی تذلیل ہے اور انہیں یہ آسان پیسا کمانے کی یہ لت پڑ گئی ہے۔“ میں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ”پھر تو انہیں پیسا دینے والے بھی اس گناہِ عظیم میں برابر کے شریک ہوئے، لیکن انہیں ایسے کاموں کے لیے پیسا دے کر ابھارتا کون ہے؟“ ”وی، جو خود دنیا کے سامنے آ کر کھلم کھلا مسلمان اور اسلام کو زچ کرنے کا یہ مکروہ طریقہ استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ وی اُن دیکھا دشمن ہے، جو نبوتِ رسولؐ کے زمانے سے آج تک منافق اور منافقت کے کسی نہ کسی روپ میں دنیا میں موجود ہے اور یاد رہے، یہ منافق مسلمان، عیسائی، یہودی یا کسی بھی مذہب کے لہادے میں ہمارے آس پاس موجود رہتا ہے۔ وہ فقیر کا بھی بدل سکتا ہے اور کسی شہنشاہ کے روپ میں بھی اپنی شناخت چھپا سکتا ہے۔ اُسے پہچاننے کے لیے مومن کی نظر چاہیے اور دُکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے اندر کا وہ مومن ختم ہو گیا ہے۔ مسلمان کے پاس صرف بصارت رہ گئی ہے، نظر کب کی فنا ہو چکی ہے۔“

میں شیخ الکریم کی باتیں سن کر گہری سوچوں میں ڈوبا شام ڈھلے بائٹل پہنچا، تو تمام طلبہ دالان میں جمع ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں آج دن میں ڈین کے ساتھ ہوئی تمام گفتگو حرف بہ حرف سُنا دی۔ بلال نے مجھے بتایا کہ ڈینش این۔ جی۔ او والے یونیورسٹی انتظامیہ کے ساتھ مل کر اس سیمینار کو بہت بڑے پیمانے پر منعقد کروانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یونیورسٹی کا سب سے بڑا ہال، جس میں تین ہزار نشستوں کی گنجائش موجود تھی اور جسے عام طور پر صرف سالانہ کانفرنس کی تقریب منعقد کروانے کے لیے کھولا جاتا تھا، اسے اس سیمینار کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ سیمینار کی تمام نشستیں باقاعدہ ٹکٹ لگا کر بیٹی جائیں گی اور این۔ جی۔ او نے داخلہ ٹکٹوں سے حاصل ہونے والی تمام رقم یونیورسٹی انتظامیہ کو بہ طور عطیہ دینے کا لالچ بھی دے رکھا ہے، جبکہ سب ہی مسلمان طلبہ کو اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ یونیورسٹی کو یہ سیمینار منعقد کروانے کے لیے بہت بڑی رقم ضرور پیش کی گئی ہوگی۔ میرے ذہن میں شیخ الکریم کا جملہ گونجا۔ ”کوئی منافق ہے، جو پس پردہ رہ کر اپنے پیسے کے بل پر یہ تمام تخریبی کارروائیاں کنٹرول کرتا ہے۔“

لڑکوں کی بے چینی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں سیمینار کی تاریخ کا اعلان ہونے سے پہلے کوئی بھی انتہائی ردِ عمل ظاہر کرنے سے سختی سے منع کیا اور اپنے ذہنوں سے گرفتاریاں دینے کے خیال کو بھی نکال دینے کا کہا۔ حافظہ کلیل زچ ہو کر بولا۔ ”تم کیا چاہتے ہو، ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ جب تک ہم شور شرابا کر کے، ان کے حوالات نہیں بھریں گے، یہاں کا میڈیا ہماری بات کو بنیادی سے نہیں لے گا۔ یہ نہ ہو کہ اس خاموشی کو وہ ہماری نیم رضامندی سمجھ لیں اور جب تک ہم احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکلیں، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔“ میں نے اطمینان سے کلیل کی تمام بات سنی۔ ”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح خود کو گرفتار کرو کر تم انہیں اُن کے مقصد میں کامیاب ہونے سے روک لو گے؟ اس مرحلے پر تو وہ خود چاہتے ہوں گے کہ ان کے مقابلے پر مسلمان طلبہ کی نفری جتنی کم ہو، اُتنا ہی اچھا ہے۔ اس وقت ہماری سب سے زیادہ ضرورت اسی کیمپس میں ہے۔ فی الحال تم سب متحد رہو اور اس دشمن کی اگلی چال کا انتظار کرو، جو ہمیں ابتداء ہی میں جذبات کی رو میں بہکا کر ہماری طاقت توڑ دینا چاہتا ہے۔“ میں نے لڑکوں کے چہرے پر عارضی اطمینان کی جھلک تو دیکھ لی، لیکن جانتا تھا کہ یہ سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگلے روز بارشیدی کی پیشی تھی۔ ہم سب کو امید تھی کہ اسے ناکافی شہادت اور کم زور شہوت کی بنیاد پر رہائی نہیں، تو کم از کم ضمانت ضرور مل جائے گی، لیکن زوردار بحث کے باوجود جج نے نہ صرف اس کی ضمانت رد کر دی، بلکہ اگلی پیشی تک اُسے جیل منتقل کرنے کا فیصلہ بھی سُنا دیا۔ بابر کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ میں نے عدالت میں کمرے کے باہر دو لمحوں کے لیے اُس سے بات کی۔ ”تم فکر نہ کرو، ہم کوئی دوسرا وکیل کریں گے۔“ بابر نے دھیرے سے کہا۔ ”دوسرا وکیل کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، کہیں سے دوسرا مقدر لاؤ۔“ ایسا کیوں کہہ رہے ہو، اتنا مایوس تو میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔“ بابر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مایوس نہیں ہوں، لیکن خوش فہم بھی نہیں۔ اس وقت یہ لوگ مجھے رہا کرنے کا رسک نہیں لیں گے، کیوں کہ نیویارک کی فضا روزانہ مزید تناؤ کا شکار ہو رہی ہے اور یونیورسٹی انتظامیہ نے عدالت کو کسی نہ کسی طور پر یقین دلایا رکھا ہے کہ مجھ جیسے ”اسلام پرست“ طالب علم کا اس وقت باہر آنا کسی بڑی تحریک کا باعث بن سکتا ہے، لیکن وہ سب شاید یہ بھول گئے ہیں کہ تمہاری صورت میں مسلم طلبہ کی سب سے بڑی تحریک تو ان کے درمیان ہی موجود ہے۔ مجھے بلال اور احمر سے یونیورسٹی کیمپس کی خبریں ملتی رہتی



ہیں۔ تم بہت خوبی سے یہ ذمہ داری نبھار رہے ہو دوست، ہم سب کی ہر امید اب تم ہی سے وابستہ ہے آیان۔“ باہر مجھے گلے لگا کر پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا، لیکن مجھے ذمہ داری کی ایک نئی زنجیر میں باندھ گیا۔ دوسروں کی ہم سے بندھی ”آس“ سے بڑی زنجیر اور کیا ہوگی بھلا۔ قید صرف چند دیواروں کے پیچھے کسی کو بند کر دینے ہی کا تو نام نہیں۔ کبھی کبھی اس چار دیواری سے باہر چلتے پھرتے انسان، کسی جیل سے کہیں زیادہ مقید ہوتے ہیں۔ عدالت کی بیرونی سڑک پر مجھے احمر نے عامر بن حبیب کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں بروکلین کے علاقے میں پہنچا تو عامر کی رہائش گاہ کے آس پاس بہت دیر یوں ہی بے مقصد بایک گھماتا رہا، تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک آ بھی گیا ہے، تو میری ہمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ ویسے بھی سی۔ آئی۔ اے کے آفسر فورڈ سے ملاقات کے بعد مجھے ہر وقت شبہ سار جتا تھا کہ جیسے کوئی ان دیکھی آنکھ میری نگرانی کر رہی ہے۔ میں نے اپنی بایک سڑک کی دوسری جانب واقع شاپنگ پلازہ کی پارکنگ میں کھڑکی کر دی اور پھر کچھ دیر شاپنگ سینٹر میں چہل قدمی کے بعد، سڑک پار کر کے دوسری جانب اپارٹمنٹس کی لفٹ میں داخل ہو گیا۔ اس روز عامر مجھے کچھ پریشان دکھائی دیا۔ ”آیان! یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ابھی فیس بک والا معاملہ ٹھنڈا بھی نہیں پڑا تھا کہ یہ سیمینار کا قصہ شروع ہو گیا۔ مجھے یہ سب کسی ایک ہی سازش کی کڑیاں لگتی ہیں۔“ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”تم فکر نہ کرو، اُن کا کام سازشیں کرنا اور ہمارا فرض ان سازشوں کا توڑ ہے۔ یہ ایک مستقل جنگ ہے، جس کا کوئی اختتام نہیں۔ صرف فوجیں بدلتی رہیں گی اور نئے سپہ سالار آتے جاتے رہیں گے، لیکن لڑائی ہمیشہ جاری رہے گی، لہذا ہمیں خود کو پہلے ہی سے ہلکان کر کے اُن کا کام آسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا وار وہ کریں گے، ویسا توڑ ہماری طرف سے ہوگا۔“ عامر چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ”کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی آیان ہے، جو دو مہینے پہلے ہمارا نام بھی نہیں سننا چاہتا تھا، لیکن تُم نے اپنا گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ بسام بہت سمجھ دار اور سنجیدہ ہوا لڑکا ہے۔ اگر وہ ہمیں غلط سمجھتا ہے، تو اس میں اس کا ایسا کچھ قصور بھی نہیں۔ ہمارا وقت ہی خراب چل رہا ہے۔“ پھر جیسے عامر کو کچھ اور یاد آیا۔ ”اور ہاں! اُنہ وائے بھی اس معاملے میں اپنے آپ کو خوب ثابت کیا ہے۔ مجھے احمر نے بتایا ہے کہ اُس نے بہت سی طالبات کو مذہب کی تخصیص کے بغیر اس بات پر قائل کر لیا ہے کہ یہ خاگوں کا معاملہ صرف اسلام کا نہیں، ہر اس شخص کا معاملہ ہے، جو خُدا کی وحدانیت اور وجود کا قائل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اُنہ وائے اس قافلے کی بہترین رہبر ثابت ہوگی۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں اور پھر اُنہ وائے خیر خان کی قائل کرنے کی صلاحیت سے تو سب ہی واقف ہیں۔“ عامر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ”ہاں! اُس کی اسی صلاحیت نے تو اُسے ہمارے گروپ کی سب سے فعال خاتون ممبر بنا رکھا ہے۔ اور.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔ ”اور وہ تم سے ایک خاص اُنسیت بھی رکھتی ہے آیان..... ایسے ہم سفر کو کبھی کھونے نہ دینا۔“ میں نے چونک کر عامر بن حبیب کی آنکھوں میں جھانکا۔ گویا اُسے بھی ان معاملات کی کچھ سُن گئی تھی۔ اچانک میری زبان سے وہ بات پھسل گئی، جسے عام حالات میں شاید میں کبھی لفظوں کی شکل نہ دیتا۔ ”کہیں تم بھی کسی ایسے قیمتی ہم سفر کے کھو جانے کے تجربے سے تو نہیں گزرے؟“ اس بار چونکنے کی باری عامر کی تھی۔ ”تمہارے کمرے کے شیلٹ میں ایک کتاب کی ورق گردانی کے دوران کسی ماریا کی تصویر ملی تھی، لیکن تم اگر میرے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہو، تو کوئی بات نہیں۔ یہ تمہارا نہایت ذاتی معاملہ ہے۔“ عامر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے، لیکن اس نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ ”نہیں آیان..... تمہارے سامنے میرا کچھ ذاتی نہیں۔ بس میں خود ہی ان یادوں کی چنگاریوں کو وقت کی راکھ میں دبائے رکھنا چاہتا تھا، لیکن آج تم نے پوچھا ہے، تو تمہیں اپنے اندر کے یہ داغ ضرور دکھاؤں گا۔“ عامر نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے کچھ وقت لیا۔ دل کے کمرے میں بکھری یادیں سینٹا بڑا مشکل کام ہے۔ ”یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب میں ریاض سے گریجویشن کے لیے قاہرہ یونیورسٹی آیا تھا۔ میرے ہر انداز سے میرے بڑے خاندان کی جاہ و شہمت ٹپکتی تھی اور میں اپنے یونیورسٹی کے ساتھیوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنی دولت بے تحاشا ضائع کرتا تھا۔ ہاسٹل میں میرے پاس ایک نہیں، تین تین مرسلز اور بی۔ ایم۔ ڈبلیو کاریں رہتی تھیں اور میں صرف نمائش کے لیے روزانہ گاڑی بدل کر یونیورسٹی جاتا۔ میرا روزانہ کا ہزاروں ڈالر کا بدلا جانے والا لباس کسی غریب طالب علم کے پورے سال کے خرچے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا۔ بات بے بات پوری یونیورسٹی کو ٹریٹ دینا یا پھر اُن کے کسی بھی تفریحی پروگرام، پکنک یا کسی دوسری مصروفیت کا تمام خرچہ خود اٹھالینا، میرا معمول بن چکا تھا اور جس لمحے بھی میں یونیورسٹی کے کیفے یا میس میں داخل ہو جاتا، اس وقت سے لے کر میرے وہاں سے اُٹھنے تک، ہر کسی کا بل میرے ہی ذمہ ہوتا۔ دراصل اس نمائش اور خود پسندی کی تعلیم بھی، مجھے اپنے گھر ہی سے ملتی تھی کہ زیادہ تر عرب روساء ایسی ہی ظاہر پرستانہ زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک مقولہ بہت مشہور ہے کہ ”گھر میں اگر سونے کا کنواں بھی بہتا ہو تو باہر والوں کو اس کی کیا خبر.....؟“ لہذا ہم اپنی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا، جب میں کیفے میں اپنے دوستوں کے ساتھ داخل ہوا اور میرے ایک دوست نے حسب معمول کیفے کے منیجر کو سب حاضرین کا بل میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا، جس میں میرا اسٹاف ہر ماہ ایک خطیر رقم پہلے ہی جمع کرا چکا ہوتا تھا، لیکن کچھ ہی دیر بعد کاؤنٹر پر کسی بحث کی آواز سنائی دی اور منیجر نے مجھے بتایا کہ سال دوم کی کوئی ماریانا می لڑکی اپنے سینڈویچ اور کوک کا بل خود ادا کرنا چاہتی ہے، کیوں کہ اُسے میری یہ مہربانی قبول نہیں۔ شاید یہ بات ہمیشہ کے لیے وہیں ختم ہو جاتی، اگر کچھ دیر بعد ماریا خود میرے سامنے نہ آ کھڑی ہوتی۔ ”مجھے آپ کی پیش کش ٹھکرانے کا بہت افسوس ہے یاسیدی، لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اگر روزانہ لکائی جانے والی اس رقم سے یونیورسٹی کے اُن غریب طلبہ کے لیے کوئی اکاؤنٹ کھول دیں، جنہیں اپنے ہر سمسٹر کی فیس بھرنے میں شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو یقیناً جانیں، یہ بہت بڑی نیکی ہوگی اور واضح رہے کہ میں اُن طلبہ میں شامل نہیں ہوں، کیوں کہ میں اپنی فیس خود بھر سکتی ہوں۔“ اُس کے چہرے کے گرد سیاہ اسکارف سے جھلکتے ٹوکا ایک ایسا ہالہ تھا، جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بات ختم کر کے اطمینان سے چلتی بنی، لیکن میں اُس معصوم می لڑکی کے خُسن میں الجھ کر رہ گیا، حالاں کہ میرے ارد گرد میری دولت کی وجہ سے حسین چہروں کا ایک ٹھمرٹ موجود رہتا، لیکن اُن کے بے باک خُسن میں بھلا وہ رُعب، وہ سادگی، کشش اور ٹوکہاں، جو اس سیدھی سادی، خود کو سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی لڑکی کی ایک جھلک میں تھا اور پھر مجھ پر جیسے ایک دُھن سی سوار ہو گئی۔ ماریا شعبہ جیالوجی کی طالبہ تھی اور اب میں صبح و شام اس شعبے کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا، تاکہ کسی بہانے اُس سے مزید بات چیت کا موقع مل جائے۔ تین چار دن تک وہ مجھ سے صرف ہیلو ہائے کر کے آگے بڑھ جاتی، لیکن پھر ایک دن وہ کچھ دیر کے لیے رُک گئی۔ ”کیا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے عامر.....؟“ میں نے جھٹ سے کہہ دیا۔ ”اتنے دن، تم سے متعلق کوئی کام ڈھونڈنے ہی میں تو ضائع کر ڈالے ہیں میں نے۔“ اور وہ میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑی۔ کتنی مقدس ہنسی تھی اُس کی، پھر ہم دونوں میں خوب دوستی ہو گئی۔ مجھے تو ویسے بھی پڑھنے لکھنے سے کچھ خاص غرض نہیں تھی، لیکن وہ اپنی تعلیم کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھی۔ میں دن بھر اس کے شعبے کے باہر اس کا انتظار کرتا اور وہ کلاس ختم ہونے کے بعد روز مجھ سے آکر ملتی۔ ہم نے قاہرہ کی کوئی سڑک، کوئی پارک، کوئی اچھا کیفے نہیں چھوڑا، جہاں بیٹھ کر گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات نہ کی ہو۔ اُسے ہر شعبے پر مکمل دسترس حاصل تھی اور اس کے خیالات نہایت پاکیزہ تھے۔ وہ تمام وقت خود کو ایک خاص پردے کی حد تک ڈھکے رہتی اور اس نے اپنی ہر حد آپ مقرر کر رکھی تھی، چند ہفتوں ہی میں، میں اس کا اس قدر عادی ہو گیا کہ اب مجھے زندگی اس کے ہٹا بے مقصد نظر آنے لگی تھی، تب مجھے اپنے اندر ماریا کے لیے پلٹے ہوئے اس خوب صورت احساس کا ادراک ہوا، جسے لوگ محبت کا نام دیتے ہیں۔ ہاں! وہ محبت ہی تھی، لیکن ہدایت کے آخری درجوں کو چھوٹی ہوئی۔ میرے دوست، میرے مشاغل سب مجھ سے رفتہ رفتہ ترک ہو چکے تھے اور اب صرف ماریا ہی میری گُل کائنات تھی، لہذا میں نے اُسے شادی کی پیش کش کا سوچ لیا اور وہ ایک ایسی ہی جاتے اکتوبر کی سرد شام تھی، جب میں نے ماریا کو اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ میری بات سُن کر کچھ خاموشی ہو گئی اور پھر بہت دیر بعد اُس نے سراٹھایا۔ ”نہیں عامر..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔“ میں چیخ پڑا۔ ”لیکن کیوں؟“ اُس نے اپنے بیک سے ہائیل نکال کر میز پر رکھ دی۔ ”کیوں کہ میں عیسائی ہوں۔“..... (جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

عامر بن حبیب سے ماریا کے عیسائی ہونے کی بات سن کر میرے ہاتھ سے کافی کامگ کرتے گرتے بچا۔ ”کیا، وہ عیسائی تھی، لیکن..... میرا مطلب ہے؟“ عامر کہیں دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔ ماریا کی بات سن کر میرا تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ چند لمحے تو میں کچھ بول ہی نہیں پایا۔ وہ جس کتاب کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھتی اور جو کتاب اس کے بیگ میں ہر لمحہ کسی مقدس نشانی کی طرح بچی رہتی، میں اسے قرآن سمجھتا رہا، لیکن وہ بائبل کا نسخہ تھا۔ ماریا کے حلیے اور اس کی خود پر لگائی پابندیوں کو دیکھ کر میں تو کیا کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ دراصل ہم دونوں نے کبھی مذہب کو موضوع گفتگو بنایا ہی نہیں تھا۔ میں خود تو مذہب سے کوسوں دور رہا۔ لہذا میرے پاس مذہب پر بحث کا وقت ہی کہاں تھا اور خود ماریا نے کبھی اپنا مذہب ظاہر نہیں کیا۔ ماریا نے اس روز مجھے بتایا کہ وہ عیسائیوں کے بیٹنی کا سٹ قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، جواب بھی روایتی پردے اور عیسائیت کے تمام مروجہ اصولوں کی پابندی کرتا ہے اور ان کے ہاں بھی



حرام، حلال کی تمیز کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ماریا اپنی بات ختم کر کے وہاں سے چلی گئی، لیکن میں جانے کتنی دیر گم صم و ہیں بیٹھا رہا۔ اب مجھے دھیرے دھیرے ماریا کی گاہے بگاہے عیسائیت اور عیسائی قوم کے تعارف اور اچھائیوں کے بارے میں کی جانے والی گفتگو یاد آنے لگی تھی۔ اس نے تو کبھی شعوری طور پر اپنا مذہب چھپانے کی کوشش کی ہی نہیں تھی۔ یہ میں ہی تھا، جو اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ ایک دوروز میں اسی کشمکش میں پورے قاہرہ میں بھٹکتا رہا اور پھر ایک عجیب سے احساس نے میرے وجود میں اپنے پیچھے گاڑنا شروع کر دیے۔ کیا ہوا، اگر وہ کسی کٹر عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اہل کتاب تو تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے والدین اس فیصلے کے بعد مجھے اپنی تمام جائداد اور وراثت سے ہمیشہ کے لیے عاق کر دیں گے، لیکن محبت کی وراثت تو صرف محبت ہی ہوتی ہے۔ اسے اس دنیاوی دولت جائداد اور جاہ و چشم سے کیا مطلب۔ محبت کے لیے تو شہنشاہوں نے تخت چھوڑ دیے، تو کیا میں صرف اپنی چھوٹی سی سلطنت کی قربانی بھی نہیں دے سکتا۔ اس فیصلے نے جیسے مجھے ہر لگا دیے اور میں اڑتے ہوئے ماریا کے پاس اس کے ہاسٹل پہنچ گیا۔ میں نے بنا کسی تمہید کے ماریا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا کہ میں اس کی محبت میں اب اس مقام پر ہوں، جہاں ذات، مذہب، قبیلہ کوئی معنی نہیں رکھتا، لہذا میں اب بھی اس سے شادی کا خواہش مند ہوں، لیکن ماریا کا جواب اب بھی انکار ہی نکلا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس وجہ سے مجھے قبول کرنے سے ہچکچا رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اس قابل نہیں یا اس کی زندگی میں کوئی اور ہے، تو وہ رو پڑی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے دل کے کواڑ زندگی میں صرف ایک ہی شخص کے لیے کھلے اور وہ صرف میں ہوں، لیکن وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی، کیوں کہ اس کا مذہب اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا، البتہ اب وہ اپنی زندگی میں کسی دوسرے مرد کی چھایا تک برداشت نہیں کرے گی، لہذا اس نے تمام عمر تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ پوری شام میرے سامنے بیٹھی روتی رہی اور میں اسے سمجھاتا رہا کہ مجھے اس کے مذہب اور قبیلے سے کوئی غرض نہیں۔ وہ شادی کے بعد بھی عیسائی ہی رہے گی اور میں اسے اپنے رستے پر چلنے کے لیے ہرگز مجبور نہیں کروں گا، لیکن اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے کہ مذہب اس کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ میں رات گئے ٹوٹے قدموں کے ساتھ ماریا کے ہاسٹل سے اٹھ آیا۔ اگلے چند دن میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میرا ماریا سے سامنا نہ ہو، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ خود ماریا مجھ سے بھی بڑے عذاب سے گزر رہی ہے اور محبت کا نیلا زہر اس کی رگوں میں بھی آخری سانس تک پھیل چکا ہے۔ محبت اسے جینے نہیں دیتی تھی اور مذہب مرنے سے روکتا تھا۔ پانچویں روز وہ خود مجھ سے ملنے آئی، تو برسوں کی مڈ حال اور بیمار لگ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس دن مجھے خود اپنی محبت کی طاقت پر فخر محسوس ہوا کہ اگر میں اس کی محبت میں جل کر رکھ ہو چکا ہوں، تو وہ بھی سلگ سلگ کر دھواں ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر چپ چاپ میرے سامنے بیٹھی رہی، پھر اس نے آخر کار یہ اقرار کر لیا کہ وہ بھی میرے ہناؤ جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی محبت کی فتح بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ میں نے ماریا سے کہا کہ میں تو پہلے ہی اپنی تمام کشتیاں جلا کر عشق کے اس جزیرے پر اترا ہوں، لہذا میری واپسی کے راستے تو ابتداء ہی سے مسدود ہیں۔ ماریا چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”عامر! مجھ سے شادی کلو، لیکن اس کے لیے تمہیں عیسائیت کو اپنے مذہب کے طور پر اپنانا ہوگا، بولو، تم میرے لیے یہ کر سکتے ہوں.....؟“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں تو پہلے ہی تمہاری خاطر اپنا گھریار، دھن دولت، رتبہ اور مقام ترک کر چکا ہوں۔ پھر یہ مذہب کی آخری پونجی تمہیں کیوں درکار ہے؟“ ماریا سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ”تمہارے پاس سب کچھ ہے عامر، لیکن میرے پاس میرے مذہب کے سوا اور کچھ نہیں اور پھر تم خود ہی تو کہتے ہو کہ تم نے کبھی خود کو ان مذہبی دیواروں کے اندر قید نہیں سمجھا، نہ ہی تم اسلام کو ایک پکے مسلمان کی طرح برستے ہو۔ تو پھر تمہیں خود کو عیسائیت میں ڈھالنے میں زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ میرے پاس اپنے اور تمہارے اس لازوال درد اور عمر بھر کی جدائی سے چھٹکارے کا بس یہی ایک طریقہ بچا ہے، لیکن یہ راستہ تمہارے مذہب کی ہنگامی سے ہو کر گزرتا ہے۔“



میں عامر کی کہانی یوں دم سادھے سن رہا تھا، جیسے میری ذرا سی بھی جنبش اس طلسم کو کرچی کرچی کر دے گی، لیکن عامر بن حبیب، ماریا کی گزارش سنا کر یوں خاموش ہو گیا، جیسے اس کی داستان وہیں ختم ہو گئی ہو۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”پھر..... پھر تم نے اس سے کیا کہا.....؟“ میں اسے اس وقت کوئی جواب دیے بنا ہی الجھا ہوا سا وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ سچ یہی ہے کہ ماریا کی اس بات سے پہلے میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میں اگر مسلمان نہ ہوتا، یہودی یا عیسائی بھی ہوتا، تو مجھے کیا فرق پڑ جاتا، میرے اعمال، میرا کردار، میرا لباس اور میرا رہن سہن تو کسی طور مسلمانوں جیسا نہ تھا، میں تو بس ایک برائے نام اور صرف ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اور کشمکش نے مجھے آگھیرا۔ ذہن کہتا تھا کہ شادی کی حد تک اپنے اوپر کسی بھی مذہب کا لبادہ اوڑھ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں کون سا دل سے اپنے مذہب سے منحرف ہونے جا رہا ہوں۔ ایک بار ماریا میری زندگی میں آ جائے، تو پھر اسے بتا دوں گا کہ میں نے صرف زبان سے مذہب بدلنے کی حامی بھری تھی، ورنہ اندر سے میں اب بھی مسلمان ہوں، لیکن میرا دل اس سودے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ایسا کر کے میں اپنے ساتھ ہی نہیں، اپنے خدا اور مذہب کے ساتھ ساتھ ماریا کو بھی دھوکا دوں گا، پھر میں نے سوچا کہ مصر کے کسی جید عالم سے اس بارے میں کوئی فتویٰ لے لوں کہ صرف زبانی کلامی مذہب پر ایمان لے آنے سے اپنے اصل مذہب پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا، جب کہ دل میں یہ نیت بھی شروع دن ہی سے طے شدہ ہو کہ میں حقیقتاً اپنا مذہب ترک نہیں کروں گا اور مناسب وقت آتے ہی دوبارہ اپنے مذہب کی جانب لوٹ آؤں گا۔ اتفاق سے انہی دنوں قاہرہ میں شیخ الکریم کے لیکچر کا بڑا شہرہ تھا۔ سو، میں بھی ایک دن ہمت کر کے مصر کی بڑی جامع مسجد پہنچ گیا اور شیخ کا لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا، خوش نصیبی سے اس روز شیخ کا لیکچر بھی میرے مسئلے سے کچھ ملتا جلتا ہی تھا۔ میں نے شیخ کو کہتے سنا کہ ”ہم مسجد کے حاضرین میں سے اس وقت پیش تر، بلکہ شاید تمام ہی اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، گویا ہم پر اللہ کا خصوصی فضل و کرم تو ہماری پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ذرا سوچیے، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جو کسی غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہو کر اپنی کوشش اور سچ کے حصول کی خاطر اسلام کی جانب آ سکتے تھے۔ اللہ نے ہمیں اس عظیم امتحان سے بچایا ہے، تاکہ ہمارا مزید وقت ضائع نہ ہو۔ ہمیں کائنات کے سب سے عظیم مذہب اور عظیم امت میں پیدا کر کے اس نے ہمیں ”چنا ہوا“ (Chosen-one) ثابت تو کر دیا، لیکن آج آپ سب اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے سوال کیجیے کہ کیا ہم واقعی خود کو اس اعزاز کا حق دار ثابت کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنی ذات کی خامیوں سمیت اس قابل تھے کہ ہمیں یہ انعام دیا جاتا۔ ہمیں دوسرے مذاہب کی نسبت ابتدا ہی سے ایمان بخش کر ہمارا جو وقت سچ کی کھوج میں ضائع ہونے سے بچایا گیا ہے، کیا ہم واقعی اس وقت کا حق ادا بھی کر پائے ہیں یا نہیں۔ ہم سے تو لاکھ درجہ بہتر وہ نو مسلم ہے، جو چالیس پینتالیس سال کی عمر اس ایمان کی کھوج میں در بدر بھٹکتا ہے اور پھر ایک دن کائنات کے خالق کا راز جان کر ایمان لے آتا ہے اور..... اپنے خدا اور پیارے نبی کی یاد میں جٹ جاتا ہے۔ ہم تو اپنی آدمی عمر اس تسلی کے ساتھ ضائع کر دیتے ہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے، جب بڑھاپا آئے گا، تب دیکھا جائے گا۔ مجھے آپ سب میں سے کوئی ایک آج اس بات کی ضمانت دے دے کہ وہ واقعی اپنا بڑھاپا دیکھ پائے گا، چلیں بڑھاپا تو بہت دور کی بات ہے، آپ میں سے کوئی مجھے اتنا ہی یقین دلا دے کہ میں اس منبر سے اپنا دوسرا قدم نیچے رکھنے تک سانس لیتا رہوں گا۔ جب ہم سب جانتے ہیں کہ یہ عالم اس قدر ناپائیدار ہے تو پھر یہ جنت کیوں؟ ہم ہر لمحے کو کسی آخری لمحے کی طرح مہلت جان کر اپنے اللہ کی جانب رجوع کیوں نہیں کر لیتے۔ دنیا کے پھندے بڑے دل کش اور دل فریب ہیں دوستو، ہم میں سے کوئی بھی ان کی دل پزیری سے انکار نہیں کر سکتا، لیکن سچ یہی ہے کہ یہ دنیا ایک بہت بڑا دھوکا ہے اور ہم سب جو آج یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ یہ جان لیں کہ ہمیں ہمارے اللہ نے ایک اور موقع عطا کیا ہے اور شاید یہ آخری موقع ہو، کیوں کہ کون جانے اگلی نماز تک بھی ہم میں سے کتنوں کو یہ مہلت ملتی ہے، تو کیوں نہ ٹھیک اسی لمحے اپنے ماضی کے ہر گناہ سے تائب ہو کر خود کو اپنے رب کے سپرد کر دیں۔“

عامر نے بات کرتے کرتے پہلو بدلا تو مجھے اس کی آنکھیں نم ہوتی دکھائی دیں۔ عامر نے بات جاری رکھی۔ ”شیخ کا لیکچر ختم ہوا، تو میرے اندر بہ یک وقت کئی طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں جو وہاں اس کے سامنے اپنے ایمان کو چند روز کے لیے گروی رکھنے آیا تھا، اپنے ایمان کے سوا باقی سب کچھ لٹا بیٹھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے قدرت نے اس روز شیخ الکریم کا وہ بیان صرف میرے لیے ان کی زبانی جاری کر دیا تھا، کیوں کہ میرا ایمان بھی تو ایسی ہی دی گئی ایک مہلت کا شاخسانہ تھا اور اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ جس عرصے میں، میں ماریا کو پانے کے لیے عارضی طور پر اپنا مذہب بدل کر ”دھرپے“ کا روپ دھار لیتا، ٹھیک اسی دوران میری روح قبض نہیں کی جائے گی۔ اور اگر اس دوران میری موت ہو جاتی، تو میں اس فضل و کرم کے انعام سے بھی محروم رہ جاتا، جو اللہ نے میری پیدائش ایک مسلم گھرانے میں کر کے مجھ پر عنایت کیا تھا اور کچھ نہ سہی، مسلمان کا نام اور پڑھے گئے اس کلمہ وحدانیت کا آسرا ہی سہی۔ روز آخر، کہیں کسی فہرست میں آخری صفحے پر میرا نام تو ہوگا۔ شاید وہ برائے نام مسلمانوں کی فہرست میں چھپا ہوا میرا نام ہی میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ میں جتنا سوچتا رہا، اسی قدر میرے جسم پر لرزہ طاری ہوتا گیا اور پھر جب مسجد خالی ہوئی اور شیخ کی نظر مجھ پر پڑی، تو میں کوئی اور عامر بن حبیب بن چکا تھا۔ وہ عامر بن حبیب، جو اپنی محبت کی خاطر اپنے مذہب کو گروی رکھنے آیا تھا، وہ اپنی محبت سمیت اپنا سب کچھ دان کر کے صرف اپنا گروی ایمان چھڑا کر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے شیخ کو الف تائی تمام بات بتا دی۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پھر سے چھ کلمے اپنے پیچھے دہرانے کی ہدایت کی اور جب میں مسجد سے باہر نکلا، تو صرف میرا ایمان میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسی شام ماریا کو قاہرہ کے اس پُر سکون کیفے میں بلایا، جو شہر سے کچھ باہر دور ویہ درختوں کی ایک قطار کے سائے تلے موجود تھا اور ہماری ملاقات کا پسندیدہ مقام بھی۔ کیفے کی دوسری جانب جو پانی کا جھرنابہہ کر ایک لمبی سی نالی کا رخ اختیار کر لیتا تھا، اس پانی کے بہنے کی آواز ہماری بہت سی خاموشیوں کی گواہ بھی تھی۔ اُس روز بھی اس رخ بہتے ہوئے جھرنے کے پانی کی رم جھم ہمارے اطراف کی خاموشی کو مزید خاموش کر رہی تھی، لیکن خود میرے اندر ایک طوفان کا شور موجود تھا۔ میں نے ماریا کو اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ میں اپنی محبت کی خاطر اپنے ایمان کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں عمر بھر ماریا ہی سے محبت کرتا رہوں گا اور آخری سانس تک میرا دل اسی کے لیے دھڑکے گا، مگر میں اپنا مذہب ترک کر کے اس کا ہاتھ نہیں تھام سکتا۔ اُس روز میں اور ماریا بہت دیر تک روئے..... کبھی میں نے اسے تسلی دی اور کبھی اُس نے میری ہمت باندھی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سچے تھے اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے ساتھ جھوٹ بول کر اسے حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری ماریا سے آخری ملاقات تھی۔ میں ماریا کے لیے اس روز شیخ الکریم کا دیا ہوا چھوٹا خوب صورت جلد والا قرآن کا نسخہ بطور تحفہ لے کر گیا تھا، جسے ماریا نے اپنی آنکھوں سے لگا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور اپنی بائبل، جسے وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے پھرتی تھی، میرے حوالے کر دی۔ میرے پاس اب بھی ماریا کا دیا ہوا وہ تحفہ موجود ہے آج.....“ میں نے عامر بن حبیب کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر اٹھا کر شلیف میں دیکھا تو کالے کور والی بائبل کا ایک نسخہ وہاں سجا ہوا تھا۔ عامر نے گہری سانس لے کر اپنی بات ختم کر دی۔ ”اس روز کے بعد میری ماریا سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ماسٹرز کے لیے یہاں نیویارک چلا آیا اور سنا ہے، وہ دوبارہ اپنے آبائی شہر سینٹ لوئس لوٹ گئی۔“ کمرے میں گیمیری خاموشی چھا گئی۔ صرف آتش دان میں جل کر چلتی ہوئی لکڑیوں کی آواز باقی تھی۔ میں اور عامر دونوں، اس وقت کسی ایسے چھوٹے سے جزیرے کے باسی لگ رہے تھے، جس کے ارد گرد کی تمام زمین سمندر کھا چکا ہو اور اب ان کے پاس صرف اتنی ہی جگہ باقی



ہنسی ہو، جس پر وہ دونوں اپنے گھٹنوں کو سینوں سے جوڑ کر دم سادھے بیٹھے صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہوں کہ کب پانی کی کوئی بڑی لہر، یہ مٹھی بھر زمین بھی ان سے چھین کر انہیں سدا کے لیے غرق آب کر جائے۔ میں نے کمرے سے نکلنے سے پہلے عامر سے ایک آخری سوال پوچھا۔ ”تو کیا تم نے یا ماریا نے کبھی ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی، دل میں ایمان رکھتے ہوئے بھی تو ایک ”سکنت پارینہ“ کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کی جاسکتی تھی؟“ عامر اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ”نہیں! کچھ رشتے ملاقات کے تکلف سے ماورا ہو جاتے ہیں، اب ہمیں شاید کسی ملاقات کی ضرورت ہی نہیں رہی، کیوں کہ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم اب ملیں، چاہے نہ ملیں، عمر بھر ایک دوسرے کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔“

میں دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ اس روز نیویارک کا آسمان بھی عامر اور ماریا کی یاد میں نیر بہانے پر تلا ہوا تھا۔ میں بایک لے کر مرکزی سڑک پر آیا، تو بوندوں نے میرے آنسوؤں کا روپ دھار لیا۔ پھر وہی محبت، میں نے ایک جھرجھری لی۔ مجھے جینی کی بددعا یاد آئی، ”خدا کرے جب تمہیں محبت ہو، تو ایسی ہو کہ اس کا کانپانی بھی نہ مانگے۔“ میری بایک تیزی سے نیویارک کی سنان سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں بارش تیز ہونے سے پہلے جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ پہنچنا چاہتا تھا، جہاں رات تین بجے شیخ الکریم کی فلائٹ تھی۔ وہ آج نیویارک سے رخصت ہو رہے تھے۔ ایئر پورٹ پر مسلم طلبہ کا ایک ہجوم انہیں رخصت کرنے کے لیے جمع تھا۔ سب نے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور گلدستے تھام رکھے تھے۔ شیخ الکریم کی فلائٹ کا اعلان ہو چکا تھا اور وہ سب سے گھل مل کر رخصت ہو رہے تھے۔ وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے ان سے کہا۔ ”میں آپ کے لیے پھول نہیں لاسکا، دراصل مجھے ”الوداع“ کا ایسا کچھ تجربہ نہیں ہے، لیکن اب پشیمان ہوں۔“ وہ مسکرائے اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک گلاب کا پھول میری جیکٹ کے کالر میں سجادیا۔ ”یہ الوداع نہیں، ابتدا ہے۔ ایک نئے رشتے کی ابتدا۔ اور اگر پھولوں کی رسم ان مواقع کے لیے ضروری ہے تو یہ لو، میں نے تمہارے کالر میں پھول سجا کر یہ فرض بھی نبھادیا۔ ہاتھوں میں پھول ہوں یا نہ ہوں، دل کا گلاب سدا کھلا رہنا چاہیے۔“ میں نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ ”مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت رہے گی، آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیا کروں۔“ شیخ نے کاغذ کے پرزے پر ایک نمبر لکھ کر میرے حوالے کیا۔ ”یہ میرا موبائل نمبر ہے، عبادت اور تلاوت کے اوقات کے علاوہ کھلا رہتا ہے، لیکن میسج نہ کرنا، مجھے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔“ وہ مسکرا کر اور مجھے سینے سے لگا کر آگے بڑھ گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں ایئر پورٹ لاؤنج کی بھیڑ میں کھو گئے۔ اچانک مجھے اپنے گالوں پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا، تو واقعی آنسو تھے۔ میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس موجود سب ہی طلبہ شیخ الکریم کے اس الوداع پر رو رہے تھے۔ مجھے ان سب کے جذبات کا احساس تو ہمیشہ سے تھا، لیکن میں خود اپنے اوپر حیران تھا۔ آیان نے خود کو ہمیشہ کے لیے ایسی کسی بھی جذباتیت سے مبرا سمجھ رکھا تھا، پھر آج وہی آیان احمد اپنے آنسوؤں پر قابو کیوں نہیں رکھ پایا۔ کبھی کبھی ہمیں اپنے اندر آتے انقلاب کی خبر سب سے آخر میں ہوتی ہے۔ میں جب ایئر پورٹ سے واپس ہاسٹل پہنچا تو صبح کا سویرا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا، لیکن تیزی سے ہوتی بارش میں انکا دکھ برف کے گالے بھی شامل ہو چکے تھے۔

اس روز یونیورسٹی کی فضا سخت کشیدہ تھی، مسلم طلبہ و طالبات نے متوقع ڈینش سیمینار کے پیش نظر کلاسز کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ مجھے احمر نے صبح سویرے ہی بتا دیا تھا کہ نیویارک پولیس نے گزشتہ رات ناٹم اسکوائر وائے لے کیس میں سزا شدہ لڑکے کے بیان کی روشنی میں بہت سی جگہوں پر چھاپے مار کر پاکستانی اور ایشین طلبہ کو گرفتار کیا ہے۔ احمری نے مجھے بابر سیدی کا پیغام بھی پہنچایا کہ ہو سکے تو میں چند دن کے لیے بسام کو کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کا کہہ دوں، کیوں کہ نیویارک پولیس مجھے دباؤ میں رکھنے کے لیے یہ آخری حربہ بھی استعمال کر سکتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ بابر کے ذہن میں کون سے خدشات پل رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ بطور مسلم کاؤنسلر پولیس یا سی آئی اے کے لیے بنا کسی ثبوت کے، مجھے گرفتار کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا، لیکن اگر انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں یونیورسٹی کے مسلم طلبہ کے ساتھ مل کر گزشتہ رات ہوئی گرفتاریوں پر ان کے لیے کوئی پریشانی کھڑی کر سکتا ہوں یا یونیورسٹی انتظامیہ ہی ہونے والے سیمینار سے پہلے میرے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر دے، تو وہ لوگ مجھے دباؤ میں رکھنے کے لیے بسام کی ضمانت منسوخ کروا کر اسے ضرور گرفتار کر سکتے تھے، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ بسام کو یہ سب سمجھنا کس قدر مشکل ثابت ہوگا اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، جب میں نے بسام کو صنم کبیر کے ذریعے یہ پیغام بھیجوا کیا کہ وہ چند دنوں کے لیے یونیورسٹی سے چھٹی لے کر عرفی ماموں کی جانب منتقل ہو جائے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ہمارا آنا سامنا کیفے کے باہر والے بڑے دالان میں ہوا، جب میں اور پُندا کیفے سے نکل رہے تھے اور بسام اور صنم کبیر کیفے جانے کے لیے میٹر حیاں چڑھ کر اوپر آرہے تھے۔ ہم چاروں اچانک ہی ایک دوسرے کے سامنے آئے، تو کچھ دیر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ پھر بسام ہی نے بات شروع کی ”میں جانتا تھا کہ تم جس رستے پر چل رہے ہو، اس کا انجام ایک دن ایسی کوئی گرفتاری یا روپوشی ہی ہوگا، لیکن میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، اگر ایک مسلم کاؤنسلر کا بھائی ہونے کی کوئی سزا مقرر ہو چکی ہے، تو میں اسے ضرور بھگتوں گا، شاید میری سزا ہی تمہاری آنکھیں کھول دے۔“ میں زچ ہو کر بولا۔ ”آخر تم ہم سب کی بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے، یوں خود کو پولیس کے حوالے کر دینا سراسر بے وقوفی ہوگی۔ ابھی تو یہ بات صرف ایک خدشے کی حد تک ہے، لیکن اگر حالات گہرے تو یہ خدشہ حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ وقت نہیں لے گا، میری مشکلات میں اضافے کا سبب مت بنو بسام۔“ پُندا اور صنم کبیر دم سادھے ہم دونوں بھائیوں کے بیچ ہوتی یہ تکرار سن رہی تھیں۔ بسام پھٹ پڑا۔ ”مشکلات میں تم اضافہ کر رہے ہو یا میں..... تمہارے ذہن پر اسلامیات کا جو یہ بھوت سوار ہے، ایک دن یہ جنون ہم سب کی زندگیاں برباد کر دے گا اور اس دن تم بچھتاؤ گے آیان، لیکن تب تمہارا دامن ہر رشتے سے خالی ہو چکا ہوگا۔“ میں نے کچھ توقف کیا۔ ”بات اگر بچھتاؤں ہی کی ہے، تو پھر میرے دامن میں ماضی کے بہت سے بچھتاؤے ابھی زندہ ہیں کہ جن کا حساب وقت سے کرنا باقی ہے۔ کاش تم وہ دیکھ سکتے، جو میں دیکھ رہا ہوں۔ بہر حال میں محض اپنی تسلی کے لیے تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کروں گا۔ تم وہی کرو، جو تمہیں بہتر لگے اور میں وہی کروں گا، جو مجھے ٹھیک لگے گا۔“ میں اور بسام، پُندا اور صنم کے ساتھ مختلف سمتوں میں آگے بڑھ گئے۔ میڑھیوں کے اختتام پر مجھے ایڈمن بلاک کے برسر نے ڈین کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ڈین کے کمرے میں پہنچا تو پُندا واکو پی اے نے باہر ہی روک لیا۔ ڈین کے چہرے پر اشتعال کے آثار تھے۔ ”میں اس طرح کلاسز کے بائیکاٹ کی وجہ پوچھ سکتا ہوں، کیا تم سب لوگ اپنا سمسٹر اپنے ہاتھ سے ضائع کرنا چاہتے ہو.....؟“ ”نہیں، ہم اپنی ایک کلاس بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے اور آپ اس بائیکاٹ کی وجہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔“ ڈین نے خود پر کنٹرول رکھا۔ ”آیان! تمہیں میں نے اس دن بھی بتایا تھا کہ کچھ باتیں خود میرے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ یہ یونیورسٹی صرف طلبہ کی فیوسوں سے نہیں چلتی، بلکہ فیوز اور دیگر فنڈز سے تو شاید ہم اتنی بڑی یونیورسٹی کو ایک ہفتے بھی نہ چلا سکیں۔ ہمیں اسے چلانے کے لیے بہت بھاری عطیات کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عطیات یونیورسٹی کے بورڈ آف گورنرز کے ذریعے ملتے ہیں اور میں بورڈ آف گورنرز کے فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتا کہ وہی لوگ یونیورسٹی کو لاکھوں ڈالر کے سالانہ عطیات دیتے ہیں۔ میں اگر زیادہ مزاحمت کروں گا، تو انہیں دوسرا ڈین لانے میں ایک ہفتے بھی نہیں لگے گا، لہذا یہ سیمینار ہو کر رہے گا۔“ میں نے چند لمبے غور سے ڈین کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت واقعی ایک مجبور انسان کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ ہماری وجہ سے آپ کی ملازمت پر کوئی حرف آئے، لیکن میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ مسلم طلبہ کی موجودگی میں ایسا کوئی سیمینار منعقد کروانا ناممکن ہے۔ آپ چاہیں تو ہمارے خلاف یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں، لیکن ہم نے ابھی یونیورسٹی کے قانون اور آئین کے دائرے سے نکل کر کوئی کام نہیں کیا ہے۔“ ڈین خاموش ہو گیا، لیکن میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اسے بورڈ آف گورنرز کو جواب تو دینا ہی ہوگا۔

اس رات میں جلد اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ گزشتہ رات ایئر پورٹ کے راستے میں بایک پر بھیسگتے رہنے سے شاید ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی۔ میں نے بخار کی ایک گولی نگلی اور نیچے پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند بھلا کوشش سے کب آتی ہے۔ شاید نیند کوشش کی ضد ہے، لیکن پھر..... رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی۔ مگر اچانک ہی شدید دھڑ دھڑ کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو مسلم طلبہ دروازے کے باہر پریشان کھڑے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ان میں سے کوئی ایک چلایا۔ ”نیویارک پولیس نے دو گھنٹے قبل عامر بن حبیب کو ایک چھاپے کے دوران گرفتار کر لیا ہے۔“..... (جاری ہے)





ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بن الاقوامی پزیرائی کا میا بی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ بنی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggrou.com.pk

عامر بن حبیب کی گرفتاری نے پوری یونیورسٹی میں ایک ہل چل سی مچادی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس کی بروکلین والی رہائش کا پولیس کو پتا کیسے چلا۔ میں کل شام ہی تو اس سے مل کر آیا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے تو اس اپارٹمنٹ تک نہیں پہنچ گئے تھے۔ مسلم طلبہ میں، میں ہی سب سے آخر میں عامر سے مل کر آیا تھا۔ اس روز بھی مسلم طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ جاری رکھا اور جب ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب عدالت کے اس احاطے میں پہنچے، جہاں کچھ دیر بعد عامر کو لایا جانا تھا، تو ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ یہ اس موسم سرما میں نیویارک کی پہلی برف باری تھی۔ کچھ ہی دیر میں عدالت کے احاطے میں موجود بڑی اینٹوں کا صحن اور تمام درخت برف سے اٹ گئے۔ خزاں رسیدہ شاخوں پر برف کے پھول بننا شروع ہو گئے، تو وہ لوگ عامر بن حبیب کو لیے کورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نیویارک پولیس کی تین کاریں ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر رکیں اور شہر کا پورا میڈیا اُن پر اُمد پڑا۔ پولیس نے بڑی مشکل سے اپنی حد کے لیے لگائی نیلی پٹی سے میڈیا کو دور رکھا ہوا تھا۔ میں نے دوری سے عامر کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا ”ہم سب تمہارے ساتھ ہیں عامر..... تم ہی ہمارے مسلم کاؤنسلر ہو اور ہمیشہ رہو گے۔“ عامر بن حبیب نے مسکرا کر میرے ”جو شیلے خوش آمدید“ کو سراہا۔ میڈیا کے کیمروں کا رخ میری جانب ہو گیا۔ میں تیزی سے جھوم کو چیرتا ہوا عامر کے قریب تر ہوتا گیا۔ برف ہمارے سروں کو ڈھک رہی تھی اور سانس گرم بھاپ کی مانند فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ میں عامر کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا، جہاں سے وہ میری بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے چلتے ہوئے پولیس کے قدموں سے قدم ملائے ”مجھے شک ہے، یہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے کہیں تمہارے اپارٹمنٹ تک نہ پہنچ گئے ہوں؟“ عامر نے آگے چلتے ہوئے کہا ”نہیں..... یہ اپارٹمنٹ والوں کا کارنامہ ہے، بہت دنوں سے آس پاس کے ہم سارے تم سب لوگوں کی آمد و رفت کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ آج آخر کار انہوں نے شکایت کر دی۔“ عامر کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے میرے شانوں سے بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو، کیوں کہ عامر نہ سبھی، مگر کسی اور مسلم طالب علم کے ذہن میں یہ شک ضرور سر ابھار لیتا کہ عامر کی مغربی میں میرا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے، تو مجھے انہیں جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا، کیوں کہ میرا دامن پہلے ہی ایک ایسے الزام سے داغ دار تھا۔ عامر نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا اور وہ ایک لمحے کے لیے سیز جیوں کے قریب رک گیا۔ گرتی ہوئی برف کا ایک بڑا سا گالہ اس کی پلکوں میں آ کر اٹک گیا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے اگر اپارٹمنٹ یونین کا صدر نہ بھی بتاتا کہ اس نے خود فون کر کے پولیس کے سامنے اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے، تب بھی میرے ذہن میں ہرگز کوئی شک سر نہ ابھارتا۔ خود کو بلاوجہ ہلکان نہ کیا کرو۔ تمہیں ابھی بہت سی اہم ذمے داریاں پوری کرنی ہیں اور اس بات پر اعتماد اور یقین رکھو کہ تمہاری ایک پکار پر پورا مسلم گروپ یک زبان ہو سکتا ہے۔ تم اب ان کی روح کے اندر بیٹے ہو اور وقت آنے پر تم خود یہ سب دیکھ لو گے۔“ میڈیا کے کیمرے دھڑ دھڑ ہماری تصویریں اتار رہے تھے اور بہت سے ٹی وی چینل بھی ہمیں کور کر رہے تھے۔ پولیس نے عامر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ عامر کے قدموں کے نشان برف پر بنے تو میں اُس کے نقش پا پر چلتا ہوا کورٹ روم میں داخل ہو گیا۔ عامر پر بھی کم و بیش وہی الزامات لگائے گئے تھے، جو بابر سیدی کے سر تھے۔ نیویارک پولیس، عامر کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور ناٹمنر اسکوائر بم کیس یا پھر ایسی ہی دیگر ان دیکھی اور ان ہونی سازشوں کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ عامر کی روپوشی اور اس دوران اس سے ملنے کے لیے آنے والے ملاقاتیوں کی مشکوک سرگرمیوں کا بھی بہت مرتبہ ذکر آیا اور اپارٹمنٹ کے مکیٹوں کی شکایت اور شہادت بھی پیش کر دی گئی۔ جج نے تمام ”شبوتوں“ کو دیکھتے ہوئے عامر کو سات دن کے لیے حراست میں رکھ کر تفتیش کا حکم صادر کر دیا۔ مسلم لڑکوں نے عدالت کے باہر گرتی برف میں بہت دیر تک مظاہرہ جاری رکھا۔ عامر کے چہرے پر پوری سماعت کے دوران اس کی مخصوص مسکراہٹ چھائی رہی اور مجھے جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ اس کی یہ مسکراہٹ سرکاری وکیل اور پولیس سمیت جج کے لیے بھی ایک تازیانی کی طرح تھی، کیوں کہ اس قوم کو تو مرعوبیت مرغوب ہے اور یہ مرعوبیت انہیں بابر سیدی کے چہرے پر ملی اور نہ ہی عامر بن حبیب نے ان کی یہ خواہش پوری کی۔ پٹشی کے بعد انہوں نے ہمیں عامر سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی اور تیزی سے عدالت سے نکال باہر لے گئے۔ میں عدالتی کمرے سے باہر نکلتا تو رپورٹرز نے مجھے گھیرے میں لے لیا ”تم تو وہی نئے مسلم کاؤنسلر ہونا!! جس نے گراؤنڈ زیرو پر اس روز شمع روشن کی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ پرانے مسلم کاؤنسلر کا نیویارک میں ہوئی دہشت گردی کی وارداتوں سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟“ میں انہیں کوئی جواب دیے بنا ہی آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن دہشت گردی کا الزام سن کر میرے قدم رک گئے۔ میں رپورٹرز کی جانب مڑا ”دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر نیویارک پولیس کو عامر بن حبیب پر ایسا کوئی شک ہے تو پھر یہ شک ہر مذہب پرست پر کیا جانا چاہیے۔ اس دہشت گردی کے پیچھے پادری ٹیری جونز یا ملعون ویسٹرگارڈ جیسا کوئی شخص بھی تو ہو سکتا ہے، جو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یہ تمام کھیل



کھیل رہا ہو۔ آخر ایک مسلم کاؤنسلر ہی پر تمام الزامات کیوں؟ کوئی عیسائی یا یہودی کاؤنسلر بھی تو اس طرح کی واردات کا منصوبہ بنا سکتا ہے۔ اگر جنون کا تعلق کسی مذہب سے جوڑنا ہی آخری کلیہ ہے، تو پھر ایسے مجنوں تو ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو کے نام تو میں نے ابھی آپ کو بتا دیے ہیں۔“ اتنے میں پُر واہجوم کو دھکیلتی کہیں سے بھیڑ میں آگھسی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے لے جانے کے لیے کھینچا۔ ”آیا ان..... چلو یہاں سے.....“ وہ جانتی تھی کہ میڈیا مجھے بھڑکا کر مجھ سے اپنے مطلب کے جوابات کا خواہاں ہے، لیکن میں بھی کیا کرتا۔ کچھ سوال بروقت جواب کے ہی متقاضی ہوتے ہیں۔ ہم ایک قدم آگے بڑھے تو ایک اور برف سے ڈھکا مائیک میرے سامنے آگیا۔ ”تم نے ابھی ویسٹرگارڈ پر مذہبی جنونیت کا الزام لگایا ہے، لیکن خود تمہاری یونیورسٹی اسی ویسٹرگارڈ کے بنائے ہوئے خاکوں پر باقاعدہ سیمینار کا پروگرام بنا چکی۔ مسلم طلبہ کا اس سیمینار پر کیا رد عمل ہوگا؟“ پُر وانے جلدی سے میری جگہ جواب دیا۔ ”ہم تمام مسلم طلبہ یونیورسٹی کے قانون کے اندر رہتے ہوئے اس سیمینار کو کروانے کے لیے ہر ممکن احتجاج کریں گے۔“ ہم نے تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کی، لیکن جہوم بہت زیادہ تھا۔ ایک اور زہر میں بجھا سوال میری سماعتوں میں چسید کر گیا۔ ”آخر یونیورسٹی کے دو ہزار سے زائد طلبہ میں سے صرف دو ڈھائی سو مسلمان طلبہ ہی کو آزادی اظہار سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟“ میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ برف باری کا رخ اب ترچھا ہو چکا تھا اور مجھے برف کے دبیز اور بڑے گالوں کے عقب میں روپوڑ کا چہرہ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”ہمیں آزادی اظہار پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ آزادی نہیں، وحشت ہے۔ اور آج تم جو یہ ہاتھ میں مائیک تھامے آزادی اظہار کے گُن گاتے پھرتے ہو۔ تمہاری ہمت ہے، تو اس بھرے نیویارک میں کسی یہودی کے سامنے ہولوکاسٹ کے بارے میں اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کر سکو۔ کیا تم میں سے ایسا کوئی شیردل ہے، جو کسی عیسائی کے سامنے چرچ کی کسی رسم یا تہمتہ کو غلط قرار دے سکے۔ کیا تم کسی بھی کیتھولک کے سامنے پروٹسٹنٹ کو اور پروٹسٹنٹ کے سامنے کیتھولک عقیدے کو کھل کر اچھا کہہ سکتے ہو۔ کیا کسی یہودی کے سامنے سینہ تان کر یہ بات کہہ سکتے ہو کہ عیسائی کو صلیب دینے کی سازش کے پیچھے خود یہودی علماء کا ہاتھ تھا۔ کبھی تم لوگوں نے سینہ ٹھونک کر یہ کہا ہے کہ اسرائیل یہودی ایک ناجائز بستی ہے، جسے جنگ عظیم دوم سے پہلے ہی یہودی منصوبہ کاروں نے فلسطین کے مقام پر بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا، کیا تم میں سے کوئی روپوڑ آج شام کی خبروں میں یہ اعلان کر کے آزادی اظہار کا بول بالا کر سکتا ہے کہ بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ ناجائز اور اس کے ارد گرد ہوتی کھدائی دراصل ہمارے قبلہ اول کے انہدام کی ایک سازش ہے۔ بولو، کوئی ہے آزادی اظہار کا ایسا متوالا، جو میرے ان سوالات کا جواب دے سکے؟“ جہوم پر ایک سنا سنا طاری ہو گیا اور ہمارے ارد گرد صرف گرتی ہوئی برف کی سرگوشیاں رہ گئیں۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ میں نے اپنی بات ختم کی ”اگر تم سب مل کر بھی آزادی اظہار کے اتنے چھوٹے سے نمونے سے خائف ہو، تو پھر ہم مسلمانوں پر اپنی کائنات کی سب سے مقدس ہستی کے مقدس نام کی حرمت کا دفاع ہی تمہیں آزادی اظہار کے خلاف کیوں لگتا ہے؟“ یاد رہے کہ اظہار کی آزادی کی اپنی کچھ حدود مقرر ہیں اور آزادی اظہار کا بھی اپنا ایک تقدس ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اپنے کسی ذاتی مذموم مقصد کے لیے ان حدود کو پار کر جائے، میری نظر میں وہ خود ایک انتہا پسند اور وحشت گرد ہے۔“ میں اور پُر واہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ہمارے یونیورسٹی واپس جینچنے سے پہلے ہی نیویارک کا تمام میڈیا آج عدالت کے احاطے میں میری روپوڑز سے ہوئی اس خود ساختہ جھڑپ کی کہانیاں بیان کر رہا تھا۔ ایک آدھ چینل کے علاوہ باقی سب کا اندازا بھی تک نہایت مخفی تھا اور میری کئی گئی بات کو یہود اور عیسائیوں کے لیے ایک چیلنج کے طور پر نمایاں کیا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز یہودی اور عیسائی طلبہ کی جانب سے بھی کلاسز کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے کسی ممکنہ ناخوش گوار واقعے سے بچنے کے لیے نیویارک پولیس سے حفاظتی حصار کا مطالبہ کر دیا اور جب میں برف سے ڈھکی روشوں اور راستوں سے ہوتا ہوا یونیورسٹی کے بڑے دالان میں پہنچا تو پورا میدان سنسان پڑا تھا۔ چند من چلوں نے نیویارک کی پہلی برف باری کا لطف لینے کے لیے گزشتہ روز میدان میں برف کے جو پتکے بنائے تھے، وہ اب بھی اسی طرح استادہ تھے، بلکہ رات بھر گرتی برف نے ان کے نقوش اور بھی گہرے کر دیے تھے۔ احمرار بلال میرے ساتھ تھے اور پھر کچھ ہی دیر میں ہمارے ارد گرد پورا گروپ اکٹھا ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر پُر وانے کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے، لیکن وہ خاموش رہی، مگر ٹھیک اسی وقت صنم کبیر گھبرائی ہوئی سی وہاں آ پہنچی۔ ”آیا ان! آج تمہیں یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں دوسرے گروپس کے لڑکے بہت مشتعل ہیں۔“ احمر غصے میں مجھ سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”کوئی مشتعل ہوتا ہے، تو ہونے دو۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پھین رکھی ہیں۔ اگر کسی نے آیا ان کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی خیر نہیں ہے۔“ میں نے سب کو منع کیا۔ ”جب تک کوئی ہم پر ہاتھ نہ اٹھائے، ہمیں چپ رہنا ہے اور کسی جھگڑے کی صورت میں بھی ہمیں صرف اپنا دفاع کرنا ہے۔ تم سب کو یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ ہماری منزل ان جھگڑوں سے کہیں آگے ہے۔ ہمیں اپنے راستے سے ہٹک کر کسی اور جانب نہیں ٹکنا۔“ پُر وانہماری باتوں کے درمیان نہ جانے چپ چاپ کہاں جا چکی تھی۔ ہم سب نے کینے کے باہر والے دالان میں نصب سنگ مرمر کے پتھروں سے برف جھاڑی اور وہیں تک گئے۔ آج کینے بھی حالات کے پیش نظر بند تھا، لہذا کچھ طلبہ تھرماس میں کافی اور کچھ پلاسٹک کے کپ بھی لے کر آئے تھے۔ سخت جمی ہوئی برف میں کافی چٹنا بھی کچھ الگ ہی تجربہ ہے۔ ہم سب وہیں اپنے خیالوں میں گم بیٹھے تھے کہ اچانک ایک جانب سے شمعون، مائیکل اور ان کے گروپ کے بیس بائیس لڑکے وہاں آ پہنچے۔ میں نے اپنے گروپ کو آرام سے بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ شمعون گروپ میری جانب بڑھ آیا۔ ان سب کے چہرے تنے ہوئے اور آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ شمعون میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ ”جیسے تمہاری ہمت داد دینی چاہیے۔ تم آج بھی یونیورسٹی آئے ہو۔ حالاں کہ ہم سمجھ رہے تھے کہ کل کے انٹرویو کے بعد تم ہفتوں کیپس میں دکھائی نہیں دو گے۔“ میں نے سر اٹھا کر شمعون کو دیکھا۔ ”کیوں، کل میں نے ایسی کیا بات کہہ دی کہ تم مجھے دیس بدر کروانے کا سوچ رہے ہو؟“ شمعون میری بات سن کر پھٹ پڑا۔ ”دیکھا تم لوگوں نے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس نے پورے نیویارک کے میڈیا کے سامنے کیا ہرزہ سرائی کی ہے۔ ہمارے مذہب پر کتنا کچڑا اچھالا ہے۔ آج اگر ارد گرد پولیس کا یہ پہرہ نہ ہوتا، تو ہم تمہیں بتاتے کہ اس بکواس کا کیا انجام بھگتنا پڑے گا تمہیں۔“ میں نے کافی کا آخری سپ لیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر شمعون کے ٹھیک مقابل کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہارا یہ شوق اب بھی پورا کر سکتا ہوں۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ میں مسلم کاؤنسلر بننے سے پہلے صرف آیا ان تھا اور دعا کرو کہ وہ آیا ان یہ نہ بھول جائے کہ وہ اب مسلم کاؤنسلر بھی ہے۔ رہی بات، پولیس کے پہرے کی، تو وہ تو صرف اس یونیورسٹی کی چار دیواری تک ہے۔ تم پورے نیویارک میں کہیں بھی مجھ سے ملاقات کا شوق پورا کر سکتے ہو۔ بس جگہ اور مقام بتا دو۔“ کچھ دیر تک میں اور شمعون ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر دیکھتے رہے۔ اتنے میں عیسائی کاؤنسلر جارج بھی وہاں آ پہنچا، لیکن وہ یہ تمام صورت حال دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ اچانک دور برف سے اٹنے میدان میں پُر واچالیس پچاس یہودی، عیسائی اور مسلمان لڑکیوں کے ایک جلوس نما گروپ کی سربراہی کرتی ہوئی نمودار ہوئی ان لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں



میں بڑے بڑے کارڈ اور بیئر اٹھار کھے تھے، جن کے اوپر نمایاں طور پر مسلمانوں کا نشان ہلال، عیسائی مذہب کا نشان صلیب اور یہود کا ستارہ داؤدی بنا ہوا تھا۔ کارڈز اور بیئرز پر تینوں مذاہب کی حرمت کا پاس رکھنے کے نعرے درج تھے ”جو آسمان سے اترا، وہ سب کے لیے مقدس ہے“، ”ہمارا خدا ایک ہے“، ”مذہبی تعصب کی بنیاد پر طلبہ میں پھوٹ ڈالنے کی سب کوششیں ناکام ہوں گی“، ”دنیا کا ہر مذہب دوسرے مذہب کا احترام سکھاتا ہے“ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے نعرے۔

لڑکیاں اپنے قدموں سے برف کی دھول اڑاتی ہمارے پاس پہنچ گئیں اور وہاں انہوں نے تینوں مذاہب اور تینوں مذاہب کے کاؤنسلرز کے حق میں پُرجوش نعرے بازی شروع کر دی۔ تینوں گروپس کے لڑکوں کے چہروں پر تناؤ کم ہونے لگا۔ پُرواپوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ لڑکیوں کے پاس چائے کے لوازمات، کافی اور کپ وافر مقدار میں تھے۔ یہودی لڑکیوں نے مسلمان لڑکوں کو کافی پیش کرنا شروع کی، تو مسلمان لڑکیاں عیسائی اور یہودی طلبہ کے کپس میں چائے، کافی انڈیلنے لگیں۔ عیسائی لڑکیوں کا گروہ بھی ان کی مدد کرتا رہا۔ اس طرح کچھ لمحوں ہی میں ایک بہت بڑے تصادم کا خطرہ ٹل گیا، لیکن ہم سب جانتے تھے کہ چنگاری نے بھڑک کر آگ پکڑ لی ہے اور اب ذرا سی بھی ہوا اس آگ کو اتنی تیزی سے پھیلانے کی کہ شاید سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے۔ شمعوں کافی پیچے بنا وہاں سے چلا گیا۔ البتہ جارج کو عیسائی گروپ کی طالبات نے گھیرے رکھا اور وہ اپنا کپ ختم کیے بغیر وہاں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے ڈین کے دفتر سے بلاوا آ گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں سیاہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس دو اجنبی چہرے بھی موجود تھے۔ ڈین نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔ ”آیاں..... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارا کل کا بنا اجازت میڈیا کو دیا گیا بیان یونیورسٹی کے قاعدے اور قانون کی مکمل خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے اور یونیورسٹی انتظامیہ کی پوری حیوری تمہارے اس عمل کے بارے میں جلد ہی کوئی فیصلہ لینے کا سوچ رہی ہے۔ بہر حال، یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال تم سے نیویارک پولیس کے دو آفیسرز کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے دونوں پولیس والوں کی طرف دیکھا، جو قد اور جسامت کے لحاظ سے مشہور کردار لورل اور ہارڈی کی نقل نظر آ رہے تھے۔ پتلے والے نے غور سے میری جانب دیکھا ”اچھا..... تو تم ہو مسلم کاؤنسلر۔ ویسے کل تم نے اتنی تلخ باتیں کر کے اپنے لیے اچھی خاصی مصیبت مول لی ہے۔ نیویارک میں ایک ہی دن میں کئی دشمن پیدا کر لیے تم نے۔“ میں جو شمعوں کی باتوں کی وجہ سے پہلے ہی کافی تلخ ہو چکا تھا، اپنے لہجے پر قابو نہ رکھ سکا ”تو میں تم دونوں کو ہم درودوں کی فہرست میں شمار کروں یا نئے دشمنوں کی؟“ وہ دونوں چونک سے گئے۔ بھاری بھر کم بولا ”نہیں! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ صرف تمہیں خبردار کرنے آئے ہیں کہ اپنی نقل و حرکت اب ذرا محدود ہی رکھنا۔ نیویارک بہت بڑا شہر ہے اور یہاں اپنے مذہب کی بات پر بھڑک جانے والے بہت ہوں گے۔ کہیں کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔“ میرا جی چاہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ یہ تنبیہ ہے یا دھمکی؟ لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔ انہوں نے مجھ سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں پوچھیں اور خاص طور پر پاکستان میں میرے والدین کی جائے پیدائش، ان کی رہائش اور ہمارے رشتے داروں کے بارے میں بھی خوب گریڈ گریڈ کرسوالیات کیں۔ آخر کار، مجھے ایک مقام پر زچ ہو کر کہنا پڑا کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں، جیسے میں نے پاکستان سے ابھی اپنے لیے امریکا کا ویزا طلب کیا ہے یا پھر میں کوئی امریکی نہیں، بلکہ ان کی نظر میں ایک مشکوک پاکستانی شہری ہوں، جسے سی آئی اے نے ایئر پورٹ پر ہی کسی شک کی بنیاد پر دھریا ہے اور اسے واپس اپنے ملک ڈی پورٹ کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈا جا رہا ہے، لیکن میرے احتجاج کے باوجود انہوں نے اپنے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میری جان چھوٹی۔ کمرے سے نکلنے وقت انہوں نے ڈین کو خبردار کیا کہ ان کی رپورٹ کے مطابق نیویارک کی دیگر یونیورسٹیز کے طلباء و طالبات بھی اب اس جھگڑے میں کود پڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور وہاں کے مسلم طلبہ نے میری مکمل حمایت کا اعلان کر دیا ہے، لہذا یہ بات آگے چل کر کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے ڈین کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں اپنے طلبہ کو باہر کی کسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے روابط بڑھانے نہ دے۔“ ان دونوں کے جانے کے بعد ڈین نے تشویش سے میری جانب دیکھا ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ دیکھ لو، چنگاریاں کہاں کہاں تک پہنچ چکی ہیں۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا ”یہ آگ انہوں نے خود لگائی ہے۔ ہم تو صرف اپنا گھر بچانا چاہتے ہیں سر۔ آج میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ بہ طور مسلم کاؤنسلر نیویارک اور قانون کے مختلف اداروں کے سامنے میرا تحفظ کرنے کے بجائے خود مجھی کو جواب دہ کر رہی ہے۔ بہر حال، آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ ڈین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن پھر چپ ہو گیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو پُروادہ داری میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ”کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ، حلے سے تو پولیس کے آدمی دکھائی دے رہے تھے؟“ پولیس والے ہی تھے۔ خبردار کرنے آئے تھے کہ مجھ پر اب کسی ست سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔“ پروادہ پریشان ہو گئی۔ ”پھر..... تم نے اب کیا سوچا ہے؟“ مجھے اس کی پریشانی اچھی لگی۔ ”جو ہوگا، دیکھا جائے گا مس پرواضمیر خان۔ ویسے تم نے آج یونیورسٹی کی تمام طالبات کو یک جا کرنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس پر تم شاباشی کے پورے پانچ ستاروں کی حق دار ہو۔ بہت خوب مس ضمیر، ویل ڈن“ پروادہ شرماسی گئی۔ یہ مشرق کی لڑکیاں تمام عمر مغرب میں گزالیں، تب بھی ان کے چہروں سے پھوٹی شفق کا خزانہ سدا برقرار رہتا ہے۔

ہم راہ داری سے باہر نکلے تو ”دوسری مشرقی لڑکی“ بھی سامنے ہی بوکھلائی سی آتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے صنم کبیر کو چھیڑا ”خدا کے لیے تم کبھی تو چہرے پر مسکراہٹ سجا کر ملنا کرو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایران کی گوگوش یاد آ جاتی ہے۔ بس، تم مسکراتی نہیں ہو۔“ صنم واقعی مسکرائی۔ ”تم دونوں بھائی مجھے کبھی مسکرانے کا موقع دو تو میں مسکراؤں نا۔ بسام زبان سے تو نہیں کہتا، لیکن وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے۔ خاص طور پر کل میڈیا سے ہوئی تمہاری جھڑپ کے بعد..... آیاں..... میری ایک بات مانو گے؟ بسام سے ایک بار مل لو“، ”لیکن وہ مجھ سے ملنا چاہے، تب ناں.....؟“ صنم خوش ہو گئی ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں نے آج شام اسے کیفے بنولی میں ملنے کے لیے بلایا ہے۔ تم بھی پُروادہ کے ساتھ وہیں آ جانا۔ اکیلے آؤ گے، تو وہ سمجھ جائے گا کہ یہ ملاقات میرے کہنے پر ہو رہی ہے۔ تم اپنی زبان سے اُسے تسلی دو گے، تو وہ ضرور کچھ سمجھل جائے گا۔“ میں نے اس معصوم لڑکی کی خواہش کو رد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہامی بھری۔ شام کو پُروادہ اپنی نیلی شیور لیٹ لے کر ہاسٹل پہنچ گئی اور ہم ہاسٹل سے کیفے بنولی کے لیے نکلے، تو سڑک کے دونوں طرف برف کے بڑے بڑے انبار اکٹھے کیے جا چکے تھے۔ میں نے ٹھیک طرح سے غور نہیں کیا، لیکن مجھے شک ضرور ہوا کہ کالے رنگ کی ایک بڑی وین ہماری گاڑی کے نکلنے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ پُروادہ کو نیویارک کے راستے ازبر ہو چکے تھے، لہذا وہ بڑی شاہراہوں سے بچتی، گلیوں کے درمیان گاڑی دوڑاتی ہوئی منزل کی جانب بڑھتی رہی اور چند گلیوں کے بعد مجھے وہ وین بھی اپنے پیچھے آتی دکھائی نہ دی۔ میں بھی اسے اپنا وہم سمجھ کر پُروادہ سے باتوں میں مشغول رہا۔ پروادہ نے کیفے بنولی کی پرلی سڑک پر کار پارک کر دی اور ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ میں سڑک پار کرتے ہوئے پُروادہ سے کوئی بات کر رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اچانک شدید خوف کا سایا لہرایا اور وہ زور سے چلائی ”بچ کے آیاں“ لیکن میں نے پلٹ کر دیکھنے میں ایک لمحے کی تاخیر کر دی۔ سیاہ وین بالکل میرے سر پر پہنچ چکی تھی اور اس کا انجن زور سے چٹکھا رہا تھا۔ پُروادہ نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا مجھے زور سے دھکا دیا اور میں دوسری جانب فٹ پاتھ پر جا گرا۔ وین تیزی سے اسکرینچ مارتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور پھر میری نظر سڑک کے درمیان میں برف پر بے سدھ گری پُروادہ پر پڑی، اس کے ماتھے سے بھل بھل بہتا خون تیزی سے آس پاس کی برف کو ابھور لگ کر رہا تھا۔ میں چلا کر پروادہ کی جانب دوڑا۔ پروادہ کی گردن ایک جانب ڈھلک چکی تھی۔..... (جاری ہے)





ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبد اللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبد اللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



پُرہ واکو یوں لہولہاں زمین پر بے سدھ پڑے دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ جانے کس نے ایسبولینس کوفون کیا اور کب ہم نے پُرہ واکو اٹھا کر ایسبولینس میں ڈالا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ باہر کا شور شراب اس کرصم کبیر بھی کیفے سے نکل کر ہماری جانب چیخ کر دوڑتی ہوئی آئی تھی، لیکن وہ کب میرے ساتھ ایسبولینس میں بیٹھی، مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا، میں تو بس تمام راستے چلا چلا کر پُرہ واکو ہوش میں لانے کی کوششیں کرتا رہا، لیکن جب تک ہم کیفے نیولی سے قریب ترین اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوئے، پُرہ واکا رنگ کورے لٹھے کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ اس نازک سی لڑکی کے جسم میں پہلے ہی کتنا خون ہوگا، جو یوں بوتلوں کے حساب سے ضائع بھی ہوتا جا رہا تھا۔ ایسبولینس کو بنا روکے زمین دوز راستے کے ذریعے سیدھے ایمرجنسی تھیٹر کے دروازے تک پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم تمام تیاریوں کے ساتھ موجود تھی۔ ہمیں راہ داری میں روک دیا گیا اور ہم چلتے انگاروں پر وہیں باہر راہ داری میں کھڑے لوٹنے رہ گئے۔ جانے کب، شام ڈھلی اور کب رات گہری ہوئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ انہیں پُرہ واکو اندر لے جائے پانچ گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ ہمارے اسپتال پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی سب سے پہلے بسام اور پھر پورا مسلم گروپ وہاں پہنچ گیا تھا۔ جس وقت پُرہ واکو وین نے کچلا تھا، اس وقت تک بسام، صنم کبیر سے ملنے کے لیے کیفے نہیں پہنچا تھا۔ مسلم طلبہ کا اشتعال لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا، لیکن وہ سب میری حالت دیکھتے ہوئے پُپ سادھے رہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ہماری تشویش بھی دوچند ہو رہی تھی۔ جانے انہیں اندر اتنی دیر کیوں لگ رہی تھی۔ اور پھر صبح سے کچھ دیر پہلے آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور اندر سے تھکا ہارا میڈیکل اسٹاف باہر نکلا۔ ہم سب ان کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ہم سے نظریں چرانے کی بہت کوشش کی تو میں پھٹ پڑا ”بولتے کیوں نہیں، کیا ہوا ہے اسے؟“، ”وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو یہ کوما بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال، ہم ابھی ناامید نہیں ہیں۔“ ڈاکٹر جاتے جاتے بھی ہم سب کو ایک نئی سولی پر لٹکا گئے۔ ہمارے سامنے پُرہ واکو بے ہوشی کے عالم میں ایک خاص کمرے کے اندر منتقل کر دیا گیا اور ہم سب کمرے کی ششے کی دیوار سے اندر مختلف ٹیوبز اور بیچوں میں جکڑی پُرہ واکو دیکھتے رہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر ڈاکٹروں سے کہوں کہ انہیں ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہے، کیوں کہ یہ تو ہماری پُرہ واکو ہے ہی نہیں۔ ہماری پُرہ واکو ضمیر خان تو ہمیں دیکھتے ہی جھٹ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر زوردار انداز میں اپنا تعارف کرواتی تھی۔ اس کی دھیمی مسکان سے تو یونیورسٹی کے درو دیوار اور راہ داریاں ہمیشہ روشن رہتی ہیں۔ وہ تو ایک پُرہ واکو ہے۔ ایک دھنک ہے، جو ہم سب کی زندگیوں پر ہمیشہ قوس قزح بن کر چھائی رہتی ہے۔ ہماری پُرہ واکو ہم سب کو یوں روتا چھوڑ کر خود ششے کی دیوار کے پرے یوں آرام سے آنکھیں موند کر بے خبر سو ہی نہیں سکتی۔ نہیں نہیں..... یہ سروسوں کے پھول جیسی چلی اور کھلائی ہوئی لڑکی تو کوئی اور ہے۔ جتنا ایرک، جم اور فرہاد مجھے تسلی دیتے، میں اتنا ہی بکھرتا جا رہا تھا۔ جتنی دوسری جانب صنم کبیر کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی، جس کا اسکارف ابھی تک پُرہ واکو کے خون سے سرخ تھا۔ وہ صنم کبیر، جو کسی کو زور سے چھینک مارتے دیکھ کر بھی ڈر جاتی تھی، آج وہی صنم اپنی گود میں پُرہ واکو لہولہاں چہرہ رکھے تمام راستے اسے تھپکتے ہوئے یہاں تک لائی تھی، لیکن اس کی ہمت پُرہ واکو کے آپریشن تھیٹر میں جاتے ہی یوں ٹوٹی کہ اسے ریزہ ریزہ کر گئی۔ کبھی کبھی اچانک اور بہت گہرا صدمہ بھی ہمیں فوری حوصلہ تو دے جاتا ہے اور ہم اپنی روزمرہ کی قوت برداشت سے کہیں زیادہ بڑا دھچکا بھی جھیل جاتے ہیں، لیکن اس کے اثرات کچھ دیر بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ صبح کا اجالا ہونے تک یونیورسٹی کی سب ہی مسلم، عیسائی اور یہودی لڑکیوں کے گروپ پھولوں کے گلہستے لیے اسپتال کے دالان میں جمع ہونے لگے۔ وہ ان سب کی بھی تو ”پُرہ واکو“ تھی۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ پُرہ واکو نے ان سب کو جوڑنے کے لیے کس قدر جو حکم اٹھایا ہوگا۔ لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک دوسرے سے پُرہ واکو کی خیریت پوچھ پوچھ کر جانے کہاں کہاں فون کیے جا رہی تھیں۔ میں پُپ چاپ سا وہیں راہ داری میں پڑے ایک بیچ پر بیٹھا، باہر گرتی برف کی سسکیاں سنتا رہا۔ مجھے اس روز گاڑی میں کیفے نیولی جاتے ہوئے پروا کی کبھی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ برف باری اسے ہمیشہ مسحور کر دیتی ہے اور گرتی برف کے



دوران سخت سردی میں آئس کریم کھانا یا ٹھنڈی بوتل پینا بچپن سے اس کی عادت ہے۔ اس نے مجھ سے بھی وعدہ لیا تھا کہ ہم کیفے نیولی سے نکل کر سامنے کھڑے آئس کریم والے سے ”لیمن فلیور کون“ ضرور کھائیں گے۔ اسے رنگین شیشے کی بوتل سے آنکھ لگا کر برف اور سفید آسمان دیکھنا بھی بہت پسند تھا۔ اتنی زندہ لڑکی ایک دم سے یوں خاموش کیسے ہو سکتی ہے۔ مجھے زندگی میں پہلی

مرتبہ ایک نئے خوف کا تجربہ ہوا۔ مجھڑنے کا خوف، کسی کے چلے جانے کا خوف، موت کا خوف۔ یہ کتنی ڈرا دینے والی بات ہے کہ ہمارے آس پاس ہم سے جڑے تمام رشتے ایک نہ ایک دن ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ دنیا کتنی آسان ہو جائے، اگر ہم سب اپنوں سے پہلے ہی چلے جایا کریں۔ مجھے رہ رہ کر وہ سیاہ وین یاد آ رہی تھی اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ میں نے وہ وین اس سے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ مجھے جب سی آئی اے کے آفیسر فورڈ نے روکا تھا، اس روز ان کے پاس بھی ایسی ہی ایک وین تھی، لیکن میرے دماغ میں اس روز سے پہلے کی بھی کوئی یادداشت بار بار ذہن کی دیواریں جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن پُر واکے بہتے خون کو دیکھ کر میرے اندر سب کچھ جامد سا ہو گیا۔ اسپتال کے دالان میں تیز برف باری کے باوجود مسلم طلبہ اور دیگر طالبات بڑی بڑی سیاہ چھتریوں تلے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ڈین نے آج کلاسز بھی معطل کر دی ہیں اور کچھ دیر میں ہمارے کئی اساتذہ بھی اسپتال کا چکر لگا گئے۔ ڈین بھی ان میں شامل تھا۔ وہ راہ داری میں جاتے ہوئے کچھ دیر میرے پاس رکا۔ ”تم ایک بہادر لڑکے ہو آیان..... اور میں جانتا ہوں کہ تم اس صورت حال کا بھی دلیری سے مقابلہ کرو گے۔“ میں سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ”لیکن دھیان رہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ گاڑی پُر واکو نہیں، تمہیں کچلنے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ تمہیں اب بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ ڈین میرا شانہ تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں چند قدم چل کر شیشے کی اس دیوار تک جاسکوں، جس سے پرے پُر واک کی ڈوبتی سانسوں کا گراف سامنے لگا مانیٹر اسکرین دکھا رہا تھا۔ یہ بے جان مشینیں، یہ تاریں، یہ نلکیاں بھلا کسی کی زندگی ماپنے کا بیانا کیا جانیں۔ زندگی ان سب چیزوں سے بہت الگ، بہت سوا ہے۔ اور یہ مصنوعی آلات اگر کل کلاں کسی کی زندگی کی لکیر کے اتار چڑھاؤ کو ختم کر کے سیدھا دکھانا شروع کر دیں، تو ہم یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے۔ مشینیں بھلا اس زندگی کے احساس کو کیا جان پائیں گی۔ میرا جی چاہا کہ پُر واکے کمرے کی تمام مشینوں کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر کے باہر کسی ویرانے میں پھینک آؤں۔

کچھ دیر بعد پولیس والے بھی آئے، لیکن ڈاکٹرز سے بات کر کے باہر ہی سے لوٹ گئے۔ میرا بیان وہ گزشتہ شام ہی لے چکے تھے اور ان کے بقول وہ شہر میں اس سیاہ وین کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر میں مجھے احمر کا بلاوا آ گیا۔ میں راہ داری سے باہر نکلا تو بیرونی سیڑھیوں کے پاس وہ تیز برف باری میں سی آئی اے کے آفیسر فورڈ کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ فورڈ حسب معمول کچھ چہار ہاتھ اور اس کا سیاہ چمڑے کا اوور کوٹ برف سے سفید ہو چکا تھا۔ احمر مجھے آتے دیکھ کر وہاں سے اندر راہ داری کی جانب چلا گیا۔ فورڈ نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”میرے لیے یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ تم نے اپنے ساتھ اپنی پیاری دوست کو بھی مشکل میں ڈال دیا۔“ میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا ”اُسے کچلنے والی وین بھی بالکل ویسی ہی تھی، جیسے اُس روز تمہارے پاس تھی“ فورڈ چونکا۔ ”نہیں، تم غلط سوچ رہے ہو۔ تم تو ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان کیوں پہنچائیں گے بھلا.....؟“ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ”کیا مطلب، کھل کر بات کرو۔“ برف نے ہمارے بالوں میں چاندی بھرنا شروع کر دی تھی۔ فورڈ نے اپنے شانے جھاڑے ”میں آج تمہیں یہاں ایک پیش کش کرنے آیا ہوں۔ تم اگر ہمارے لیے کام شروع کر دو، تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری اور تمہارے بھائی سمیت تمہارے سب ہی دوستوں کی تمام تکالیف کا نہ صرف خاتمہ ہو جائے گا، بلکہ نیویارک اور امریکا سے زیادہ محفوظ جنت تمہیں دنیا بھر میں کہیں نہیں سوچھے گی۔“ ”اور تمہارے لیے مجھے کرنا کیا ہوگا۔“ فورڈ مسکرایا ”کچھ زیادہ نہیں۔ بس دنیا بھر میں کہیں بھی امریکی مفادات کو کوئی زک نہ پہنچ پائے اور ہمارے شہری سدا محفوظ رہیں، اتنا ہی خیال رکھنا ہوگا تمہیں۔ ہم سب بھی یہی کام کرتے ہیں اور اس کام کے لیے عوض تمہاری سات نسلوں کی ہر ضرورت اور عیش و آرام کا خیال رکھنے کی ضمانت تمہیں پیشگی دی جائے گی۔“ میں نے اس کی بات پکڑی ”گویا اگر میں ”ہاں“ نہیں کرتا، تو میری حفاظت کی ضمانت بھی نہیں دی جاسکتی۔ مطلب سی آئی اے مسلمانوں کو اپنا شہری نہیں سمجھتی اور ہم چاہے یہیں کی پیداؤں بھی رکھتے ہوں، تب بھی ہمارے مفادات کا تحفظ تم میں سے کسی کا بھی فرض نہیں بنتا؟“ فورڈ کا چہرہ سپاٹ رہا۔ ”تم بہت جذباتی ہو اور یہی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے۔ تم سے کہیں زیادہ عقل مند تو تمہارا بھائی ہے۔ جس نے نہ صرف ہماری بات غور سے سنی، بلکہ اس پر غور کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔“ مجھے فورڈ کی بات سن کر زور کا جھنجھلاکا ”کیا..... کیا کہا تم نے؟ میرے بھائی سے تم لوگوں کی ملاقات کب ہوئی؟“ ”دودن پہلے..... وہ کافی سمجھ دار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد ہمارے نیٹ ورک کا حصہ ہوگا۔ میری یہ پیش کش تمہارے لیے بھی قائم رہے گی۔ ہو سکے، تو تنہائی میں بیٹھ کر کھلے دل و دماغ سے اس پر غور کرنا۔“ فورڈ اپنی بات ختم کر کے زمین پر جمی برف اپنے جوتوں سے کھرچتا، وہاں سے واپس پلٹ گیا، لیکن میرے ذہن و دل پر جو رنگ کی تہہ چڑھتی جا رہی تھی، اسے کھرچنے کے لیے مجھے کوئی اوزار میسر نہ تھا۔ میں جانے کتنی دیر وہیں برف کا پتلا بنا کھڑا رہا اور پھر بہت دیر بعد کسی نے جب عقب سے میرا نام پکارا تو چونک کر پلٹا۔ وہ بسام تھا، لیکن آج اس کی آواز اتنی اجنبی ہو گئی تھی کہ میں سن کر بھی پہچان نہیں پایا۔ ایک وہ وقت بھی تھا، جب ہم بنا کچھ کہے ایک دوسرے کی آہٹ بھی پہچان لیتے تھے۔ وہ چند قدم چل کر میرے قریب آیا۔ میں نے اس کے پس منظر میں راہ داری کے شیشے کے پیچھے صنم کبیر کو بھی کھڑے دیکھا۔ وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ بسام بولا ”یہاں باہر کیوں کھڑے ہو، ٹھنڈ لگ گئی تو بیمار ہو جاؤ گے۔ اندر چلو مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا ”سی آئی اے کا مخبر بننے کے بارے میں.....؟“ ”بسام چونکا۔ ”یہ تم سے کس نے کہا؟“ ”اُسی نے، جو دودن پہلے تمہیں بھی یہ پیش کش کر چکا ہے اور جس کے پروپوزل پر تم نے ”غور“ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔“ بسام کو غصہ آ گیا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ میں نے صرف حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے فورڈ سے اتنا کہا تھا کہ میں خود بھی امریکی ہوں اور مجھے امریکا اور اس کے باسیوں کے تمام مفادات اتنے ہی عزیز ہیں، جتنا کہ اس کی انجینی کو“ میں دو قدم بڑھ کر بسام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”خوب! تمہاری اس مفاہمت کی پالیسی سے وہ ضرور خوش ہوا ہوگا۔ تم نے اس سے یہ پوچھنے کی زحمت کیوں نہیں کی کہ آخر ہم مسلمانوں کا کیا قصور ہے اور ان کی لڑکائی ہوئی ہر تلوار صرف ہم ہی پر کیوں گرتی ہے۔“ بسام نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا ”کیوں کہ ہر بار ان پر کیے گئے حملے کے پیچھے انہیں کسی مسلمان کا چہرہ ملتا ہے۔ ہم لوگ اپنے ملک چھوڑ کر یہاں آ کر بس جاتے ہیں۔ برسوں یہاں سے کما کما کر واپس اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں اور پھر ایک دن اپنے تمام ”گناہوں کے کفارے“ کے طور پر یہیں کوئی تخریب کاری کر جاتے ہیں اور اب اس واپس یہاں کے مسلمانوں کی نئی نسل بھی جتلا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ نافرمان سکوآر کیس، جس کی وجہ سے آج ہم سب کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔ یہ نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے، جنگ اگر امریکا، سی آئی اے یا اُس کی پالیسیوں سے ہے، تو معصوم شہریوں کو نشانہ بنانا کہاں کا انصاف ہے۔ اگر اس بات کو کھلیہ بنا کر اس جنون کو ہوا دی جائے کہ یہاں کے شہری بھی ٹیکس دے کر اور خاموش رہ کر اس جنگ کا حصہ بنتے ہیں، تو پھر یہی فارمولا خود ان مسلم ممالک میں بھی



معصوم شہریوں کے قتل عام پر بھی لاگو ہوگا، جن کی سرکار اس جنگ میں امریکی حکومت کی حامی ہے۔ وہاں جب مسلمان خود اپنے مسلم ممالک کے مسلمانوں کا گلا یہ سوچ کر کاٹتا ہے کہ یہ لوگ بھی خاموش رہ کر اور اپنے ملک کو امریکا کی حمایت اور مدد کے لیے ٹیکس دے کر برابر کے مجرم ہیں، تو پھر ان کی ہر وحشت بھی تو جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ نقصان تو دونوں طرف معصوموں کا ہو رہا ہے۔ یہاں کی اور وہاں کی حکومتوں کو بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے بسام کو بات پوری کرنے کا موقع دیا اور پھر بولا ”خوب..... فورڈ نے ایک ملاقات ہی میں تم پر اپنا خاص اثر چھوڑا ہے۔ اتنی اچھی وکالت تم نے آج سے پہلے کبھی اور کسی کی نہیں کی۔ اب غور سے میری بات سنو۔ کوئی مسلمان اس دہشت گردی کی حمایت نہیں کرتا۔ چاہے وہ یہاں امریکا کے شہریوں کے خلاف ہو، پاکستان میں ہو یا انڈیا میں..... یاد دنیا کے کسی بھی کونے میں۔ دہشت گردی صرف دہشت گردی ہی کہلاتی ہے۔ یہاں امریکا میں تو پھر بھی ان کے اپنے ہم نسل شہریوں کے کچھ حقوق باقی ہیں۔ باقی ممالک میں شہری بے چارے کسی گنتی میں نہیں آتے۔ حقوق اور حکومت کی حمایت تو بہت دور کی بات ہے۔ ان پر تو پالیسیاں مسلط کر دی جاتی ہیں، لہذا انہیں اپنی حکومت کے گناہوں کی حمایت کی سزا میں قتل کرنا انسانیت کے قتل سے بھی زیادہ گھناؤنی بات ہے۔ میں نے کبھی ٹائمز اسکوائر کیس یا اس جیسی کسی بھی دوسری واردات کو اچھا کہا، نہ اس کی حمایت کی ہے۔ اور تم بھی اب دہشت گردی کا وہی ایک چہرہ بہ طور شناخت مقرر کر رہے ہو، جو یہاں کی حکومت نے کر رکھا ہے، ”مسلمان کا چہرہ.....“ اور یہی میرا تم سب سے اختلاف ہے کہ دہشت گرد اور تخریب کار کو مذہب کی پہچان سے ہٹ کر صرف ایک جنونی انسان کی شناخت کیوں نہیں دی جاتی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ زیادہ تر وارداتوں کے پیچھے ہمیں یہی پہچان ملتی ہے، لیکن پوری دنیا میں دہشت گردی کی جو یہ جنگ چھڑی ہوتی ہے۔ گنوگے تو اس گنتی میں تمہیں ایسے بہت سے دوسرے مذاہب اور نسلوں کے چہرے بھی ملیں گے، جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔“ میں نے اپنی بات ختم کی تو میرا سانس جذبات کی وجہ سے پھول چکا تھا اور تیز گرتی برف کے سبب نختوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ دور خشے کی راہ داری سے بہت سی برف پھسل کر نیچے گری تو وہاں پریشانی کے عالم میں کھڑی صنم کبیر چونک کر بے خیالی میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں اور بسام کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے خلا میں کسی انجانی چیز کو نکتے رہے۔ پھر بسام نے حتیٰ لچھے میں پوچھا ”گویا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم اپنے ساتھ ہم سب کو بھی مزید مشکلات میں ڈالتے رہو گے۔ آج صرف تمہاری وجہ سے وہ معصوم لڑکی اندر بستر پر پڑی اپنی ذوقی سانسیں گن رہی ہے اور اگر اُسے کچھ ہوا تو اس کے ذمے دار بھی صرف تم ہو گے۔“ میں نے زور سے چلا کر بسام کی بات کاٹ دی ”کچھ نہیں ہوگا اے۔ کچھ نہیں۔ میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ اور رہی بات تمہاری تو اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہاری زندگی میں مزید مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہوں، تو تمہیں اجازت ہے۔ کل کے اخبار میں مجھ سے اپنی لافلتی کا باقاعدہ ایک اعلان چھپوا دو کہ تمہارا میرے قول و فعل سے آئندہ کوئی تعلق نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد تمہیں کوئی میری وجہ سے ٹک نہیں کرے گا اور تمہاری سی آئی اے بھی خوش ہو جائے گی۔“ سی آئی اے کے طعنے پر بسام کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ دانت چبا کر بولا ”ٹھیک ہے، میں ”اپنی“ سی آئی اے کو خوش کرتا ہوں اور تم اپنے ”جنونی انتہا پسند“ گروپ کو راضی رکھو۔“ بسام تیزی سے پلٹا اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ تقدیر ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ کون جانتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم دو بھائی، جو ایک دوسرے کے ہناسانس بھی نہیں لیتے تھے، ایک دوسرے کو ایک نئی شناخت کا الزام دے کر یوں ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں گے۔

دوپہر سے شام ہو گئی، لیکن پُر واک کی حالت بدستور نازک تھی۔ میرا دل اندر سے یوں کٹ رہا تھا، جیسے کوئی رنگ آلود آری سے اس کے ٹوٹے کر رہا ہو۔ اچانک میرے ذہن میں کسی وقت کی دی ہوئی جینی کی بددعا کے لفظ گونجے ”خدا کرے آیان..... تمہیں بھی محبت ہو..... اور جب کبھی ہو تو ایسی ہو کہ اس کا ٹاٹا پانی بھی نہ مانگے۔“ میں نے زور سے ذہن کو جھٹکا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے، کہیں یہ محبت تو نہیں۔ نہیں نہیں..... میں..... اور محبت؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صرف اس معصوم لڑکی سے دوستی کا دکھ ہے، جو مجھے یوں کانٹے جارہا ہے، لیکن میں بسام سے پُر واک کو کچھ ہو جانے کی بات پر اتنا الجھا کیوں تھا۔ اُس نے تو بس ایک خدشہ ہی ظاہر کیا تھا، مگر میرا دل اندر سے یوں لرز کیوں گیا تھا۔ میرا تمام وجود پل بھر ہی میں کانپا کیوں؟ کیا محبت اپنے ساتھ اتنے شدید وسوسے اور جان لیوا خوف بھی لے کر آتی ہے۔ مجھے بار بار اور وہ رہ کر پُر واک کی ہر بات، اس کی مسکراہٹ اور اس کا وہ زندہ دل انداز یاد آنے لگا تھا اور پھر جب مجھے اس کی وہ برستی بارش میں اسٹینڈیم میں کبھی بات یاد آئی، تو تمام اعصاب جیسے ریزہ ریزہ ہونے لگے۔ ”آیان..... مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں تمہاری محبت میں جتنا نہ ہو جاؤں۔“ ٹھیک اسی کی طرح آج میرے دل میں بھی یہ ”خوف محبت“ جاگنے لگا تھا۔ میں اور پُر واک بھی کتنے عجیب لوگ تھے، لوگ محبت میں جتنا ہونے کا جشن مناتے ہیں اور ہم کسی موذی مرض کی طرح اس کے خوف سے سوگ منا رہے تھے۔ پُر واک تو پھر بھی اپنے دل کی بات بتانے کی ہمت رکھتی تھی، پر جانے میں اتنا بہادر تھا بھی یا نہیں؟ اس وقت میرا دل شدت سے یہ خواہش کر رہا تھا کہ کاش پُر واک اپنی آنکھیں کھولے اور میں اسے بتاؤں کہ میرے اندر بھی ”اندیشہ محبت“ کے وسوسے پلنے لگے ہیں۔ چلو ہم دونوں کسی ”میسجائے عشق“ کے آستانے پر جا بیٹھیں اور اس کے در سے تب تک نہ اٹھیں، جب تک کہ وہ ہمارے اس زہر عشق کا کوئی تریاق نہ ڈھونڈ لے۔ اس عشق کے خونی اثر دھم کے بل نہ کھول دے، جو اس نے ہماری روحوں کے گرد گس دیے تھے۔ جانے کیوں..... لیکن ٹھیک اس ایک لمحے میں مجھے ”محبت“ سے شدید خوف بھی محسوس ہوا۔ رات نے اسپتال کی راہ داریوں میں ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ باہر دالان کے درختوں سے تو گہری شام کی دوستی عصر کے بعد ہی شروع ہو چکی تھی۔ جنگلوں میں شاہیں بہت جلد اتر آتی ہیں۔ اسپتال کا بڑا دالان بھی اس وقت برف سے اٹے درختوں کا ایک ایسا ہی جنگل لگ رہا تھا۔ طلبہ کی ٹولیاں اب بھی راہ داریوں میں بکھری ہوئی تھیں اور وہ عملے کی بار بار تلقین کے باوجود وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ سب ہی پُر واک کے لیے اداس اور فکر مند تھے۔ چانک کسی سنان راہ داری سے کسی پشتو پٹے کی تان گونجی۔ یہ ضرور زک خان ہوگا، جو ابھی چند دن پہلے پاکستان سے وظیفہ لے کر ہماری یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا اور اس نے آتے ہی مسلم گروپ جوائن کر لیا تھا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ اس شاعری کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے ساتھیوں کو سن رہا تھا۔ مجھے ان کے درمیان جینی اور ایرک کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ زک کی آواز بڑی میٹھی تھی۔ ”اوہ بی بی شیریں..... اے میرے زرد گلاب..... مجھ پر اپنی ہانہوں کا گھیرا ڈال دو..... مجھے اپنا ہم راہی بنا لو..... یا پھر مجھے اپنی شال بنا لو کہ سدا کے لیے تمہاری زلفوں کا ساتھ مل جائے۔“ ہاں..... پُر واک بھی تو بی بی شیریں کی طرح ایک زرد پھول لگ رہی تھی۔ ایک ایسا زرد گلاب، جسے اس کی شاخ سے جدا کر دیا گیا ہو اور اب وقت دھیرے دھیرے اس کی کول پگھڑیوں سے شبنم اور تازگی کشید کر کے اسے مرجھا رہا ہو۔ میں بہت دیر تک کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکتا اور مشینوں کی ”ہیپ ہیپ“ کی آواز سنتا رہا، پھر جانے کب رات بیتی اور کب نیا سویرا اسپتال کی راہ داریوں کی درزوں سے اندر جھانکنے لگا۔ کبھی کبھی رات کیسے چھم سے اچانک اتر آتی ہے اور کبھی سویرا اپنے پُر پھیلائے میں کتنا زیادہ وقت لیتا ہے۔ شاید ہماری زندگیوں کا فلسفہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم اپنے ارد گرد دولت، سکون، آرام و آسائش اور رشتوں کا جال پھیلانے میں اپنی تمام عمر بتا دیتے ہیں اور موت کا صرف ایک جھماکا، چند لمحوں ہی میں چار سواں دھیرے کر جاتا ہے۔

آج باہر سیدی اور عامر بن حبیب کی ایک ساتھ اور ایک ہی عدالت میں پیشی تھی۔ میں نے احمر اور بلال کو ان کی خبر لینے کے لیے بھیج رکھا تھا، لیکن ان دونوں نے واپس آتے آتے سہ پہر کر دی۔ ان دونوں کے چہرے دیکھ کر میرا پہلے سے ڈوب ہوا دل بیٹھ سا گیا۔ ”کیا ہوا، سب خیر تو ہے ناں.....؟“ بلال نے مایوسی سے سر ہلایا ”اچھی خبر نہیں ہے۔ عدالت نے باہر اور عامر کو ڈی پورٹ کر کے واپس ان کے ممالک بھیجنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ انہیں کل کی فلائٹ سے ملک بدر کر دیا جائے گا۔“ بلال کی بات سن کر میرے ہاتھ میں پکڑا کافی کا گگ چھوٹ کر زمین پر گر ا اور ایک زوردار چھٹا کے سے ٹوٹ گیا۔

(جاری ہے)





.....بشیر ندیم.....

بشیر ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبیر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سائے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اکِ مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹنے والے لگ کے چھٹا کے کی آواز سنسان راہ داری میں دور تک سنائی دی ہوگی، تب ہی ایرک، جم اور جینی سمیت سب ہی میری جانب دوڑے آئے، ”کیا ہوا.....؟“ میں نے خالی نظروں سے فرہاد کی طرف دیکھا، ”عامر اور بابر کو ملک بدر کرنے کے احکامات آگئے ہیں۔“ کچھ دیر کے لیے سب ہی خاموش ہو گئے اور پھر سب ہی ایک دم بولنے لگے۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے..... اپیل کا حق تو ملنا چاہیے تھا..... یہ تو سراسر نا انصافی ہے.....؟“ قریب سے گزرتی دوزخوں نے گھور کر سب طلبہ کو دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب راہ داری سے نکل کر باہر برقیے والاں میں آگئے۔ فرہاد نے غصے سے جم اور ایرک کی طرف دیکھا ”سن لیا تم لوگوں نے عدالت کا فیصلہ، یہ ہے تمہارا امریکی انصاف.....؟ آج کچھ نہیں کہو گے، اپنے امریکا کی حمایت میں؟“ میں نے فرہاد کو جھاڑا ”فضول باتیں مت کرو، انصاف کو صرف انصاف ہی رہنا چاہیے۔ جب وہ امریکی، روسی، جاپانی یا پاکستانی انصاف بن جائے، تو انصاف نہیں رہتا، صرف ایک مذاق بن جاتا ہے اور اس مذاق میں جم اور ایرک کا کوئی قصور نہیں۔“ اصرار چلا یا ”لیکن ہم امریکی عدالتوں کو مسلمانوں کے ساتھ یہ گھناؤنا مذاق نہیں کرنے دیں گے۔“ اسنے میں اندر سے صدمہ کبیر بولکھائی ہوئی سی باہر آئی۔ ہم سب کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”وہ..... وہ پُر واکو ہوش آرہا ہے۔“ سب اندر کی جانب لپکے۔ پُر دانے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولیں اور پھر موند لیں۔ سب شیشے کی دیوار کے پرے کھڑے اس کی الجھتی سانسیں گنتے رہے۔ جانے وہ کس اذیت سے گزر رہی ہوگی۔ ڈاکٹر ز اور دیگر عملے نے چند لمحوں ہی میں جانے کیا کچھ کر ڈالا، آکسیجن بدلی گئی، کچھ انجکشن لگائے، دل کی حرکت گئی گئی۔ برقی جھٹکا دینے والے آ لے تیار کر لیے گئے، لیکن پُر واکو ہوش کی دنیا میں واپس چلی گئی۔ بوڑھا ڈاکٹر باہر نکلا تو ہم نے اسے گھیر لیا ”وہ کچھ دیر کے لیے ہوش میں آئی تھی، لیکن پھر سے خواب میں چلی گئی ہے، لیکن یہ بہتر ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے۔ امید ہے، اگلی بار اس کے ہوش کا وقفہ طویل ہوگا۔ آپ لوگ دعا کریں۔“ ڈاکٹر ہمیں تسلی دے کر آگے بڑھ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے تو دعا کرنا ان دونوں ہی میں سیکھا ہے۔ اس سے پہلے تو شاید مجھے ٹھیک سے ہاتھ اٹھانا بھی نہیں آتا تھا، لیکن صرف ہاتھ اٹھالینے سے دعا کے تقاضے تھوڑا ہی پورے ہو جاتے ہیں۔ دعا کے آداب تو کچھ اور ہیں۔ دعا کی قبولیت تو کسی اور جذبے سے مشروط ہوتی ہے۔ شاید اس وقت پُر واکو کے لیے دعا مانگتے وقت، ہم سب کے اندر بھی وہی جذبہ کروٹیں لے رہا تھا۔ خود کو اللہ کی بارگاہ کے سپرد کر دینے کا جذبہ۔ اپنا ہر احساس اس دعا کے لیے سرگوں کر دینے کا جذبہ۔ پھر شام ڈھلی اور پھر وہی رات ہمارے دل کے اندھیروں کو مزید گہرا کرنے کے لیے درود دیوار پر مسلط ہو گئی۔ دکھ کی راتیں کتنی طویل ہوتی ہیں۔ شاید دکھ ہمارے گزرتے وقت کا پیمانہ بھی بدل دیتا ہے، ورنہ آس پاس دوسروں کے لیے تو وقت کی وہی پرانی رفتار رہتی ہے۔ اگلی صبح دس بجے بابر اور عامر کی فلائٹ تھی، جوان دونوں کو ایک ساتھ پہلے قاہرہ لے جاتی، پھر وہاں سے الگ الگ ان کے گھروں کو جانے والے جہاز میں انہیں بٹھایا جاتا تھا۔

میں ایئر پورٹ پہنچا تو ڈیپارچر لاؤنچ کے باہر مسلم طلبہ کا ایک جم غفیر اکٹھا تھا۔ عامر اور بابر کو رخصت کرنے کے لیے صرف یونیورسٹی کا مسلم گروپ ہی نہیں، نیویارک کی سب ہی یونیورسٹیز کے مسلم طلبہ جان۔ ایف کینیڈی ایئر پورٹ کے بیرونی لاؤنچ میں جمع تھے۔ عامر اور بابر کو ابھی تک حکام ایئر پورٹ نہیں لائے تھے۔ مجھے رات کو احقر نے بتایا کہ پرسوں رات دوبارہ ٹائمز اسکوائر پر کوئی مشکوک گاڑی کھڑی ملی تھی، جس کی اطلاع ملتے ہی ٹائمز اسکوائر کا تمام علاقہ فوراً خالی کروا کر سیل کر دیا گیا، لیکن گاڑی سے کچھ برآمد نہیں ہوا، البتہ اگلے روز سرکاری وکیل نے عدالت میں گزشتہ رات کے اس واقعے کو خوب



اچھالا اور نمک مرچ لگا کر اس بات کو بھی عامر اور بابر کی گرفتاری کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کے طور پر پیش کیا۔ عدالت نے بھی وکیل کے دلائل کو اہمیت دی کہ جب تک عامر بن حبیب اور بابر سیدی جیسے لڑکے اسٹوڈنٹ لیڈر کے روپ میں نیویارک کی یونیورسٹیز میں مسلم طلبہ کے جذبات بھڑکانے کے لیے موجود ہیں، ایسے واقعات ہوتے رہیں گے، لہذا عدالت نے کافی ”سوچ بچاؤ“ کے بعد دونوں طالب علموں کو امریکا بدر کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ میں ابھی تک اسی سوچ میں گم تھا کہ آخر وہ مشکوک گاڑی دوبارہ وہیں ٹائمز اسکوئر کے علاقے تک پہنچی کیسے؟ پچھلی بار جب وہ پاکستانی طالب علم گاڑی کھڑی کر کے وہاں سے نکلا تھا تو اس پاس لگے درجنوں کیمروں نے اس کی فلم بنائی تھی، لیکن اس دوسری گاڑی کی کوئی فلم کیوں منظر عام پر نہیں آئی، جب کہ پچھلے کیس کے بعد وہاں کیمروں کی تعداد بھی گنی کر دی گئی تھی، اچانک ایک شور سا اٹھا اور نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کی بہت سی گاڑیاں نیلی، سرخ بتیوں کی چکاچوند میں ایئر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ آج برف باری رکی ہوئی تھی، لیکن سڑکوں کے گرد جمع کی گئی برف میں سے اب بھی دھواں سا اٹھ رہا تھا، ٹھیک اس دھوئیں کی طرح، جو اس وقت ہمارے دلوں کو سلگا رہا تھا۔ عامر اور بابر گاڑی سے اترے تو دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر دل پر بہ یک وقت کئی چھریاں سی چلی گئیں۔ لڑکوں نے شدید نعرے بازی شروع کر دی۔ نیویارک پولیس نے اپنی طرف سے ہر ممکن حفاظتی اقدام کر رکھا تھا۔ انہیں طالب علموں کے اس رد عمل کا خوب اندازہ تھا۔ میں اس راستے پر جا کھڑا ہوا، جہاں سے بابر اور عامر کو لاؤنج کے اندر لے جایا جانا تھا۔ پولیس نے مجھے ہٹانے کے لیے دھکا دیا تو اس پاس بکھرے طالب علم ان سے الجھ پڑے۔ شدید دھکم پیل اور نعرے بازی شروع ہو گئی۔ میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا اور میرے اس پاس لڑکوں نے ایک مضبوط حصار بنالیا۔ وہ مجھ پر برسائی جانے والی لالٹھیاں اپنے جسم پر جھیلنے رہے، لیکن پولیس کو مجھ تک پہنچنے سے روک رکھا۔ نیویارک کا تمام میڈیا یہ ساری ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی لائیو نشریات کے ذریعے تمام امریکا میں نشر کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں عامر اور بابر بھی مجھ تک پہنچ گئے۔ عامر نے میری آنکھ سے بہتے آنسو کو اپنی ہتھیلی سے صاف کیا ”میں نے تم سے کہا تھا نا آیان، ایک وقت آئے گا کہ یہ سب تم پر اپنی جان لٹانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مجھ سے وعدہ کرو دوست، تم ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گے۔ میں اور بابر یہاں نہیں ہوں گے، لیکن ہمارے دل یہیں دھڑکتے رہیں گے، تم سب کے پاس۔“ میں نے عامر کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں بہت تنہا ہو جاؤں گا عامر، تم دونوں کے بغیر تو میں بالکل ادھورا ہوں۔“ پولیس عامر اور بابر کو آگے دھکیلنے کے لیے پورا زور لگا کر اور چیخ چیخ کے ہم سب کو راستے سے ہٹ جانے کی تنبیہ کر رہی تھی، لیکن طلبہ نے انہیں اس طرح الجھایا ہوا تھا کہ وہ ہم تینوں کی اس الوداعی ملاقات میں زیادہ رخنہ اندازی نہیں کر پارہے تھے۔ بابر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا۔ ”مجھے ایک بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا آیان..... ہم دونوں نے شروع کے دو سال اپنی دشمنی کی نذر کر دیے۔ کاش ہم پہلے دوست بن جاتے تو اب تک ہم نہ جانے کیا کچھ کر چکے ہوتے۔ بہر حال، اب تم ہی ہو، جو اس کشمکش کو پار لگاؤ گے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ مجھے اور عامر کو پُرہ وا کی صرف ایک جھلک دیکھنے کی اجازت مل جائے، لیکن ان بزدلوں نے ہمیں ہماری گھائل ساتھی کی مزاج پُرسی کی اجازت بھی نہیں دی۔ اپنا بہت خیال رکھنا جو شیلے لڑکے۔“ میں عامر اور بابر کے گلے لگ کر ان کے شانے بھگوتا رہا۔ وہ لوگ عامر اور بابر کو کھینچتے ہوئے، ڈیپارچر لاؤنج میں لے جانے میں کام یاب ہو گئے اور آخر کار مسلم طلبہ کے شدید نعروں کی گونج میں عامر اور بابر ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان دونوں نے بھیڑ میں ایک لمحے کے لیے پلٹ کر ہماری جانب دیکھا۔ بابر نے اپنی دو انگلیوں سے فلسطینیوں کا مخصوص نشان وی ”V“ بنا کر ہم سب کو ایک بار پھر فتح کی دعادی اور پھر دونوں ہجوم میں گم ہو گئے۔ میرے دل سے ایک آہ نکلی ”ہاں میرے دوست! ہمیں وہ فتح ضرور ملے گی، جو ازل سے ہماری تقدیر ہے۔ اور تمہارا بیروٹلم ایک بار پھر صرف تمہارا ہوگا۔ قبلہ اول آزاد ہوگا اور بابر سیدی کے بیٹے اس کے پوتوں اور نواسوں کو ان کے دادا اور نانا کی کہانیاں سنایا کریں گے کہ ان کی نسل کا ہیرو بابر سیدی کس طرح قبلہ اول پر آزادی کا جھنڈا لہرانے میں پیش پیش تھا۔ بیت المقدس کی بیرونی دیوار پر بابر جیسے کئی جانبازوں کے نام ہوں گے اور عامر بن حبیب وہاں کی آزادی کی پہلی باجماعت نماز کی قیامت کرے گا۔ ہاں..... لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔“ میں نم آنکھیں لیے واپس پلٹا تو مسلم طلبہ کا وہی جم غفیر، جو چند لمحے پہلے تک ایک آتش فشاں بنا پولیس سے لڑ رہا تھا، اب کسی پُر سکون گلہبشر کی طرح چپ چاپ اور اداس کھڑا تھا۔ احمر، بلال، حافظ، گلہبیل اور حتی کہ فرہاد، سب ہی آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ آج ان کا دوست، ان کا رہنما عامر اپنے یار غار بابر سیدی کے ساتھ ان سے رخصت ہو گیا تھا۔ دوسری یونیورسٹیز کے مسلم رہنما میری جانب بڑھے۔ ”تم خود کو تنہا مت سمجھنا آیان، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری ایک آواز پر ہم نیویارک کا پیہ جام کر دیں گے۔ یہ امریکی ہماری جان تو لے سکتے ہیں، لیکن آواز نہیں دبا سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ انہیں ہم سب کو ڈی پورٹ کرنے کے لیے امریکا کے ہر ایئر پورٹ کے تمام جہاز ایک قطار میں کھڑے کرنے ہوں گے، لیکن ہماری آواز سدا یہیں رہ جائے گی۔“

میں نے ان سب کو خاموش کروایا۔ ”میں اس وقت تم سب لوگوں سے صرف اتحاد کا تقاضا کرتا ہوں، ایک ایسا اتحاد، جس میں ہمارا کوئی بھی دشمن نقب لگا کر دراز نہ ڈال سکے۔ عامر اور بابر کی ملک بدری تو صرف ابتداء ہے۔ ہمیں ابھی اس جیسے ان گنت امتحانات سے گزرنا ہوگا، شاید ہماری باقی تمام عمر یہی سزائیں جھیلنے ہی گزر جائے گی، لیکن ہمیں شیخ الکریم کی ہدایت کے مطابق ہر جنگ کا سامنا نظم و نسق کے ہتھیار سے کرنا ہوگا۔ بولو، تم لوگ میرا ساتھ دو گے؟“ ایئر پورٹ طلبہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ”ہاں..... ہم تمہارا ساتھ دیں گے آیان۔ ہمیشہ ساتھ دیں گے۔“ ہم لوگ ایئر پورٹ سے باہر نکلے تو مرکزی شاہراہ پر مڑنے سے پہلے ہی میرے فون پر جینی کا نمبر جھنگامنے لگا۔ میں نے دھڑکتے دل سے، جلدی سے فون کان سے لگایا، تو میرے ہاتھ باقاعدہ لرز رہے تھے۔ دوسری جانب جینی کی آواز میں بھی لرزش تھی۔ ”آیان..... پُرہ وا کو ہوش آ رہا ہے، تم جلدی آ جاؤ۔“ اب میں اس بھولی جینی کو کیسے بتاتا کہ دنیا میں کبھی ہماری ”جلدی“ نہیں چلتی۔ ہم اپنی مرضی کے غلام بن جائیں، تب بھی دنیا کے راستے، موڑ اور فاصلے پیروں کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ سو، مجھے



بھی اسپتال پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ گیا۔ تمام راستے میرا دل ان ہی دوسو سوں سے گھرا رہا کہ پُر داکھیں پھر سے بے ہوشی کی دنیا میں نہ چلی جائے۔ پُر داکھ کے کمرے میں پہنچا تو تمام دوست اسے گھیرے کھڑے تھے اور نرس ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ فی الحال مریض کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ پُر داکھ نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور اس کے خشک ہونٹوں پر دنیا کی سب سے تازہ مسکان ابھرا آئی۔ نرس نے ہمیں کمرے سے نکل جانے کا آخری حکم باقاعدہ انتظامیہ کو شکایت کرنے کی دھمکی کے ساتھ سنایا، تو ہمیں وہاں سے نکلتے ہی بنی۔ میں وہاں سے نکل کر شیشے کی دیوار کے پرے آکھڑا ہوا، جہاں سے میں اب بھی پُر داکھ کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پہ گزشتہ روز کے مقابلے میں آج زندگی کی لہر زیادہ واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں بہت دیر یوں ہی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر مجھے اپنے شانے پر جینی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا ”وہ سنبھل رہی ہے آیاں.....“ اور جانے کیوں میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ وہ صرف تمہاری دعاؤں کے جواب میں واپس پٹلی ہے، کیوں کہ میں جانتی ہوں، محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔“ میں نے چونک کر جینی کی طرف دیکھا۔ ”ہاں آیاں! تمہارا رُواں رُواں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تمہیں پُر داکھ سے محبت ہوگئی ہے۔ ایسی محبت، جو موت کے منہ سے بھی روح کو واپس کھینچ کر بدن میں بھر سکتی ہے۔“ میں چپ چاپ کھڑا حیرت سے جینی کی باتیں سنتا رہا۔ شاید یہ محبت نامی جذبہ باقاعدہ کسی اعلان کی صورت ہم پر وارد ہوتا ہے۔ ایک ایسا اعلان، جو صرف اسی کو سب سے آخر میں سنائی دیتا ہے، جس کا نام اس محبت کی تحفہ پر سب سے اوپر لکھا ہو۔ شام تک پُر داکھ کی حالت مزید بہتر ہوگئی اور ڈاکٹر نے ہمیں چند لمحوں کے لیے اس سے ملاقات کی اجازت بھی دے دی۔ میں نے پُر داکھ کا ہاتھ دھیرے سے دبایا۔ ”کیسی ہوس پُر داکھ میرا خان..... اب ہمیں مزید کتنے روز اس ہولناک اسپتال کی ان بے جان راہ داریوں میں شہلاؤ گی؟“ وہ دھیرے سے مسکائی ”جب تک نصیب میں یہ بستر اور تقدیر میں یہ زخم لکھے ہیں۔“ فرہاد نے جلدی سے دخل اندازی کی، ”بس بس..... اتنی مذہبی باتیں نہ کرو۔ ویسے بھی مرد مذہبی باتیں کرنے والی عورتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔“ ہم سب فرہاد کی بات سن کر ہنس پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ پُر داکھ کھوئی کھوئی سی ہے۔ اس کا یہی کھویا پن اس وقت بھی قائم رہا، جب اگلی صبح نیویارک پولیس اس کا بیان لینے کے لیے اسپتال پہنچی۔ پُر داکھ نے سیاہ وین کے ذکر پر گول مول سا جواب دیا کہ اسے یاد نہیں کہ ڈرائیور کس حلیے کا شخص تھا، حالانکہ وہاں صرف پُر داکھ ایسی تھی، جس نے وین ڈرائیور کو بالکل قریب سے براہ راست دیکھا تھا، کیوں کہ وین سے نکلنے والے وقت اس کے چہرے کا رخ سیدھا وین کے اسٹیرنگ پر بیٹھے شخص کی جانب تھا۔ میں نے پولیس کے سامنے پُر داکھ سے اس بارے میں کوئی بات کرنے سے احتراز کیا، لیکن پولیس کے کمرے سے نکلتے ہی میرا سوال لبوں پر آگیا۔ ”تم نے پولیس والوں سے یہ کیوں کہا کہ تم نے ڈرائیور کو نہیں دیکھا، جب کہ تم نے اس کی واضح جھلک ضرور دیکھی ہوگی۔ چہرہ تو میرا دوسری جانب تھا، کیوں کہ تم نے مجھے پلٹنے سے پہلے ہی دھکیل دیا تھا۔“ پُر داکھ نے بات ٹالی، ”تم نے سنائیں مسلم کاؤنسلر، مریضوں کو ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ تم طب کے اصولوں کے خلاف جا رہے ہو۔“ بات آئی گئی ہوگئی، لیکن میرے اندر یہ شک مزید تقویت کے ساتھ جڑ پکڑ گیا کہ پُر داکھ نے ڈرائیور کو شناخت نہیں بھی کیا، تو اسے دیکھا ضرور ہوگا۔ شام کو میں تقریباً ایک ہفتے بعد، کچھ دیر کے لیے کیمپس پہنچا تو ایک اور بری خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلبہ کی پُر داکھ کی جانب توجہ بٹ جانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گستاخانہ خاکوں کے سیمینار کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ پندرہ جنوری اس منحوس مقصد کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ میں نے شام ہی کو ڈین سے ملاقات کی کوشش کی، لیکن وہ تین دن کی چھٹی پر جا چکا تھا۔ میں نے طلبہ کو فی الحال ہاتھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر اور کارڈز اور بیسز کے ذریعے اپنا احتجاج جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں بہ یک وقت کئی خانوں میں بٹا جا رہا تھا۔ پُر داکھ کی جان لیوا حادثے سے واپسی، بسام کی سی آئی اے والوں سے ملاقاتیں، عامر اور بابری ملک بدری اور اب یہ سیمینار، کاش میرے ایک وجود کے کئی حصے ہوتے تو میں ہر حصے کو اس کا کام سونپ دیتا، لیکن یہ ہم انسانوں کی کتنی بڑی مجبوری ہے کہ ہمیں اپنے ایک اسی گھائل اور بوسیدہ وجود پر تمام قیامیں بہ یک وقت جھیلنی پڑتی ہیں۔ میں یونیورسٹی سے باہر نکلا تو فورڈ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑک کی دوسری جانب کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ بلایا، تو میں نے بایک ایک جانب کھڑی کر دی اور سڑک پار کر کے اس کے پاس جا پہنچا۔ فورڈ مسکرایا ”تمہاری دوست کی نئی زندگی تمہیں مبارک ہو، تم بہ یک وقت کئی محاذوں پر لڑنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔“ میں نے فورڈ کے لہجے میں کوئی تاثر تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی ”اور تم بہ یک وقت اپنے دشمنوں کو کئی محاذوں پر الجھائے رکھنے کے عادی معلوم ہوتے ہو، بڑی کامیاب حکمت عملی ہے، تم لوگوں کی۔“ فورڈ نے میری آنکھوں میں جھانکا ”تم پھر غلطی پر ہو، ہم تمہیں اپنا دشمن نہیں، دوست تھوڑے کرتے ہیں۔ اس روز ایئر پورٹ پر جس طرح نیویارک بھر کے مسلم طلبہ تمہارے لیے اپنے جسم پر لائٹھیاں کھا رہے تھے، دیکھ کر میرا یقین تم پر مزید پختہ ہو گیا ہے کہ تم ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہو۔ اگر اپنے ذہن سے یہ فرسودہ مذہبی جذبات نکال کر سوچو گے، تو تمہیں اس میں نہ صرف اپنا، بلکہ ان تمام جذباتی طلبہ کا بھی فائدہ نظر آئے گا، جو جنون کے تباہ کن راستے پر چلنے کی تیاری میں ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ایجنسیاں، انہیں ہمیشہ کے لیے امریکا بدر کرنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔“ میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا ”چلو فرض کرو، میں تمہاری بات مان کر تم لوگوں کے ساتھ آتا ہوں، تو تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔ ہماری یونیورسٹی میں تمام عالم اسلام کی دل آزاری کے لیے ایک سیمینار منعقد کروایا جا رہا ہے، کیا تمہاری سی۔ آئی۔ اے اسے منسوخ کروا سکتی ہے؟“ فورڈ سوچ میں پڑ گیا، ”میں نے ابھی تم سے کہا کہ ہمارا ساتھ دینے کے لیے تمہیں ان بوسیدہ مذہبی دیواروں کے حلقے سے باہر آنا ہوگا۔ ان خاکوں کی نمائش پہلی مرتبہ اور صرف نیویارک کی اس یونیورسٹی میں تو نہیں ہو رہی۔ یہ مسئلہ پرانا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے فیس بک پر بھی ایٹو اٹھایا گیا تھا اور بڑی بابا کار چلی تھی، لیکن تمہاری طرح کتنے ایسے ہوں گے، جنہوں نے فیس بک کا باقاعدہ بائیکاٹ ہی کر ڈالا ہو۔ کیا دنیا میں مسلمان صرف ”ٹم“ یا یہاں کا مسلم گروپ ہی رہ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم لوگ احتجاج نہ کرو، ضرور کرو، خوب مذمت کرو اس سیمینار کی۔ اپنا احتجاج دنیا کے سامنے درج کروانے سے تمہیں کوئی نہیں روک رہا، لیکن اپنے دل سے اس سیمینار کو سبوتاژ کرنے کا خیال نکال دو، جس بات کی اجازت نیویارک کا قانون دے چکا ہو، اسے روکنے کا اختیار تمہارے پاس نہیں ہے اور اگر ایسی کوئی کوشش زبردستی کی گئی، تو یاد رکھو کہ ہماری تم پر گہری نظر ہے۔ عامر اور بابری کے بعد تیسری گرفتاری تمہاری بھی ہو سکتی ہے اور یقین جانو، اس بار الزامات کی فہرست بہت لمبی ہوگی۔“ میں نے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ سجا کر فورڈ کی جانب دیکھا ”دھمکی دینے اور مجھے ذہنی طور پر اس گرفتاری کے لیے تیار کرنے کا بہت شکریہ آفیسر۔ تم تیرا زماؤ، ہم جگر آزمائیں گے۔“ میں نے سڑک پار کر کے دوسری جانب کھڑی اپنی بایک اشارت کی اور فورڈ کے نہایت قریب سے تیزی سے گزرتا ہوا، آگے بڑھ گیا۔ سٹی ہال کے چوراہے پر سُرخ ختی نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے پارک کی جانب کسی عمارت کا پچھلا حصہ ڈھایا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی کمریں ملے بٹانے کے لیے وہاں جمع تھیں۔ ایک جانب بڑا سا لکڑی کا بورڈ لگا تھا، جس پر سُرخ حروف میں بڑا سا ”زمین دوز پارکنگ“ لکھا تھا اور ایک تیر کے نشان سے پارکنگ کی جگہ کی نشان دہی کی گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایسا بورڈ تو میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر دوسرا جھماکا ہوا اور پھر تو ذہن میں دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور جب میں اسپتال پہنچا، تو مجھے یاد آچکا تھا کہ پُر داکھ کو کچلنے والی سیاہ وین میں نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ میں تیزی سے پُر داکھ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں نے شدید غصے کے عالم میں اس سے پوچھا، ”تم نے پولیس سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تمہیں تقریباً ختم کر دینے والی وہ سیاہ وین کون چلا رہا تھا، اب تمہارے چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، پُر داکھ میرا خان۔ کیوں کہ میں اس

درندے کو پہچان چکا ہوں۔“.....(جاری ہے)





.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک ثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroun.com.pk



پُر دانے گھبرا کر میری جانب دیکھا ”میں کبھی نہیں آیاں؟“ اتفاق سے اس وقت پُر دانے کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ ”ہاں..... میں نے وہ سیاہ وین سب سے پہلے، اس وقت اپنی یونیورسٹی کی پارکنگ لٹ میں دیکھی تھی، جب مائیکل گروپ نے پہلی مرتبہ عامر بن حبیب کا گروپ توڑنے اور مجھے اس میں شمولیت کے لیے رقم دینے کی پیش کی تھی، اور دوسری مرتبہ یہی وین مجھے ایک بار شمعون سے ملاقات کے وقت اس کے پس منظر میں کھڑی نظر آئی تھی۔ اگر میں سٹی ہال کے سامنے اپنی یونیورسٹی کی زمین دوز پارکنگ جیسا ایک بورڈ نہ دیکھتا، تو شاید کچھ دن مزید میری یادداشت سے یہ سب کچھ محو ہوتا، لیکن آج شاید یہ راز کھلتا ہی تھا، مگر تم نے ان لوگوں کو کیوں بچایا۔ بہر حال، اب شمعون اور مائیکل کے چل جانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں ابھی اسی وقت پولیس کو اپنا بیان دینے کے لیے جا رہا ہوں اور امید ہے، اس بار تمہاری گواہی میرے حق میں ہوگی۔“ میں واپسی کے لیے پلٹا تو پُر دانے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ”ٹھہرو آیاں! میری بات سن لو۔“ میں نے پلٹ کر پُر دانے کو دیکھا ”ہاں، یہ سچ ہے کہ میں نے شمعون کو اس روز چہرے پر مظہر لپیٹے وہ سیاہ وین چلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مائیکل اس کے پیچھے بیٹھا تھا، لیکن میں بات نہیں بڑھانا چاہتی۔ اسی لیے پولیس کے سامنے شمعون اور مائیکل کا نام نہیں لیا۔ اس سے ہوگا بھی کیا۔ انہیں یونیورسٹی سے نکال کر جیل ڈال دیا جائے گا اور ان کی جگہ کوئی دوسرا یہودی لڑکا لے لے گا اور ایک بار پھر ہم سے اپنی دشمنی نکالنے کی تازہ فکر میں لگ جائے گا۔ یہ جنگ کب ختم ہوگی۔ میں ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ چاہتی ہوں اور میں آج یہاں جنگ بندی کا اعلان کرتی ہوں اور تم بھی اس عمل میں میرا ساتھ دو گے۔ یہ میرا تم پر مان اور بھرم ہے۔“ میں زور سے چلا ”یہ جنگ ہم نے نہیں، انہوں نے شروع کی ہے مس پُر دانے میرا خیر خان..... وہ اس لڑائی میں اخلاق کی آخری حد بھی پار کر چکے ہیں اور تم اب بھی انہیں معاف کر دینے کی بات کر رہی ہو۔ جانتی ہو، ہم نے یہ پچھلے چند دن کس سولی پر، کس عذاب میں کاٹے ہیں۔ ایک پل میں ہزار بار جی کر مراہوں میں۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو جانتی ہو.....؟“ میں جذبہ کی رو میں کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔ پُر دانے چپ چاپ میری ڈانٹ سنی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی ”میں جانتی ہوں، آیاں..... تمہارا حلیہ ہی ساری داستان دہرانے کے لیے کافی ہے، جو یہاں تم سب پر لکھ لکھ جیتی ہے، لیکن یہ میری تم سے درخواست ہے۔ ہماری دوستی کی خاطر، میری خاطر، تم ان لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔ ہمیں ان فضول جھگڑوں سے آگے نکل کر سب سے پہلے اُس سیمینار کی بندش کا کچھ سامان کرنا ہوگا، جو ہماری روجوں میں چھید کرنے جا رہا ہے۔ اس وقت مسلم گروپ مزید کوئی انتشار اور ایسا کوئی بھی نقصان برداشت نہیں کر سکتا، جو ہمیں پھر سے بکھرے پتوں کی طرح جدا کر دے۔ عامر اور بابر کی ملک بدری کے بعد ان لوگوں کی نظر اب تم پر ہے اور ہم سب تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تمہاری گرفتاری کے بعد گروپ کی کمری ٹوٹ جائے گی۔ اس لیے میں اس بات کو یقیناً ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ ہمیں اپنے کل کے لیے اس آج کی قربانی دینا ہوگی، کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے آیاں.....؟“ میں لا جواب ہو گیا۔ پُر دانے دھیرے سے مسکرائی۔ ”مجھے تمہارے غصے سے ڈر لگتا ہے اور مریض کے لیے خوف بڑا نقصان دہ ہے۔ چلو، اب مسکرا دو۔“ میں نے پُر دانے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کسی بچے کی طرح اپنی خواہش پوری ہونے کے انتظار میں میرے چہرے کی طرف یوں دیکھ رہی تھی، جیسے میری مسکراہٹ نظر آتے ہی اس کی کوئی لائٹری نکل آئے گی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر خود بہ خود میرے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان اُبھر آئی اور پھر میں نے اس لمحے پُر دانے کی پریشانی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے لب ہی لیے، لیکن میں جانتا تھا کہ شمعون یا مائیکل میں سے جب بھی کوئی میرے سامنے آیا، تب مجھے خود پر قابو رکھنا بہت مشکل ہو جائے گا اور اگلے روز ایسا ہی ہوا۔ میں نے پارکنگ میں اپنی بائیک کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اوپر سے شمعون اور مائیکل نیچے اترتے نظر آئے۔ میرے قدم وہیں جم گئے۔ شمعون نے مجھے دیکھا، تو اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر اُبھرا۔ ”کیوں مسلم کاؤنسلر..... کہاں رہتے ہو آج کل، تمہاری لیڈری کا دور ختم ہوتا نظر آ رہا ہے مجھے۔“ میں نے اسے گھورا ”میرا زیادہ تر وقت آج کل سینٹرل اسپتال کی اس راہ داری میں گزرتا ہے، جس کے



ایک کمرے میں وہ معصوم لڑکی گھائل پڑی ہے، جسے کسی کم ظرف بزدل نے مجھ سے اپنی دشمنی نکالنے کی خاطر کچل ڈالا۔“ میری بات سن کر شمعون اور مائیکل دونوں کچھ گڑبڑا سے گئے۔ پھر شمعون ڈھٹائی سے بولا ”خاہر ہے، جب تم لوگوں کو یوں لاکارتے پھرو گے، تو دشمن تو پیدا ہوں گے اور اس کا نقصان تمہارے اپنوں کو بھی اٹھانا پڑے گا۔“ شمعون اور مائیکل نے بات ختم کر کے قدم

نیچے کی طرف بڑھائے اور ٹھیک اسی لمحے میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے آواز دے کر ان دونوں کو روکا ”رکو، ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کچھ حساب بے باقی کرنے ہیں مجھے تم دونوں سے۔“ شمعون اور مائیکل رک گئے، لیکن پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں چند سیڑھیاں اتر کر ان دونوں کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ آس پاس سے گزرتے چند لڑکے اور لڑکیاں، جو اپنی گاڑی وغیرہ پارک کر کے آجا رہے تھے۔ ہمیں سیڑھیوں پر آنے سامنے یوں تنا ہوا کھڑے دیکھ کر جلدی جلدی ادھر ادھر ہو گئے، کیوں کہ پچھلے چند دن کے دوران یونیورسٹی میں اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب ان میں سے کوئی بھی ہمارے جھگڑے میں پڑ کر یونیورسٹی سے باہر نہیں ہونا چاہتا ہوگا۔ شمعون نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ میں نے انتہائی تلخ لہجے میں الفاظ چبا کے پوچھا ”آج کل تم لوگ اپنی وہ سیاہوین یونیورسٹی نہیں لارہے، جسے میرے اوپر چڑھانے کی کوشش میں، تم لوگوں نے پُر اوپر چڑھا دیا، کیا کسی گیراج میں چھپا رکھی ہے، کیوں کہ پولیس کو ابھی تک وہ ملی نہیں۔۔۔۔۔“ میری بات کسی توپ کے گولے کی طرح ان کے سروں پر لگی۔ شمعون چیخ کر بولا ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم، کیا پورے نیویارک میں ایک وہی سیاہوین ہے، ہزاروں ویسی بلیک ویکٹوز ہوں گی اس شہر میں۔“ میرے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ ابھر آئی ”میرے شک کو یقین میں بدلنے کا شکریہ، تمہیں کیسے پتا چلا کہ جس وین نے پُر وا کو پکلا تھا، وہ کیسی تھی اور اس جیسی اور بہت سی گاڑیاں ہو سکتی ہیں، جب کہ وین کا ٹھیک حلیہ تو ابھی تک پولیس کو بھی نہیں پتا؟“ میری بات سن کر دونوں مزید الجھ گئے۔ مائیکل نے پریشانی سے شمعون کی طرف دیکھا۔ شمعون کڑک کر بولا ”تم ہمیں باتوں میں الجھا کر کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گاڑی اب تک کریش ہو کر اسکرپ کا حصہ بن گئی ہو اور اس کے ہزاروں حصے پورے امریکا میں پھیل چکے ہوں، لہذا اپنا وقت ضائع نہ کرو۔“ میں نے شمعون کے رینگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ تختی سے جمادیا۔ ”تم دونوں اپنے وقت کی فکر کرو۔ آج شام تک پولیس کو پُر وا کا تحریری بیان مل جائے گا، پھر اسے وہ وین کیسے تلاش کرنی ہے، یہ تم جانو اور نیویارک پولیس۔ میں چاہوں تو اسی وقت یہیں پارکنگ میں اپنے تمام حساب برابر کر سکتا ہوں، لیکن جب پولیس خود تم دونوں کو جھگڑیاں ڈال کر پوری یونیورسٹی کے سامنے لے جائے گی اور تین چار سال تم لوگ نیویارک کی کسی جیل کی روٹیاں توڑو گے، تو تمہارے پاس بہت وقت ہوگا، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا، کیوں کہ یونیورسٹی تو گرفتاری کے فوراً بعد تم دونوں کو رٹھی کیٹ کر ہی چکی ہوگی، اب جب تم لوگ جیل سے باہر آؤ گے، تو تب ہی بات ہوگی۔ فی الحال تم دونوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

میں انہیں ہرجا بگا چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھ کے اوپر یونیورسٹی کے بڑے دالان میں نکل آیا۔ آج آسمان اور سورج بادلوں کے ساتھ دھوپ اور سائے کی آنکھ بھولی کھیل رہے تھے۔ ویسی ہی آنکھ بھولی، جیسے میں اور بسام، بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے چھپنے کی باری پر بسام مجھے ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگا دیتا، تو میں خود ڈر کر رونا شروع کر دیتا تھا، کیوں کہ تب مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے اگر بسام نے مجھے نہ ڈھونڈ نکالا تو میں خود ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا اور پھر تقدیر نے ایسا کھیل کھیلا کہ ہم دونوں بھائی آخر کار ایک دوسرے کو کھو ہی بیٹھے۔ کبھی کبھی ہمارے بچپن کے کھیل جوانی میں بچ بھی ہو جاتے ہیں۔ بسام کی یاد آتے ہی میری پلکوں کے گوشے نم ہونے لگے۔ مجھے آج کل اس کی جتنی ضرورت تھی، اتنی شاید پہلے کبھی نہ رہی ہو۔ میں نے شمعون اور مائیکل کو پریشان کرنے کے لیے صرف ایک دھمکی ہی دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جس درد سے ہم ان کی وجہ سے گزر رہے ہیں، اس خوف کا کچھ مزہ وہ بھی چکھیں۔ پُر وا سے کیسے گئے وعدے کا خیال نہ ہوتا، تو میں واقعی ان دونوں کو آج جھگڑی لگوا کر ہی بھیجتا۔ میں نے ابھی آدھا دالان ہی پار کیا تھا کہ میرے عقب سے مائیکل کی آواز ابھری ”آیاں۔۔۔۔۔“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں گھاس پر پڑی گچھلی برف میں قدم جمائے پریشان سے کھڑے تھے۔ مائیکل میری جانب بڑھا ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد تمہیں پاؤں کو کوئی نقصان پہنچانا ہرگز نہیں تھا اور پُر وا تو بلا وجہ نشانہ بن گئی۔ شمعون صرف تمہارے بہت قریب سے گاڑی گزرا کر تمہیں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا، لیکن پھر اچانک ہی پُر وانے ہماری گاڑی تمہاری جانب بڑھتی دیکھی تو وہ گھبرا گئی، اُسے لگا کہ ہم تمہیں کچلنا چاہتے ہیں اور اس نے گھبرا کر تمہیں دھکا دے دیا اور خود گاڑی کے سامنے آگئی۔ شمعون نے آخری وقت میں بھی اسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی اور اس کا ثبوت سڑک پر ابھی تک موجود گاڑی کے نائروں کے مڑنے کے نشانات بھی ہیں، لیکن وہ پُر وا کو نہیں بچا پایا۔ ہم اتنے بوکھلا گئے تھے کہ ہم نے گاڑی روکے بنا وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت جانی اور سیدھا اپنے ایک دوست کے اسکرپ گودام میں لے جا کر گاڑی کو کریش کر ڈالا، تاکہ اس کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ تم یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے داؤڈ اور موسیٰ کی قسم، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایک بار پُر وانے ہمارے نام پولیس کے سامنے اُگل دیے تو اُن کا اس تمام معاملے کی تہہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا اور پھر ہمارے کیریئر عمر بھر کے لیے جیل کی نذر ہو جائیں گے۔ اس لیے ہمارے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے۔“ میں نے مائیکل کو گھورا ”کیسی آفر؟“ شمعون اب بھی ہم دونوں سے دس بارہ قدم دور کھڑا تھا۔ وہ چند قدم بڑھا کر قریب آگیا۔ مائیکل نے سر جھکا کر کہا ”یہی کہ بدلے میں تم جو بھی چاہو، ہم وہی کریں گے۔ اسلام اور مسلم گروپ کی مخالفت بھی چھوڑ دیں گے اور جب تک تم مسلم کاؤنسلر ہو، ہم تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ بھی کھڑی نہیں کریں گے اور تمہارے گروپ کو جتنی بھی فنڈنگ درکار ہے، تمہاری کاؤنسلر شپ کے مکمل دور میں، وہ تمام رقم بھی اپنی جیب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بدلے میں تمہیں صرف اپنی زبان بند رکھنا ہوگی اور ہم پُر وا کو بھی تمام نقصان کا ہرجا نہ ادا کر دیں گے؟“ میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اپنے بیک سے پُر وا کی اب تک کی تمام میڈیکل رپورٹس نکال کر ان دونوں کے چہرے پر دے ماریں ”کس کس نقصان کی بھرپائی کرو گے تم لوگ۔ یہ پُر وا کی رپورٹس ہیں۔ اگر اس کے چند گھنٹے مزید بے ہوشی میں گزر جاتے، تو وہ ایسے کوڑے میں چلی جاتی، جہاں سے شاید اس کی واپسی کبھی ممکن نہ ہوتی۔ تم لوگوں میں تو اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہے کہ ایک بار اسپتال آ کر اس کی خیریت ہی پوچھ جاتے اور ایک وہ ہے، جو تم دونوں کو پہچان لینے کے باوجود بھی پولیس کے سامنے نام نہیں ظاہر کرنا چاہتی۔ شرم سے ڈوب مرو۔“ ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا ”کیا۔۔۔۔۔ پُر وانے ہماری شناخت ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم۔۔۔۔۔“ وہ میری اپنی دلی خواہش تھی کہ تم لوگوں کو اقامت قتل کے جرم میں جیل کی ہوا ضرور کھلاؤں، لیکن وہ صاف دل کی لڑکی صرف تمہاری یہ گھٹیا دشمنی ختم کرنے کی خاطر اپنی جان دینے کو بھی تیار ہے۔ ہمیں تمہاری کوئی مدد، کوئی فنڈ یا کوئی حمایت درکار نہیں ہے۔ ابھی ہمارے بازوؤں میں اتنا دم باقی ہے کہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکیں۔ ہمیں تمہاری مخالفت کا بھی کوئی ڈر نہیں، تم لوگ جس طرح چاہو، ہمارے مقابلے پر ڈٹ سکتے ہو، مگر ہر جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ تم لوگوں نے تو گراوٹ کی ہر سطح پار کر لی ہے، کیا دشمنی ہے تمہاری، ہم سے یا ہمارے مذہب سے، کیا کبھی ہم نے تمہارے مذہب پر کچھڑا اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تو آج بھی داؤڈ، زبور، تورات اور موسیٰ کا نام نہایت



تعظیم سے لیتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے بھی اتنے ہی محترم ہیں، جتنے تم لوگوں کے لیے، بلکہ شاید تم لوگوں سے بھی زیادہ، کیوں کہ تم تو انہی کی دی ہوئی تعلیمات کو بھلا کر ایک ایسی دشمنی کی آگ میں خود کو جھونک چکے ہو، جس میں صرف حسد کی تپش ہے، کیا چاہتے ہیں ہم مسلم طلبہ تم سب سے؟ بس، اتنا ہی کہ خود بھی جیو اور ہمیں بھی جینے دو۔ ہمارے مذہب اور مذہب کی معتبر و پاکیزہ ہستیوں کی بے حرمتی نہ کرو، کیوں کہ ان کی حرمت صرف ہم پر ہی لازم نہیں، خود تمہارے مذاہب نے بھی ان کی عظمت پر ممبر تصدیق ثبت کی ہے۔ مسلمان دشمنی نے تمہارے اندر کے انسان کو ختم کر کے صرف ایک جانور باقی چھوڑ دیا ہے۔“

میری گفتگو کے دوران عیسائی کاؤنسلر جارج بھی وہاں پہنچ گیا تھا، لیکن خاموشی سے میری بات سُنتا رہا، پارکنگ میں جن چند طلبہ نے مجھے اور شمعون کو سیڑھیوں پر بحث کرتے دیکھا تھا، انہوں نے شاید اوپر جا کر خبر کر دی تھی، اسی لیے میری بات ختم ہونے تک مسلم، یہودی اور عیسائی طلبہ دوڑتے ہوئے میدان میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں مسلم اور یہودی کاؤنسلر کا جھگڑا رکھ کر وہاں پہنچے تھے، لہذا سب ہی نے ہاتھ میں ہاکی، بیس بال، بیٹ، موٹر سائیکل کی چیز اور اسی قسم کے دوسرے کئی ہتھیار تھام رکھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بڑے دالان کا علاقہ طلبہ سے بھر چکا تھا اور وہ تین گروہوں کی صورت میں میرے، شمعون اور جارج کے عقب میں جمع تھے۔ وہ سب ہمارے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ میں نے جارج کی طرف دیکھا ”دیکھ رہے ہو، اس نفرت کی تبلیغ کا نتیجہ، تمہارے گروپ کو یہ بھی پتا نہیں کہ اصل جھگڑا کیا ہے، لیکن وہ مسلم دشمنی میں یہاں یہ سوچ کر اکٹھے ہو گئے ہیں کہ یہودیوں کی آڑ میں وہ اپنے بدلے بھی چکا سکیں گے۔“ اتنے میں، میرے عقب سے جینی، ایرک اور جم کی آواز بہ یک وقت ابھری ”لیکن ہم تمہارے ساتھ ہیں آیان.....“ ایرک ایک قدم آگے آیا ”سب عیسائی اور شاید سب ہی یہودی طلبہ ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ میں آج اپنی، جینی اور جم کی طرف سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر مذہب کی جنگ مسلط کی گئی، تو ہم تینوں آیان کی طرف سے لڑیں گے، کیوں کہ ہمارا مذہب ہمیں سچ کا ساتھ دینے کی تلقین کرتا ہے۔“ میرے تینوں دوست میرے کندھے سے کندھا ملا کر میرے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ کچھ یہودی اور عیسائی لڑکیاں، جو پہلے بھی پُروا کے ساتھ تھیں، وہ بھی دو قدم بڑھا کر مسلم گروپ کی جانب آگئیں۔ ماحول پر ایک گھبرستا ناٹاری ہو چکا تھا۔ شاید اوپر ایڈمن بلاک کی دوسری منزل سے کسی نے نیچے یہ ہنگامہ دیکھ کر ڈین کو اطلاع کر دی تھی، لہذا کچھ لمحوں بعد ڈین بھی دیگر اساتذہ کے ساتھ یونیورسٹی کی تاریخ کے اس سب سے بڑے تین مذاہب کے ہجوم کو آپس میں ٹکرائے سے روکنے کے لیے دوری سے ہماری جانب بھاگتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اپنی بات ختم کی۔ ”میں آج تم سب پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جسے تم لوگ مذہب کی جنگ سمجھ کر لڑ رہے ہو، وہ تمہارے اور تمہارے بڑوں کے غلط نظریات کی جنگ ہے، جسے تم لوگوں نے صرف مذہبی تعصب کی بنیاد پر خود پہ مسلط کر لیا ہے۔ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جنہیں اپنے مذہب کی صحیح پہچان ہے۔ کتنے ہیں، جو دل میں اپنے مذہب کا سچا درد رکھتے ہیں۔ ہم تو بس ایک بھینڑ چال کا شکار ہیں ہمیشہ سے۔“ میری بات ختم ہوئی تو ڈین پارٹی پہنچ گئی۔ ”یہ تم سب لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تین منٹ کے اندر اندر یہ میدان خالی کر دو۔ تین منٹ بعد اگر مجھے کوئی اس میدان میں نظر آیا تو میں اس کے خلاف سخت کارروائی کروں گا۔ چلو، جلدی کرو۔ اپنی اپنی کلاس میں پہنچ کر اپنی حاضری لگواؤ۔“ ڈین کی بات سن کر لڑکے منتشر ہونے لگے۔ میں نے بھی پلٹ کر دوسری جانب قدم بڑھائے۔ ڈین نے مجھے روک لیا ”آیان..... یہ میری آخری وارننگ ہے، اور ہاں تمہارے گزشتہ میڈیا انٹرویو کے لیے بھی تمہیں اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کر دیا گیا ہے۔ تمہیں سات دن کے اندر اس کا جواب جمع کروانا ہوگا۔“ میں میدان سے باہر نکلا تو بلال نے دھیرے سے میرے کان میں کہا ”کل سے سیمینار کے کنکٹوں کی فروخت شروع ہو جائے گا۔ پانچ سو اور ایک ہزار ڈالر کے کلٹ ہوں گے، نیچے ہال اور اوپروالی گیلری کے سیمینار میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔“ میں نے پریشانی سے بلال کی جانب دیکھا ”ہماری یونیورسٹی میں مسلم گروپ کے ارکان کی تعداد کتنی ہے؟“ بلال نے سوچ کر جواب دیا ”کل ملا کر 313 تین سو تیرہ کے قریب ہوں گے۔“ اور نیویارک کی باقی یونیورسٹیز میں مسلمان طلبہ کی کل تعداد کیا ہوگی؟“ بلال نے پھر سے گنتی کی ”ہماری یونیورسٹی کے طلبہ ملا کر کل بارہ سو کے قریب ہو جائیں گے۔ ان میں غیر حاضر طلبہ کی تعداد بھی شامل ہے۔“ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”اور ہال کی نشستیں کتنی ہیں؟“ بلال نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”تین ہزار، لیکن تم یہ کس اعداد و شمار کے چکر میں پڑ گئے ہو؟“ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر بلال سے کہا ”تم سب لڑکوں کو کسی کھلی جگہ میں اکٹھا ہونے کا کہو۔ ہال نمبر 3 کا نہ کہنا۔ مجھے اب ان دیواروں کے کان بے اعتبار لگنے لگے ہیں۔ انہیں عقب والے اسٹیڈیم میں جمع کرو۔ میں بھی کچھ دیر میں وہیں پہنچتا ہوں۔“ بلال سر ہلا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بلاک کے نوٹس بورڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے میری نظر اخبار کی دو تازہ کلنگز پر پڑی۔ ”لیسٹر شائر (لندن) کی ایک عدالت نے مسلم خاتون کو برقعہ اتار کر بیان دینے پر مجبور کیا۔“ ”ہوسٹن (امریکا) کی عدالت نے عدنان مرزانا می پاکستانی طالب علم کو طالبان سے روابط کے جرم میں پندرہ سال کی قیدنا دی۔“ شاید یہ دونوں تراشے غیر مسلم طلبہ کے گروپ نے مسلم گروپ کو چڑانے کے لیے یہاں چسپاں کیے تھے۔ میرے دماغ میں شیخ الکریم کی بات گونجی ”مسلمانوں کے لیے یہ دنیا بڑی سخت جگہ ہے۔“ انہی دو تراشوں کے نیچے ایک اور چھوٹی سی خبر چمکی ہوئی تھی ”سی آئی اے اور ایف بی آئی کو انتہا پسند گروپوں سے روابط رکھنے والے مسلم طلبہ کی تلاش.....“ میرے ذہن نے آفیسر فورڈ کی دھمکی دہرائی ”اور یاد رکھنا، اس بار اگر تم گرفتار ہوئے تو اثامات کی فہرست بہت لمبی ہوگی۔“ مجھے لگا کہ میرے گرد گھنجدہ کتا جا رہا ہے۔ میں اسٹیڈیم پہنچا تو قریباً تمام گروپ جمع ہو چکا تھا۔ صرف وہی لڑکیاں غیر حاضر تھیں، جو پُروا کے پاس اسپتال میں رکی ہوئی تھیں۔ وہ سب سیمینار کی حتمی تاریخ کے اعلان اور کنکٹوں کی فروخت کا سن کر بے حد آزرده اور بے چین تھے۔ بے بسی جب حد سے گزر جائے تو اشتعال کی آخری لکیر پار کر کے ایک ایسی مایوسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کا انجام صرف فنا ہوتا ہے۔ مجھے ان سب کے چہروں پر ایک ایسی ہی فنا دکھائی دے رہی تھی۔ آج وہ خلاف توقع خاموش تھے۔ سچ ہے کہ مجھے ان کے غصے اور اشتعال سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی، لیکن آج ان کی اس خموشی نے خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمیں پندرہ دن بعد ہونے والے اس سیمینار کو روکنے کے لیے آج ہی اپنا حتمی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ اس لیے اس معاملے میں مجھے ان سب کا مشورہ درکار ہے اور ان سب کی سننے کے بعد آخر میں، میں انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کروں گا۔ وہ لوگ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی، لیکن ان کے چہرے ویسے ہی سُتے رہے ”تم لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں، جنگ ابھی جاری ہے اور ہمیں لڑنا ہے۔“ احرر نے سب لڑکوں کی طرف دیکھا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔ ”نہیں آیان..... شاید ہم یہ جنگ اس طرح اُن سے نہ جیت پائیں، سیمینار میں صرف دو ہفتے باقی ہیں اور ہم انہیں روکنے میں ناکام رہے ہیں، لہذا ہم نے بھی آخری حد سے گزر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”کیسا فیصلہ.....“ احرر نے سرُٹھکا لیا۔ ”حافظ گھلیل سے کل رات کسی ان جان گروپ نے فون پر رابطہ کیا ہے، وہ لوگ خود کو جہادی کہتے ہیں اور انہوں نے اس گستاخی کی سزا دینے کے لیے سیمینار والے دن ہال میں بم نصب کر کے دھماکا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم سب نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اس کام میں ان کا ساتھ دیں گے۔ حافظ گھلیل ان کے رابطے میں رہے گا اور سیمینار والے دن سے ایک رات قبل ہال میں بم نصب کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔ ہم ان سب کو فنا کر دیں گے، جنہوں نے ہمارے پیارے نبی کی شان میں گستاخی کا ناپاک خیال بھی اپنے دل میں کہیں پال رکھا ہے۔“ احرر کی بات سن کر مجھے

سارا اسٹیڈیم گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔..... (جاری ہے)





ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائٹن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@jangggroup.com.pk



میں زور سے چلایا۔ ”تم لوگ اپنے ہوش میں تو ہو، جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ سب خاموش رہے اور ان کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خود کو اس بات کے لیے ذہنی طور پر گزشتہ رات ہی سے تیار کر چکے ہیں۔ اس بار حافظ کھلیل بولا ”ان لوگوں نے ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں چھوڑا۔ ہمارے لاکھ احتجاج کے باوجود یونیورسٹی انتظامیہ نے سیمینار کی تاریخ کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم زیادہ ہنگامہ کریں گے تو یہ ہمیں پولیس والوں سے اٹھوالیں گے اور عامر بن حبیب اور بارسیدی کی طرح ہمیں بھی عدالتوں سے ملک بدر کروا کے چھوڑیں گے، لیکن ہم نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ چاہے ہم قید ہو جائیں یا ملک بدر، یہ سیمینار کسی صورت نہیں ہونے دیں گے۔ بس، اب ہمیں اُس تاریخ کا انتظار ہے، جب وہ ملعون ڈینس این جی او ہماری یونیورسٹی کے ہال میں اکٹھی ہوگی اور ہم ان سب کو واصل جہنم کریں گے۔“ میری آواز تیز ہو گئی ”ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں کہ اس طرح تم لوگ انہیں وقت سے کچھ پہلے دوزخ پہنچا دو گے، حالاں کہ ان کے اگلے جہاں کا یہ ٹھکانہ پہلے ہی سے طے شدہ ہے، لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا ان چند منٹھی بھر لوگوں کے مر جانے سے وہ سوچ بھی فتا ہو جائے گی، جو ان تمام مکروہ اعمال کا پیش خیمہ ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے بعد کوئی دوسرا گستاخ یہ قبیح عمل دہرانے کی جرأت نہیں کرے گا؟ تب اُسے روکنے والا یہاں کون ہوگا، کیوں کہ تم لوگ تو جو کرنے جا رہے ہو، اس کے بعد اس یونیورسٹی میں مسلم طالب علم کے بچنے کا کوئی امکان نہیں اور صرف یونیورسٹی ہی پر کیا موقوف، نیویارک بھر کے تمام تعلیمی اداروں میں ایسا کریک ڈاؤن ہوگا کہ آدھے سے زیادہ لوگ مُلک بدر ہو جائیں گے اور جو بچ بھی گئے، وہ عمر بھر یہاں کی جیلوں ہی میں سڑتے رہیں گے۔ ہاں، اگر یہ آخری جنگ ہوتی، تو میں خود سب سے پہلے یہ سب کچھ کر گزرتا، لیکن ابھی قیامت دُور ہے اور ہمیں نہ جانے ایسے کتنے محاذوں پر ان سے لڑنا ہے۔ خود کو پہلے ہی مورچے پر فدا کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔“ وہ سب میری بات سُن رہے تھے، لیکن بالکل مُردوں کی طرح اور سانس لیتے مُردوں سے زیادہ مُردہ شے اس جہاں میں اور کوئی نہیں۔ دشمنوں نے پے در پے اور بار بار اُن کی روحوں پر اتنے وار کیے تھے کہ اب ان کی روح بھی مریچکی تھی اور جب کسی انسان کی روح مر جائے، صرف جسم زندہ رہے، تو تب وہ ان روح کے قاتلوں پر ایک بھیانک قضا کی صورت بجلی بن کے گرتا ہے۔ مذہب، مقدس ہستیوں اور پیارے نبی کی توہین (نعوذ باللہ) ہی تو کسی مسلمان کی روح کو قتل کرنے کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ ہمارے مذہب کے دشمن آج کل یہ قتل سر عام اور بار بار کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور آج اُس قتل عام کا نتیجہ میرے سامنے اس مسلم گروپ کی صورت میں کھڑا تھا، جو بے بسی کی آخری حد سے گزر جانے کے بعد اب مکمل اور با اختیار ہو چکے تھے۔ حد سے زیادہ بے بسی بھی تو انسان کو ایک طرح کا کامل مختار بنا دیتی ہے۔ خود کو فنا کرنے کا اختیار اور حوصلہ بخش دیتی ہے۔ بے بس اگر حوصلہ مند بھی ہو تو پھر وہ خود کش بن جاتا ہے اور خود کش سے بڑا خطرہ اس دنیا کے لیے بھلا اور کیا ہوگا.....؟ بلال نے آخر کار اپنے لب کھولنے کی ہمت کی ”ہم نے ہر طریقہ آزما کر دیکھ لیا ہے آج..... بہت دفعہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی، مگر انہوں نے شاید اپنے کان ہی لیے ہیں۔ دلوں پر لوہے کے خول چڑھا رکھے ہیں اور ذہن شیطان کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ یہ ایسی گستاخیاں کرنے سے باز نہیں آئیں گے اور تم ٹھیک کہتے ہو کہ ان لوگوں کے جہنم واصل ہونے کے بعد بھی شاید یہ گستاخی جاری رہے گی، کیوں کہ ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے۔ ایک ایسا دائمی زنگ، جو اب ان کی روح کے ساتھ ہی اگلے جہاں جائے گا۔ تمہارا یہ خدشہ بھی ٹھیک ہے کہ اس دھماکے کے بعد نیویارک کا کوئی بھی مسلم طالب علم یہاں کی ایجنسیوں کی زد میں آنے سے نہیں بچ پائے گا، لیکن ہمارے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ ہم اپنا فرض تو ادا کر جائیں۔ ہمارے بعد آنے والے اپنا فرض ادا کریں گے۔“ بلال نے اپنی بات ختم کی، تو وہ سب سر جھکائے دھیرے دھیرے وہاں سے چل دیے۔ میں انہیں آوازیں دیتا اور روکتا ہی رہ گیا، لیکن ان سب کے دلوں پر فنا کا سایہ پڑ چکا تھا۔ وہ سایہ جو سماعتیں معطل کر دیتا ہے۔



کچھ ہی دیر میں تیز بارش شروع ہوگئی۔ سخت برف پر بارش کے قطرے گر کر خود بھی جم رہے تھے۔ یہاں بھی قدرت نے فنا کا وہی ابدی کھیل شروع کر دیا تھا۔ میں پُر وا کے پاس پہنچا تو وہ نگلیہ سیدھا کیے کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا ”آیاں میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے، تمہیں پتا ہے.....“ پھر میرے چہرے پر ابھری فکر کی لکیروں نے اُسے اپنی بات خود کاٹنے پر مجبور کر دیا ”کیا ہوا..... سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ میں نے اُسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آج بہت دن بعد اس کے چہرے کی لالی واپس لوٹی تھی ”کوئی خاص بات نہیں۔ بس، بچوں سیمینار کی تاریخ قریب آ رہی ہے، اُلجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ لڑکے اپنا حوصلہ ہار رہے ہیں۔ ڈرتا ہوں، ان کے اندر ہوتی یہ شکست کہیں اُنہیں کسی انتہائی قدم کی طرف نہ دھکیل دے“، ”نہیں..... مجھے یقین ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ تم ان کے ساتھ ہونا..... اچھا تمہیں ایک اچھی خبر سناتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے سن کر مایوس مسلم طلبہ پھر سے جی اٹھیں گے۔ سنو گے.....؟“ میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔ ”ہاں..... ہاں ضرور.....“ پُر وا نے ہاتھ میں پکڑا نیو یارک ٹوڈے کا ایک صفحہ کھولا۔ ”یہ دیکھو، کتنی اچھی خبر ہے۔ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر کی سالی لورین بوتھ نے اسلام قبول کر لیا۔“ پُر وا کی بات سن کر میں زور سے چونکا۔ ”کیا..... کہاں..... دکھاؤ.....“ میں نے جلدی سے تمام رپورٹ پر نظر ڈالی۔ لورین بوتھ ایران کے شہر قم کے دورے پر اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر چکی تھی اور اس خبر سے برطانیہ کے محلوں میں ہل چل سی مچ گئی تھی۔ پُر وا نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”اچھی خبر ہے نا..... اسلام کی مخالفت کے اس سیاہ دور میں بھی ہمارا دین اُن کے امراء اور شہزادے، شہزادیوں تک پہنچ رہا ہے۔ مطلب، اگر وہ ہمیں زنج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، تو قدرت بھی ہماری مدد سے غافل نہیں۔ مجھے تو لگا کہ یہ خبر خاص ہمارے لیے ہی مقدر نے بچا رکھی تھی۔“ میں جوش میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہاں پُر وا ضمیر خان! یہ ہمارے نصیب کی خبر ہے، جو قدرت نے آج تمہارے ذریعے مجھے تک پہنچائی ہے۔ اگر یہ میگزین میں رکھ لوں، گروپ کو دکھانے کے لیے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“ پُر وا ہنس پڑی۔ ”نہیں آیاں احمد صاحب! آپ کے لیے ہی اب تک سب سے چھپا رکھا تھا۔“ میں جلدی میں واپسی کے لیے پلٹا۔ پُر وا نے مجھے پکارا۔ ”کہاں چل دیے۔ کچھ دیر تو بیٹھو“، ”نہیں، میں پھر آؤں گا۔ اس وقت کچھ بٹکنے ہوئے ذہنوں کو یہ خبر پہنچانا بہت ضروری ہے۔“ پُر وا نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اور کتاب نکالی۔ ”اردو تو پڑھ لیتے ہوتا، میں نے تمہارے لیے یہ کلام اقبال منگوایا ہے۔ اس میں ”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ ضرور پڑھنا۔ بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ میں جب کبھی بہت زیادہ الجھ جاؤں، ایک بار اسے اپنے شیلیف سے نکال کر ضرور پڑھ لیتی ہوں اور یقین کرو، ہر بار یہ کلام مجھے کچھ نئے جواب دے جاتا ہے۔ واقعی اقبال ہر دور کا شاعر ہے۔“ میں نے پُر وا کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔ ”ضرور پڑھوں گا۔“ میں جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رکا، وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھی۔ ”پُر وا“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ہماری نظریں ایک لمحے کو ملیں، میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ”نہیں..... کچھ نہیں.....“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے اور اس بار پُر وا نے دھیرے سے میرا نام لیا۔ ”آیاں.....“ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔ ”کچھ نہیں.....“ کبھی کبھی جب کہنے کے لیے بہت کچھ ہو، تب بھی کچھ کہا نہیں جاتا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں ایک لمحے کے لیے دروازے کے قریب رکا۔ ”جب تم اسپتال سے لوٹ کر واپس یونیورسٹی آؤ گی، اُس روز ہم ویسٹ اور بیچ کے ویسپر ریسٹورنٹ میں پوری ایک شام بتائیں گے اور وہ شام صرف ہماری ہوگی، تب ہم ایک دوسرے سے وہ سب کچھ کہہ دیں گے، جسے کہنے میں ہمیں ایک زمانہ لگا۔“ پُر وا نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک ایسی امول چمک لہرائی، جو اس کی آنکھوں کی جوت کو ہمیشہ کے لیے امر کر گئی ”سچ آیاں.....“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”ہاں، بالکل سچ۔“ میں پُر وا کے کمرے سے نکلا تو مجھے سیکڑوں باری دیکھی ہوئی وہ راہ داری جانے کیوں بالکل نئی اور بہت زیادہ جگہ لگتی ہوئی نظر آئی۔ اسپتال سے یونیورسٹی تک کے تمام دیکھے بھالے راستے کسی نئے پرستان کی ڈگر دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں پر جمی برف، کسی ساننا کلاز کی جادو کی چھڑی سے بنی نمک کی پریاں لگ رہی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے کنارے سنہری رتھ میں بٹتے، برف کے سفید گھوڑے میری بایک کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے، جانے آج یہ کس کی بارات کا سماں تھا۔ نیو یارک کی شامیں تو سدا سے گلابی تھیں، لیکن آج یہ بکھر اگال کچھ سوا تھا۔ شاید محبت ہمارے ارد گرد کے پرانے ماحول پر قلمی پھیر کر اُسے پھر سے اُجال دیتی ہے۔ زنگ زدہ پرانی بوسیدہ اشیاء، چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ہزاروں بار کے دیکھے نظارے بھی، کنوارے لگنے لگتے ہیں۔ شاید محبت ہماری ہستی کی ایک بار پھر سے تجدید کر دیتی ہے۔ آج میں بھی کچھ نیا اور تجدید شدہ ہو گیا تھا۔

میں نے ہاشل پنچنگ کراہر کو سب لڑکوں کو صحن میں جمع کرنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ سب میرے سامنے موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر ابھی تک وہی دن والے تاثرات نمایاں تھے اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ صرف میرا بھرم رکھنے کے لیے بادل نخواستہ جمع ہوئے ہیں۔ میں نے بات کا سرا جوڑنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تم سب کو کسی نئی بحث میں الجھانے کے لیے یہاں اکٹھا نہیں کیا۔ میرے پاس اب کوئی تازہ دلیل بھی نہیں ہے۔ بچوں کے آگے کوئی دلیل کارگر ہوتی بھی نہیں۔ ہم مسلمانوں کا اس دور میں یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ جہاں قلم کے جہاد کی ضرورت ہے، ہم وہاں تلوار اٹھا لیتے ہیں اور جہاں تلوار کی دھار کے پنا کام نہیں چل سکتا، وہاں ہم قلموں کی سیاہیاں خشک کرتے رہتے ہیں۔ خود کو بے مقصد بحث میں الجھائے رکھتے ہیں۔“ میں کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکا۔ وہ سب سر جھکائے چپ چاپ کھڑے رہے۔ ”کیا تم لوگوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ صرف فنا ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ کیا تم لوگوں کا اپنے دین سے بھروسہ ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا ہے؟“ بلال نے میری بات کا جواب دینے میں پہل کی ”نہیں..... یہ ہمارا دین پر بھروسہ ہی تو ہے، جو ہمیں اس حد سے گزرنے کی ہمت دے رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں، یہ قدم ہم سب پر ہمیشہ کے لیے انتہا پسندی کی شناخت کی ایسی مُہر لگا دے گا، جو ہماری سات نسلیں بھی نہیں دھو پائیں گی، لیکن تم ہی بناؤ اور کوئی چارہ ہے کیا۔ کوئی کرن باقی نہیں بچی ہمارے لیے، اس گھپ اندھیرے میں۔“ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ ”ایک کرن باقی ہے ابھی.....“ ان سب نے چونک کر اپنے سر اٹھائے اور میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا رسالہ کھولا اور لورین بوتھ کے قبول اسلام کی خبر انہیں پڑھ کر سنائی۔ ”اگر تم سب کا اپنے دین پر کامل یقین اب بھی برقرار ہے، تو اس خبر کو تم سب بار بار پڑھنا۔ یہ اُسی مغربی معاشرے کی ایک گچی عورت کی کہانی ہے، جو شاید اسلام قبول کرنے سے چند دن پہلے تک ان ہی لوگوں کی طرح سوچتی ہو، جنہیں تم لوگ قتل کر کے ختم کرنے کے درپے ہو، لیکن اس عورت کے مقدر میں قدرت نے فلاح کا راستہ لکھ دیا تھا۔ سوچو، اس پورے ہال میں اگر ایک بھی ایسا فرد ہوا، جس کے نصیب میں آگے چل کر سچائی کا یہ راستہ لکھ دیا گیا ہو، تو اُس کی فنا کا حساب کون دے گا؟ جب اگلے جہاں میں وہ دربار الہی میں فریاد کرے گا کہ اُس سے تو اس کا مقدر ملنے سے پہلے ہی چھین لیا گیا، تو کون ذنّے داری لے گا.....؟“ وہ سب چپ رہے۔ احمر نے خود کو سنبھالا۔ ”لیکن ہم کسی کافر کے مستقبل کی آس پر اُسے حال میں ایسی گستاخی کی اجازت بھی تو نہیں دے سکتے۔ ہمارا اللہ ہماری نیّتوں کا حال جانتا ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”نہیں، ہم کبھی ایسی کسی بھی گستاخی کی اجازت نہیں دیں گے انہیں۔ کیا تم لوگوں کو مجھ پر یقین نہیں ہے۔ میرا یقین کرو، میں انہیں یہ سیمینار نہیں کرنے دوں گا۔ بس، ایک بار میرا ساتھ دو۔ میں تم سب کے سامنے اعتبار کی بھیک کا کشتول لیے کھڑا ہوں۔ خدا کے لیے خود کو اس جنون کے سپرد نہ کرو۔ میری بات مان جاؤ۔“ ان کے چہروں پر کش مکش کے آثار نظر آئے۔ پھر سب سے پہلے بلال ہی نے دو قدم اٹھائے اور میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں آیاں کے ساتھ ہوں۔“ اور پھر رفتہ رفتہ کچھ اور لڑکے بھی میرے بھروسے، بھیڑ سے نکل کر میری جانب آتے گئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر دوسری جانب صرف احمر اور حافظ کھلیل کھڑے رہ گئے۔ احمر نے سر جھکا لیا۔ ”لیکن اُن لوگوں کا کیا بنے گا، جن سے کھلیل نے مدد کا وعدہ بھی لے لیا ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں ہم سے کہا تھا کہ ایک بار جب وہ قدم اٹھا لیں، تو نہ وہ خود واپس پلٹتے ہیں، نہ کسی کو پلٹنے دیتے ہیں۔ وہ لوگ سیمینار کو سبوتاژ کرنے کے لیے ضرور آئیں گے اس دن۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”اُن کی فکر تم مجھ پر چھوڑ دو، اب اگر وہ تم میں سے کسی سے بھی رابطہ کریں، تو انہیں میرا نمبر دے دینا کہ تم لوگوں نے حتمی فیصلے کا اختیار مجھے دے دیا ہے، لہذا اب وہ مجھ سے بات کریں۔“ کھلیل اور زرک اب بھی تذبذب کا شکار تھے۔ ”لیکن تمہارے ذہن میں آخر اُس سیمینار کو روکنے کا منصوبہ ہے



کیا.....؟“ میں نے گہری سانس لی۔ ”فی الحال خاکہ کچھ واضح نہیں ہے، لیکن مجھے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہال کی نشستوں کے ٹکٹ چاہیے ہوں گے۔ کل صبح سے پہلے ہمارا تمام مسلم گروپ چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دے گا۔ لڑکیاں اور لڑکے مل کر یہ کام کریں گے، لیکن ہم دوسری یونیورسٹیز کے صرف مسلم طلبہ تک محدود رہیں گے۔ تین ہزار نشستوں میں سے جتنے بھی ٹکٹ خرید سکتے ہو، خرید لو، لیکن خیال رہے کہ یہ کام بہت خاموشی کے ساتھ کرنا ہوگا، تمہارے غیر مذاہب کے دوست بھی اگر تم لوگوں کے لیے اپنے نام سے ٹکٹ خرید کر لائیں، تو کوئی حرج نہیں، لیکن پیسے پورے ادا کرنے ہوں گے۔“ لڑکوں نے اپنے سر ہلائے۔ شاید میری طرح ان کے ذہن میں بھی کوئی نامکمل خاکہ بن رہا تھا، لیکن ہم سب کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم میں سے چند ہی ایسے تھے، جو اپنے جیب خرچ سے ٹکٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے، ورنہ پانچ سو یا ہزار ڈالر کا ٹکٹ خریدنا ہمارے لیے خواب ہی تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے یونیورسٹی انتظامیہ نے جان بوجھ کر ٹکٹوں کی قیمت اتنی زیادہ رکھی تھی کہ وہ مسلمان طلبہ کی دسترس سے باہر رہے۔ مجھے اس لمحے عامر بن حبیب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ مجھے کل ہی احمر نے بتایا تھا کہ اس کا یونیورسٹی والا اکاؤنٹ سیل کر دیا گیا ہے، تاکہ وہ اپنے پیسوں سے مسلمان ”انتہا پسند گروہوں“ کی مدد نہ کر سکے۔ اگر نیویارک پولیس اور سی آئی اے والوں نے عامر بن حبیب کی رقوم کی منتقلی پر پابندی نہ لگائی ہوتی، تو اکیلا عامری پورے ہال کی نشستیں خرید سکتا تھا، لیکن اب ہمارے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ ہمیں اپنے زور بازو ہی پر اکتفا اور بھروسہ کرنا تھا اور اگلے روز تیر اور جگر آزمانے کا یہ خاموش مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ لڑکیوں نے اپنے زیور اور باقی تمام غیر ضروری اشیاء ”برائے فروخت“ رکھوا دیں اور لڑکے بھی کلاس کے بعد خالی وقت میں کچھ نہ کچھ کمانے کی ڈھن میں سرگرداں ہو گئے۔ میرے پاس بیچنے کے لیے اپنی بے مول روح کے علاوہ صرف ایک ہی چیز تھی، سو میں اُسے لے کر سر شام ٹیکروز کے علاقے میں ٹم کے پاس جا پہنچا۔ وہ میری بات سن کر حیرت سے چلا یا۔ ”کیا تم اپنی بایک بیچنا چاہتے ہو۔ وہی بایک، جس نے مجھے شکست دی تھی اور جسے پانے کے لیے اب نیویارک کا ہر رینڈ رکھاڑی بے تاب ہے۔ تم ایسی ان مول ساتھی کو کیسے بیچ سکتے ہو آیان..... ایک بار پھر سوچ لو“، ”میرے پاس سوچنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا دوست۔ تم یہ بتاؤ، کیا تم میری بایک خریدو گے۔ اسے خریدنے والے شاید اور بہت مل جائیں، لیکن میں اسے کسی ایرے غیرے کو نہیں سونپنا چاہتا۔ میرا اور اس بایک کا برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ میرے جسم کے ساتھ اس نے بھی بہت زخم سہے ہیں، لہذا اس کا حق ہے کہ اسے کسی بہترین سوار کے سپرد کیا جائے۔“ ٹم میرے افسردہ چہرے کو دیکھ کر خود بھی غم گین ہو گیا۔ ”ہاں، میں اسے ضرور خریدوں گا اور اتنی ہی تعظیم دوں گا، جس کی یہ حق دار ہے، لیکن اس نایاب مشین کے بدلے میں تمہیں صرف پانچ ہزار ڈالر دے سکتا ہوں۔ یہ میری اب تک کی کُل جمع پونجی ہے۔ اگر تمہیں قبول ہو۔“ میں نے ہٹا کچھ کہے سر ہلادیا، ٹم اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس لوٹا، تو رقم اس کے ہاتھ میں تھی، جو اُس نے میری شرٹ کی جیب میں منتقل کر دی۔ ”میں جانتا ہوں آیان! تم نے کسی عظیم مقصد کے لیے ہی اپنی اس ساتھی کو قربان کیا ہوگا اور میں آج تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی تم اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہو، یہ یہیں تمہاری منتظر رہے گی۔ میں اسے کسی بھی حال میں فروخت نہیں کروں گا۔“ میں ٹم کا شانہ چھتیا کر پلٹ گیا۔ کون کہتا ہے کہ بے جان اشیاء کے پاس زبان نہیں ہوتی، مجھے تو واپسی کے ہر قدم پر ایسا ہی محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھے پکار رہی ہے، رورہی ہے اور مجھے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن میں نہیں رکا اور ہٹا مڑ کر دیکھے، وہاں سے چلا آیا۔

مُردا کی غیر موجودگی میں اس کی ذمے داریاں صنم کبیر نے سنبھال لی تھیں اور وہ حسبِ عادت خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، لیکن کبھی کبھی اس کی اداس آنکھیں یہ راز کھول جاتی تھیں کہ بسام اس کی یہ سرگرمی پسند نہیں کرتا۔ مُردا اسپتال میں تھی، لیکن وہ ہر لمحے کی خبر رکھتی تھی۔ اتفاق سے اس کے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کی تاریخ بھی سیمینار والے دن کی ہی تھی۔ سیمینار میں صرف سات دن باقی تھے، لیکن ابھی تک ہمارا گروپ بہ مشکل 437 ٹکٹس ہی خرید پایا تھا اور یہ بھی تمام ترجیحی نشستوں والے پانچ سو ڈالر مالیت کے ٹکٹ تھے۔ ٹکٹوں کی فروخت جاری تھی اور جم، ایرک اور جینی نے بھی ہمارے لیے پچاس سے زائد ٹکٹ خرید لیے تھے، لیکن اتنی زیادہ مالیت کے تمام ٹکٹ خریدنا ہم میں سے کسی کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ ہم نے خاموشی سے دیگر یونیورسٹیز کے مسلم گروپس سے چندہ اکٹھا کرنا بھی شروع کر رکھا تھا اور لڑکیاں دن بھر نیویارک کی یونیورسٹیز میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق سیمینار میں پہلی ترجیح ہماری اپنی یونیورسٹی کے طلبہ کو دی جا رہی تھی اور نشستیں بیچ جانے کی صورت میں باقی یونیورسٹیز کو بھی ٹکٹ خریدنے کی پیش کش کی جاتی، لیکن جس رفتار سے ٹکٹ بک رہے تھے، اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ شاید ہال ہماری یونیورسٹی کے طلبہ ہی سے بھر جائے گا۔ میں اسی جمع تفریق میں لگا ہوا تھا کہ میرے موبائل پر کوئی ان جان نمبر جگمگانے لگا۔ ”ہیلو، کیا تم آیان بول رہے ہو؟“ ”ہاں..... میں آیان ہوں..... لیکن تم کون؟“ ”میری شناخت کی فکر چھوڑ دو، بس اتنا جان لو کہ ہم سب تمہاری شہ رگ کے آس پاس رہتے ہیں اور ہمارا دل تمہارے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ تمہارے در دو محسوس کر کے ہی ہم نے تم لوگوں کی مدد کا سوچا ہے، لیکن تم یہ کس بہیر پھیر میں پڑ گئے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ حاصل کر کے تم ان لوگوں کو اس معلون حرکت سے روک پاؤ گے؟ نہیں، یہ وہ لاتوں کے بھوت ہیں، جن پر کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ دین قربانی مانگتا ہے نو جوان، اور ہم سب تم لوگوں کی طرف سے قربانی دینے کے لیے تیار ہیں، پھر یہ ہچکچاہٹ کیسی؟“ میں دوسری طرف کی بات سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ اسی گروپ کا فون ہے، جو خود کو جہادی کہتا ہے۔ میں نے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا۔ ”تم اگر واقعی مدد کرنا چاہتے ہو، تو صرف ہماری شناخت پر لگے اس جنون اور انتہا پسندی کے دھبے کو مٹانے میں ہماری مدد کرو۔ تمہارا ایک دھماکا چند جسم تو ضرور فنا کر دے گا، لیکن ہمارے خلاف ہلتی سوچ اور نفرت میں ہزار گنا اضافہ کر جائے گا۔ پھر شاید ہم میں سے کوئی اس سوچ کو مٹانے کے لیے یہاں موجود بھی نہ ہو، لہذا اپنا ارادہ بدل دو۔ مجھے تم لوگوں سے صرف اچھی دعا کی ضرورت اور امید رہے گی۔“ دوسری جانب سے بھی میری بات اطمینان سے سنی گئی۔ ”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو کاؤنسلر! ان کتابی باتوں کا اثر وہاں ہوتا ہے، جہاں اگلے کی نیت فلاح پانے کی ہو، لیکن تم جن لوگوں سے لڑ رہے ہو، اُن کی نیت ہی میں فتور ہے۔ اُن کے قلب سیاہ ہو چکے ہیں اور اب اُن کا علاج صرف اچانک اور ایک بجلی کی طرح چمکتی قضا ہے اور تم اس قضا کا راستہ روکنے کی حماقت کر رہے ہو۔ جلد یا بدیر انہیں ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہونا ہے، لہذا تم خود کو اس الجھن سے دُور ہی رکھو تو بہتر ہوگا۔“ میں نے حتمی لہجے میں بات ختم کی۔ ”میں تمہارے ساتھ کسی جائز اور ناجائز کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ نیوتوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سو، میں تو یہی دعا کروں گا کہ رب اُن کی نیت بھی ہمارے حق میں بہتر کر دے، جو ہماری شناخت مٹانے کے درپے ہیں۔ میری اور تمہاری لڑائی کا میدان الگ ہے اور اگر ہم دونوں کی نیت ایک ہے تو پھر ایک دوسرے کا راستہ کاٹنے سے فائدہ نہیں۔ دوبارہ مجھے فون نہ کرنا۔“ میں فون بند کرنے لگا تو اُس نے کڑک کر کہا۔ ”سٹوڈنٹ کے! تم پچھتاؤ گے۔“ لیکن میں نے اس کی بات پوری ہونے سے قبل لائن کاٹ دی۔

دن لمحوں کی طرح گزرنے لگے اور پھر آخر کار سیمینار سے قبل والی شام بھی آ پہنچی۔ ہم سب مسلم ہاسٹل کے دالان میں جمع اپنے ٹکٹ گن رہے تھے۔ کل صبح کی تقریب کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ شہر کے بڑے اور مشہور یہودی اور عیسائی علماء کو بھی تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے ان چند دنوں میں ڈین سے ملنے کی بار بار کوشش کی، لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ میں اپنے شوکا زانوٹس کا جواب داخل کرانے کے لیے خاص طور پر روزانہ صبح وشام اس کے دفتر کے چکر لگاتا رہا، لیکن مجھے اپنا جواب ڈیک پر جمع کروانے کی ہدایت دے دی گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈین جان بوجھ کر سیمینار سے پہلے کسی وضاحت سے بچنے کے لیے مجھے ٹال رہا ہے۔ لڑکوں کی بے چینی بھی حد درجہ بڑھ چکی تھی، مگر وہ میرے کسی بھرم کی خاطر اپنے لب سے ہوتے تھے، لیکن میں جانتا تھا، یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ احمر نے ٹکٹ گن کر مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ہم صرف 670 ٹکٹ خرید پائے ہیں آیان۔ اگر تمہارا ارادہ ہال کی زیادہ سے زیادہ نشستیں خرید کر انتظامیہ پر دباؤ بڑھانے کا تھا، تو ہمارا یہ منصوبہ ناکام ہو چکا ہے۔“ اتنے میں مسلم گروپ کی لڑکیاں دوسری یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ صنم کبیر کی سربراہی میں مسلم ہاسٹل کی راہ داری میں داخل ہوئیں۔ صنم کبیر نے اپنے بیگ سے ٹکٹ نکال کر لہرائے اور خوشی سے بولی ”ہمارے 320 ٹکٹ بھی شامل کرلو۔ یہ دوسری یونیورسٹی کی مسلم لڑکیوں کی محنت کی کمائی ہے۔“ بلال نے تمام ٹکٹ یکجا کر کے لہرائے۔ ”990.....“ ہم سب نے پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہال میں مسلم اکثریت حاصل کرنے کے لیے ہمیں اب بھی قریباً چھ سو ٹکٹ درکار تھے۔ احمر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا، اس کے لیے کثیر تعداد میں ٹکٹوں کا ہونا بہت ضروری تھا، لیکن ہم سب دو ہفتے کی سرتوڑ کوشش کے بعد صرف ایک تہائی ٹکٹ جمع کر سکے تھے۔ ہال کی دو ہزار دس نشستیں اب بھی کسی اور کے پاس تھیں۔ بلال کی اطلاع کے مطابق ٹکٹ ختم ہو چکے تھے۔ احمر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ہم ہار گئے آیان.....“ اور ٹھیک اسی لمحے دروازے کی جانب سے آواز ابھری۔ ”نہیں..... ہمارے ہوتے ہوئے آیان کبھی ہار نہیں سکتا۔“ ہم سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور دروازے میں کھڑے شخص کو دیکھ کر ہم سب پریشانی میں اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے۔

(جاری ہے)





ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دبمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیرِ نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائٹن الیون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں اک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہِ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuhaddas@janggroupp.com.pk

ہاسٹل کے بیرونی دروازے پر شمعون اور جارج اپنے گروپ کے چند لڑکوں کے ساتھ کھڑے تھے، ہم سب یہودی اور عیسائی کاؤنسلر کو ایک ساتھ مسلم ہاسٹل میں ایسے وقت دیکھ کر پریشان ہو گئے، کیوں کہ ہم نے اب تک اپنا ٹکٹ جمع کرنے کا منصوبہ ہر ممکن حد تک خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ احمر نے کڑک دار آواز میں کہا ”تم لوگ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے، شمعون میرے مقابل آکھڑا ہوا۔ ”آیاں! تم نے اُس دن کہا تھا کہ پُر دوانے صرف ہماری دشمنی ختم کرنے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی، لیکن ہم اتنے کم ظرف نکلے کہ اُسے دیکھنے اسپتال بھی نہ جاسکے۔ آج ہم نے وہ داغ دھو دیا ہے دوست۔ میں مائیکل اور جارج کے ساتھ ابھی اسپتال سے واپس لوٹا ہوں۔ پُر دواتو ہمیں پہلے ہی معاف کر چکی ہے، لیکن اس کی دشمنی ختم کرنے کی شرط پوری کرنے کے لیے میں خود یہاں چل کر آیا ہوں۔ کیا ہم جیتی باتیں بھلا نہیں سکتے؟“ تمام مسلم لڑکے، لڑکیاں تذبذب کی کیفیت میں گم صم کھڑے تھے، پھر میں نے ہی آگے بڑھ کر شمعون کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”نظریات کا اختلاف اپنی جگہ، لیکن ہماری تم لوگوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ہم مسلم تو اس وقت اپنی شناخت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مطمئن رہو، ہمارے دل بہت بڑے ہیں، تم سے کوئی گلہ باقی نہیں رہا۔“ میں بات ختم کر کے واپس پلٹا، لیکن شمعون کی بات نے میرے قدم روک لیے۔ ”اپنی اس جنگ میں ہمیں شامل نہیں کرو گے آیاں.....“ میں چونک کر واپس پلٹا تو شمعون کے ہاتھ میں بہت سے ٹکٹ لہراتے نظر آئے ”یہ وہ ٹکٹ ہیں، جو یہودی اور عیسائی گروپ کے طلبہ نے سیمینار میں شرکت کے لیے خریدے تھے۔ تم نے اُس دن ٹھیک کہا تھا کہ ہم میں سے شاید کوئی ایک بھی ایسا نہیں، جو اپنے مذہب کی تعلیمات پر پورا اتر سکے یا اپنے دل میں اپنے مذہب کا پورا درد رکھتا ہو۔ ہم واقعی ایک بھیڑ چال کا شکار ہیں، لیکن میں آج ذاتی طور پر اس مخالفت برائے مخالفت کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ پُر دوانے مجھے بتا دیا ہے کہ تم لوگ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ جمع کرنے کے مشن میں مصروف ہو۔ میں تم لوگوں کے لیے اور تو کچھ نہیں کر سکتا، بس یہ ٹکٹ حاضر ہیں۔ اسے پُر دوا کے زخموں کا بدلہ ہرگز نہ سمجھنا۔ یہ بس ایک کفارہ ہے۔ شاید ”مقدس“ کو مقدس سمجھنے کی طرف ہمارا یہ پہلا قدم ہے۔“ شمعون میرے ہاتھ میں ٹکٹ تھما کر تیزی سے پلٹا اور اس کے پیچھے اس کے تمام ساتھی بھی چل پڑے۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا ”بات سنو شمعون.....“ شمعون ٹھٹھک کر رک گیا۔ پورے ماحول پر شدید تناؤ چھا گیا۔ میں چند قدم چل کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر میں نے اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھا دیا۔ شمعون کی آنکھوں میں خوشی کی تیز چمک لہرائی اور اگلے ہی پل اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے گلے لگا لیا۔ چاروں طرف سیٹیوں اور تالیوں کا ایک شور مچا گیا۔ صنم کبیر کے ہر لہجہ تیار آنسو چھلک پڑے اور مجھے لگا کہ شمعون اور جارج کے ساتھ مل جانے سے ہم آدھی جنگ جیت بھی گئے۔ میں شمعون اور جارج کو رخصت کرنے کے لیے ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ جارج نے جاتے جاتے دھیرے سے میرے کان میں کہا ”پتا نہیں، مجھے تمہیں یہ بات بتانی چاہیے کہ نہیں، لیکن مجھے شک ہے کہ تمہارا بھائی بسام سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا جا رہا ہے۔ اس سیمینار کی ہم کے دوران میں نے کئی بار اُسے کچھ مشکوک لوگوں سے بات کرتے دیکھا ہے۔ شاید یہ میرا وہم ہو، لیکن میں نے تمہیں بتانا ضروری سمجھا۔“ جارج میرا شانہ تھپتھا کر آگے بڑھ گیا اور میں، وہیں ان گنت سوالوں کی سولی پر لٹکا رہ گیا۔ قدرت کب، کس وقت اور کیسے کسی کی کاپی لپٹ دیتی ہے، یہ ہم انسان کبھی نہیں جان پائے۔ کل تک جو میرے بدترین دشمن تھے، پُر دوا کی قربانی کی وجہ سے وہ آج میرے شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے، مگر میرا اپنا خون مجھے چھوڑ کر دشمنوں کے ساتھ جا ملتا تھا۔ میرے وجود میں ڈھک کی ایک شدید تیز لہر کسی نیزے کی طرح رُوح کی گہرائیوں تک پیوست ہو گئی، لیکن جنگ میں سپاہی اپنے رستے لہو کے قطرے اور گھلے زخم نہیں کبنا کرتے۔ انہیں تو بس آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ جنگیں رشتوں کو مد نظر رکھ کر نہیں لڑی جاتیں۔ سو، میں بھی آگے بڑھ گیا۔

ہاسٹل میں احمر اور بلال ٹکٹ گن رہے تھے، مجھے دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”مبارک ہو آیاں! ہمارے پاس اب پورے دو ہزار نو سو ننانوے ٹکٹ موجود ہیں۔ صرف ایک ٹکٹ کم ہے، لیکن اب پورا ہال ہمارے قبضے ہی میں ہوگا۔“ صنم کبیر نے جلدی سے اپنے بیگ سے یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہال کے انتظامی منشور کا کتابچہ نکال کر پڑھا۔ ”کاش! یہ آخری ٹکٹ بھی ہمارے پاس ہوتا، تو ہم یونیورسٹی کے آڈیٹوریم قوانین کی رُو سے تمام ہال کو باقاعدہ سیل بھی کروا سکتے تھے، کیوں کہ اس منشور میں صاف درج ہے کہ اگر کسی بھی فرد یا گروہ کے پاس نشستوں کی فروخت کی صورت میں پورے ہال یا مکمل تین ہزار نشستوں کے حقوق حاصل ہوں، تو وہ اُس خاص پروگرام یا ایونٹ کے لیے اُس مخصوص دن کی حد تک ہال کی ملکیت حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اگر ایک ٹکٹ یا نشست بھی کسی دوسرے فرد یا گروہ کی ملکیت ہو، تو پھر باقی تمام ٹکٹ حاصل کرنے کے باوجود اکثریتی گروپ اُس روز اس پروگرام یا تقریب کے لیے ہال کے تمام حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔“ احمر نے جو شیلے لہجے میں سب کو مخاطب کیا۔ ”لیکن ہمارے پاس ابھی پوری رات پڑی ہے۔ ہم کوشش تو کر سکتے ہیں، اس آخری ٹکٹ کو پانے کی بھی۔ ہمیں مختلف ٹولیوں میں بٹ کر وہ ٹکٹ تلاش کرنا ہوگا اور اس آخری ٹکٹ کی جتنی بھی قیمت لگے، اُسے حاصل کرنا ہی ہوگا۔ صرف اسی صورت میں یونیورسٹی انتظامیہ اور اس ڈینش این جی او کو منہ توڑ جواب دے سکیں گے۔“ پورا گروپ اپنی اپنی بولیاں بول رہا تھا، جب کہ میرے ذہن میں صرف ایک ہی خدشہ بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ کہیں اگر وہ آخری ٹکٹ خود ڈین یا یونیورسٹی انتظامیہ کی ملکیت ہو تو، پھر..... شام ڈھلنے لگی تھی اور آسمان پر گلابی بادلوں کی دھند ایک بار پھر برف باری کی توشن گونی کر رہی تھی۔ میں نے صنم کبیر سے کہا کہ میں ایک آخری کوشش کے طور پر بسام سے ملنا چاہتا ہوں۔ لڑکے اور لڑکیاں آخری ٹکٹ کی کھوج میں گھڑیوں میں بٹ کر روانہ ہو چکے، تو میں اور صنم بھی ہاسٹل سے نکل آئے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور ہوا کے ساتھ آسمان سے ہلکے پھلکے برف کے گالے بھی اڑا کر ہمارے سروں میں چاندی بکھیرنے لگے تھے۔ میں اپنے پارٹمنٹ کی بیرونی سڑک ہی پر رک گیا،



جہاں کافی بنانے کی خود کار مشین سے نپٹا سادھواں اٹھ رہا تھا۔ صنم، بسام کو بلانے کے لیے اوپر چلی گئی اور جب تک بسام اس کے ساتھ نیچے واپس آیا، برف باری تیز ہو چکی تھی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں گم تھا، مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں فٹ پاتھ پر نصب جس شیخ پر بیٹھا ہوں، اسے برف نے مکمل طور پر ڈھک لیا ہے۔ بسام نے قریب آ کر میرا نام لیا تو میں چونک کے کھڑا ہو گیا۔ صنم کبیر کچھ فاصلے پر بنے شیشے کے چوہا رہ نمائیں اسٹاپ کی چھت کے نیچے کھڑی رہی، لیکن میں اتنی دُور سے بھی دعا کے لیے اس کے تیزی سے ہلنے لیوں کی جنبش محسوس کر سکتا تھا۔ میں اور بسام کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بسام ہی نے بات شروع کی۔ ”کیسے ہو؟“، ”ٹھیک ہوں، بس ہر سردی کے ساتھ ہونے والے فلو نے تنگ کر رکھا ہے۔“ بسام نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کی۔ ”تم اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتے، سارا دن اور ان برقیلی شاموں میں بائیک دوڑاتے پھرو گے، تو یہی ہوگا۔“ پھر بائیک کا ذکر کرتے ہی بسام خود چونک سا گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا ”تمہاری بائیک کہاں ہے؟“، ”میں نے بائیک بیچ دی ہے یار.....“ بسام کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میری زندگی میں اُس بائیک کی کتنی اہمیت تھی کہ جسے میں بسام کو بھی مجھو نے نہیں دیتا تھا۔ ”کیا..... تم نے بائیک بیچ دی، مگر کیوں؟“، ”میرے گروپ نے سیمینار کے زیادہ سے زیادہ ٹکٹ جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور میرے پاس بیچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا، تو بائیک بیچ دی۔“ بسام ابھی تک حیرت اور ڈکھ سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ ”یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا، آج تمہیں دیکھ کر کون اس بات پر یقین کرے گا کہ یہ وہی لڑکا ہے، جو پورے شہر کے سو جانے کے بعد اپنی بائیک پر آوارہ گردی کے لیے نکلا کرتا تھا۔ تم کتاب بدل گئے ہو آیان۔“ میں نے کہیں دُور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا ”شاید وقت ہر چیز بدل دیتا ہے، خون کے رشتے بھی۔ ایسا نہ ہوتا تو آج تم میرے خلاف سی آئی اے کا ساتھ نہ دے رہے ہوتے۔ مجھے سی آئی اے، ایف بی آئی یا کسی بھی ایسی دوسری ایجنسی کا کوئی خوف نہیں، لیکن میں آج آخری بار تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ یہ لوگ اپنے سوا کسی اور کے نہیں ہوتے۔ جانے انہوں نے تمہیں کس موقع اور مقام کے لیے تیار کرنے کی ٹھانی ہے، لیکن یاد رکھنا کہ یہ ایجنسیاں خود کسی جنون کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ ہم مسلمانوں پر انتہا پسندی کا الزام لگاتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ خود نفرت کے جنون کی ایک زندہ مثال ہیں۔ ہو سکے، تو ان سے بچ کر رہنا۔“ برف نے پوری سڑک اور آس پاس کی ہر شے سفید سے ڈھک دی تھی۔ میں بات ختم کر کے واپس پلٹا، تو میرے قدموں کے نشان برف میں ثبت ہوتے گئے۔ بسام نے مجھے آواز دی ”ٹھہرو آیان.....“ میں رُکا۔ بسام کی آواز میں درد تھا۔ ”گھر واپس لوٹ آؤ یار! یہ ہم دونوں کن مخالف سمتوں میں چل پڑے ہیں۔ میں سی آئی اے کے ساتھ صرف اس لیے رابطے میں ہوں، تاکہ وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں، لیکن بات میرے ہاتھ سے بھی نکلتی جا رہی ہے۔ پولیس آج کل جگہ جگہ مسلم طلبہ کو انتہا پسندوں سے روابط رکھنے کے الزام میں گرفتار کر کے عمر بھر کے لیے جیلوں میں ڈال رہی ہے اور کون جانے کہ انتہا پسندی کا یہ چارہ بھی خود یہی ایجنسیاں تیار کرتی ہوں۔ یہ لوگ اپنی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں آیان۔ اُن کے راستے کی رکاوٹ نہ بنو، میری بات مان جاؤ۔“ میں نے ڈکھ کے ساتھ اپنے بھولے بھیا کو دیکھا۔ ”حیرت ہے، تم یہ سب کچھ جانتے ہو، پھر بھی ان کا ساتھ دے رہے ہو؟“ اس لیے کہ یہ ان کا ملک ہے۔ میں اور تم بھی امریکی ہیں اور یہ ہر امریکی کا حق ہے کہ وہ چین اور سکون سے اپنے ملک میں زندگی گزارے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”ہاں، بھینٹا یہ ہر امریکی کا حق ہے، لیکن شاید ہر مسلمان امریکی نہیں۔ بہر حال، میں تم سے مزید کوئی بحث نہیں کروں گا۔ ہم دونوں اپنا اپنا راستہ پھنسنے کا حق رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے مذہب کے لیے امریکی قوانین کے اندر رہ کر لڑنے کا راستہ چننا ہے، مگر تمہارا راستہ کیا ہے، یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔“ بسام کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”کس مذہب کی حفاظت کی بات کر رہے ہو تم، وہ، جس پر عمل کیے برسوں بیت چکے، جسے آج تک تم نے کسی ناگوار فریضے کے طور پر برائے نام بھی ادا نہیں کیا، جس کے فرائض تو درکنار، بنیادی ارکان کو سمجھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تمہیں۔ آج اسی مذہب کی حفاظت کا بیڑا اٹھا رہے ہو تم۔ حیرت ہوتی ہے مجھے تمہاری ان باتوں پر آیان۔“ میں سر جھکائے بسام کی بات سنتا رہا۔ زمین پر ہمارے قدموں کے ارد گرد برف کا گڑھا بھرتا جا رہا تھا۔ ”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ وہی مذہب ہے، جس پر میں نے کبھی عمل کرنے کا سوچا تک نہیں تھا، جسے میں آج تک برائے نام بھی پورے دل سے ادا نہیں کر سکا اور جس کے بنیادی ارکان کو اپناتے اپناتے میرا جیون بیت گیا، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے بسام۔ کیا مجھے آج تک تم نے یا ڈیڈ نے اپنی زندگی میں کبھی ایک پل کے لیے بھی اس مذہب کو سمجھنے یا سیکھنے کی تلقین کی تھی۔ کیا ہم امریکا میں آکر اسی ست رنگی زندگی کے جال میں خود کو الجھا نہیں بیٹھے تھے۔ گھر میں صرف ہماری ماں تھیں، جو اس دین سے ہمارے تعلق کا واحد ذریعہ تھیں، لیکن کیا ہم دونوں نے کبھی ان کی بات ہی غور سے سُنی۔ میرے، تمہارے اور ہم جیسے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کے پاس مذہب یا اسلام کا کریڈٹ ہی کتنا ہے، صرف اتنا کہ ہمیں خدا نے کسی مسلمان گھرانے میں پیدا کر کے ہماری مشکل آسان کر دی، ورنہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ اگر ہم کسی عیسائی یا یہودی گھرانے میں پیدا ہوتے، تو کیا تب بھی ہمارے اندر اتنی جرأت، اتنی روشنی ہوتی کہ ہم خود اپنی کھوج کے بل پر اس مذہب کے دروازے سے اندر داخل ہو پاتے۔ کم از کم میں تو خود میں، ایسی سچائی کی کوئی جوت چلتے نہیں دیکھتا، لیکن آج اگر قدرت نے خود مجھے ایک موقع دیا ہے کہ میں اپنے دین کے لیے یہ چھوٹی سی خدمت اور کارگزاری دکھا سکوں تو کیا مجھے یہ سوچ کر رک جانا چاہیے کہ مجھے تو فرض نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں رہیں۔ میں دو کلموں کے بعد تیسرے کلمے ہی پر گڑبڑا جاتا ہوں۔ مجھے وضو کے فرض اور سنتوں کا فرق پتا نہیں، یا میں نے آج تک روزہ نہیں رکھا، زکوٰۃ نہیں دی۔ اگر تقدیر نے موقع اور قدرت نے توفیق دی تو ایک دن یہ سب بھی سیکھ ہی جاؤں گا، لیکن میرے مقدر نے مجھے اس کل ہونے والے سیمینار کے ذریعے اپنے مذہب سے روشناس ہونے کا ایک موقع فراہم کیا ہے، شاید اگر ہم پاکستان میں ہوتے، تو میں بھی ہر عام مسلمان کی طرح کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ترتیب سے دین کو سمجھ پاتا، لیکن ہم امریکا میں پلے بڑھے ہیں بسام، لہذا مجھے اتنی رعایت تو دو کہ میں اپنی خامیوں پر قابو پانے کی کوشش کر سکوں۔ کل وہ جس دین پر کچھڑا چھالنے جا رہے ہیں، وہ تمہارا بھی مذہب ہے اور جس عظیم الشان ہستی کی شان میں (نعوذ باللہ) گستاخی کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ صرف میرے تمہارے نہیں، پوری کائنات کے نبی آخر الزماں ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم ہماری صف میں کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ لڑتے ہو یا پھر دشمنوں کے ساتھ کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے ہو۔ ہاں، البتہ دونوں صورتوں میں تم مسلمان ہی کہلاؤ گے۔“ میں بسام کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسری سمت بڑھ گیا۔ شاید صنم کبیر بھی میرے نقش قدم پر چل پڑی تھی۔ تب ہی مجھے اُسے پکارتی بسام کی آواز سنائی دی، لیکن وہ نہیں رکی۔ جب تک ہم دونوں صنم کی دُور پارک کی گئی کار تک پہنچے، دونوں تیز گرتی برف سے ڈھک چکے تھے۔ صنم نے دھیرے سے کہا۔ ”چلو میں تمہیں



ہاسٹل تک چھوڑ دیتی ہوں۔“ اس کی بھیگی پلکیں بتا رہی تھیں کہ اس نے بسام کی پکار پر نہ رکنے کے لیے اپنے اندر کتنی بڑی جنگ لڑی ہے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ٹھیک اُسی لمحے میرے موبائل پر احمر کا نمبر جگمگانے لگا۔ ”ہیلو“ دوسری جانب سے احمر کی پریشانی سے بھرپور آواز ابھری۔ ”آیاں، تم اس وقت کہاں ہو.....؟“، ”اپنے اپارٹمنٹ کی بیرونی سڑک پر، کیوں خیریت.....؟“، ”نہیں، سب ٹھیک نہیں ہے۔ نیویارک پولیس نے تمہیں گرفتار کرنے کے لیے کچھ دیر قبل مسلم ہاسٹل پر چھاپہ مارا ہے۔ ان کے ساتھ کچھ سادہ لباس والے اور وہ آفیسر فورڈ بھی ہے، جو تم سے ملنے اُس روز اسپتال آیا تھا۔ تم وہاں سے جلدی نکلنے کی کوشش کرو، کیوں کہ یہاں ناکامی کے بعد یہ لوگ ضرور تمہارے گھر پر بھی دھاوا بولیں گے اور ہاں، مسلم ہاسٹل کی طرف بالکل نہ آنا۔ یہ لوگ پوری رات یہاں پہرے کا منصوبہ بنا کر آئے ہیں۔ تم گراؤنڈ زیر و کھنچنے کی کوشش کرو۔ ہم کچھ انتظام کرتے ہیں۔“ احمر نے جلدی میں فون بند کر دیا۔ میں نے حیران پریشان سی کھڑی صنم کبیر کو پوری بات بتائی، اُسے غصہ آ گیا۔ ”میں جانتی تھی، یہ لوگ سیمینار سے پہلے ہمارے خلاف کریک ڈاؤن ضرور کریں گے اور ہماری کمزورتوں کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کاؤنٹر کو ایک رات پہلے گرفتار کر کے اس سیمینار کی سازش کو کامیاب بنایا جائے۔“ صنم کبیر تنگ گلیوں کے درمیان گاڑی دوڑاتی گراؤنڈ زیر و کی طرف بڑھتی رہی۔ ہم مرکزی شاہراہوں پر پولیس کی موجودگی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اور میں کل یونیورسٹی جائے بنا کسی بھی حال میں گرفتاری نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہم گراؤنڈ زیر و کھنچنے تو گھڑیاں رات کے بارہ بج چکا تھا۔ چوراہے کے گرد تیز زرد رنگ کی طاقت ور لائٹس نے آس پاس گرتی برف پر بھی نارنجی رنگ چھڑک کر آگ سی دکھا رکھی تھی۔ صنم کبیر میرے ساتھ وہاں رکنا چاہتی تھی، لیکن میں نے زبردستی اُسے گھر بھجوا دیا، کیوں کہ میری آج رات گرفتاری کی صورت میں اُسے کل صبح بہت اہم ذمے داری نبھانا تھی۔ وہ جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر میری جانب دیکھتی رہی اور پھر اس کی کار سفید دھند میں کہیں غائب ہو گئی۔

میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اونچے کر کے زپ اوپر تک کھینچ لی۔ تیز برجھی جیسی ہوا، میرا رواں رواں کاٹ رہی تھی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ایک سیاہ وٹین گراؤنڈ زیر و کے چوراہے کے گرد گھومتی گول سڑک پر نمودار ہوئی۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ فورڈ کی گاڑی ہے، لیکن قریب آنے پر، اس میں سے میرے پرانے چاروفادار یار برآمد ہوئے۔ ”ہے آیاں..... سو ری ہمیں آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ نیویارک پولیس پورے شہر میں تمہاری تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ میں بنا کچھ کہے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایرک نے مجھے راستے میں بتایا کہ پولیس کی پوری کوشش ہے کہ مجھے کل صبح یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے گرفتار کر لیا جائے، کیوں کہ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد تین ہزار طلبہ کی موجودگی میں مجھے کیسپس سے گرفتار کرنا اُن کے لیے کافی مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔ جینی خود وین ڈرائیو کر رہی تھی۔ اُس نے ویسٹ اور سٹریج کی جانب سے لمبا موڑ کاٹا اور بولی ”لیکن تمہیں صبح یونیورسٹی کیسپس میں اتنے سخت کڑے پہرے میں داخل کروانا بھی ناممکن ہوگا۔ اس لیے ہم نے ایک آخری بھوکھیلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم آج رات ہی تمہیں دوبارہ مسلم ہاسٹل میں کسی بھی طرح پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ پولیس وہاں کی تلاشی کے بعد کافی حد تک مطمئن ہو چکی ہوگی اور اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ تم دوبارہ وہاں آؤ گے اور صبح یونیورسٹی شروع ہوتے ہی تمہیں اندرونی راستے سے کیسپس پہنچا دیا جائے گا۔ ایک بار تم یونیورسٹی کی چار دیواری میں داخل ہو جاؤ، پھر پورے نیویارک کی پولیس اور ایجنسیاں مل کر بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں“، ”لیکن انہوں نے مجھ پر الزام کیا لگایا ہے۔ اچانک ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا مجھ سے کہ انہیں یوں راتوں رات میری تلاش میں پورا شہر چھاننے کی ضرورت پیش آ گئی؟“ فرہاد کھڑکی سے باہر گرتی برف کے گالے اپنی مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”تم پر مسلم انتہا پسندوں سے رابطے رکھنے کا الزام ہے۔ سی آئی اے کی اطلاع کے مطابق تم نے کسی جنونی گروپ کے ساتھ مل کر کل کے سیمینار کو بم دھماکے سے سبوتاژ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔“ فرہاد کی بات سن کر خود میرے سر پر بہ یک وقت کئی دھماکے ہوئے۔ میں نے انہیں حافظہ ٹھیکل کو آنے والی کال اور اس کے بعد کا تمام واقعہ سنا دیا۔ جم نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ ”پھر تو یہ واقعی بہت پریشانی کی بات ہے۔ اب آگے کیا ارادہ ہے؟“ میں نے وین کے شیشے سے باہر، برف کے جگنو گھٹنے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم کہا ”نی الحال تو مجھے صرف کل کے سیمینار کی فکر ہے، ایک بار یہ معاملہ خوبی سے منٹ جائے، پھر آگے کی سوچیں گے، مگر مجھے احمر نے فون پر بتایا تھا کہ پولیس نے ہاسٹل کے گرد کڑا پہرا لگا رکھا ہوگا۔ کیا ایسی صورت میں ہم ہاسٹل میں داخل ہو سکیں گے؟“ جینی نے تیزی سے گیزر بدلا۔ ”یہی پریشانی ہے مجھے بھی، لیکن اتنا رسک تو شاید لینا ہی پڑے گا ہمیں۔“ اچانک فرہاد کے سیل فون کی گھنٹی بجی، اس نے دوسری جانب کی بات سنی اور پریشانی میں فون بند کر دیا۔ ”پولیس نے ٹھیکل بنگالی کو گرفتار کر لیا ہے، سوڈانی بلال اور مسلم گروپ کے چند دوسرے لڑکوں کو بھی گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا ہے۔ پاکستانی زرک خان بھی ان میں شامل ہے۔“ وین میں کچھ دیر سناٹا طاری رہا، صرف برف پر پھسلنے نازوں کی مدہم آواز کچھ اس طرح سنائی دیتی رہی، جیسے بہت دُور کوئی جھرتا بہہ رہا ہو۔ مسلم گروپ کے لڑکوں کی گرفتاری نے ہم سب کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے شدید پریشانی کے عالم میں فرہاد سے پوچھا ”ہال کے جمع شدہ ٹکٹ کس کے پاس ہیں؟“ فرہاد کا چہرہ بھی تاریک ہو گیا۔ ”ٹکٹ.....؟ ٹکٹ تو ہم سب ہی نے گن کر دو بارہ بلال کے حوالے کر دیے تھے۔ اوہ میرے خدا! کہیں پولیس کے ہاتھ بلال کے ساتھ وہ ٹکٹ بھی.....“ فرہاد پریشانی میں خود اپنی بات بھی ختم نہ کر سکا۔ ٹکٹس کی گم شدگی کی صورت میں یونیورسٹی آڈیٹوریم کے قوانین کے مطابق یونیورسٹی انتظامیہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے طور پر نشستوں کی دوبارہ تقسیم کر دے۔ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق ”مصیبتیں اور مشکلات کبھی تنہا نہیں آتیں۔“ شاید ہماری آج کی رات اس محاورے کو پوری طرح سچ ثابت کرنے پر تلنی تھی۔ جینی نے ہاسٹل جانے والی سڑک پر گاڑی موڑی تو سامنے ہی ایک لمبی قطار میں نیویارک پولیس کی نیلی پٹیوں والی سفید کاریں کھڑی نظر آئیں۔ کاروں کی چھت پر لگی نیلی اور سُرخ بتیوں کی گھومتی روشنیوں سے پورا ماحول جگمگا رہا تھا۔ ہاسٹل کے باہر کافی چہل پہل نظر آرہی تھی اور پولیس کے علاوہ سادہ لباس والے بھی ادھر ادھر آتے جاتے اور سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔ ایرک نے سرگوشی کی۔ ”یہ تو ابھی تک یہیں دھرتا دیے بیٹھے ہیں۔ اب کیا کریں۔“ جینی نے حتیٰ فیصلہ کر لیا۔ ”آیاں..... تم گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھی ترپال سے خود کو اچھی طرح ڈھک لو اور جب تک میں خود تمہیں آواز نہ دوں، کچھلی سیٹوں کے درمیان ہی دیکے رہنا۔ ہمیں کسی بھی حال میں اندر داخل ہونا ہوگا، کیوں کہ یہودی اور عیسائی ہاسٹل بھی احاطے کے اندر ہی ہیں۔ اگر وہ مسلم ہاسٹل کے باہر بھی پہرہ لگائے بیٹھے ہوئے، تو ہم ہاسٹل بدل بھی سکتے ہیں، لیکن یہ سب کیسپس میں داخلے کے بعد ہی ممکن ہوگا۔“ میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا اور جینی کی ہدایت کے مطابق پیچھے جا کر ترپال کا زرد آسمان خود پر اوڑھ لیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر چند فرلانگ آگے بڑھی اور پھر ہاسٹل کا گیٹ آ گیا۔ کسی پولیس والے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیٹن سے زور سے گاڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کڑک کر بولا ”ٹھہرو، کہاں سے آرہے ہو تم لوگ..... کون کون ہے گاڑی کے اندر، دروازہ کھولو۔“ میں نے دم سادھ لیا۔ سخت سردی کے باوجود میری کن پٹی سے پسینے کا ایک قطرہ تیزی سے بہہ کر ترپال میں جذب ہو گیا۔ کسی نے گاڑی کا پچھلا دروازہ زوردار انداز کے ساتھ کھول دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا کھیل یہیں ختم ہونے والا ہے۔..... (جاری ہے)



گماں سے ادراک، عدم اعتماد سے تسلیم کی خوتک..... تلاش حق کا ایک اور سفر



ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے مقبول ترین ناول نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر، حال ہی میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی دینے کا بھی اعلان کیا۔ ”مقدس“ ان کا پانچواں ناول ہے، جو جلد ہی ”The Sacred“ کے نام سے انگریزی ترجمے کی صورت میں بھی دست یاب ہوگا۔ مقدس سے پہلے ان کے ناول خدا اور محبت، بچپن کا دسمبر اور عبداللہ بین الاقوامی پزیرائی و کامیابی حاصل کر چکے۔ زیر نظر ناول ”مقدس“ امریکا کے شہر، نیویارک اور ٹائن ایون کے سانحے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جو یقیناً عبداللہ ہی کی طرح اردو ادب میں ایک مثبت تبدیلی، جدت و ندرت کا سبب اور کچھ نئے زاویوں، نئی جہتوں کی تلاش میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ ناول نگار سے براہ راست رابطے کے لیے اس ایڈریس پر ای میل بھی کر سکتے ہیں۔

novelmuqaddas@janggroup.com.pk



گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی جینی کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ ”کیا بات ہے آفیسر، کیا آج پھر ان مسلمان انتہا پسندوں نے کوئی حرکت کی ہے، جان عذاب میں کر رکھی ہے ان بچوں نے۔“ کسی دوسرے پولیس والے کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں، آگے کچھ گڑ بڑ ہے۔ تم تینوں بھی اسٹوڈنٹ ہو کیا؟“ تین کا لفظ سن کر میں چونکا، اس کا مطلب تھا کہ فرہاد کو وہ لوگ پہلے ہی اُتار چکے تھے۔ ایرک نے جواب دیا ”ہاں میں ایرک، یہ جم اور وہ جینی، اور یہ رہے ہمارے یونیورسٹی کارڈ، لیکن تم نے بتایا نہیں، معاملہ کیا ہے؟“ پولیس والے نے بے زاری سے کہا ”معاملہ کیا ہوتا ہے، وہی مذہبی جنونیت کا قصہ۔ ان مسلمان لڑکوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے، پوری نیویارک پولیس کا۔ تم لوگ اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“ ”ہم ذرا کلب تک گئے تھے، عیسائی ہاسٹل سے اپنے دوست کو لے جانے آئے ہیں۔ آج جینی کی سال گرہ ہے اور ہم صبح تک بھاگتا کر رہے گئے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو آفیسر۔“ پولیس والے زور سے ہنسے۔ ”سال گرہ مبارک ہو، خوب صورت لڑکی، پر ہمارے ایسے نصیب کہاں..... اچھا تم لوگ اندر جا سکتے ہو، مگر مسلم ہاسٹل والی سڑک سے نہ جانا، وہ راستہ سیل کر دیا گیا ہے۔“ پولیس والے نے وین کا پچھلا دروازہ دھکیل کر بند کر دیا۔ ایرک اور جم نے شکر یہ ادا کیا اور جینی نے وین آگے بڑھادی اور پھر جب وین رکی تو میں نے خود کو عیسائی ہاسٹل کے احاطے میں پایا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ”تم تینوں کو کسی نوٹسکی میں اچھا موقع مل سکتا ہے، یونیورسٹی کے بعد بھوکوں نہیں مرو گے۔“ ایرک نے ڈھٹائی سے دانت نکالے ”تو پھر طے رہا، اس بار کے ڈراما فیسٹیول میں جب ہم شیکسپیر کا میک تھ بھیلیں گے، تو تم ہماری اداکاری دیکھنے ضرور آؤ گے۔“ کچھ ہی دیر میں عیسائی کاؤنسلر جارج نیچے احاطے میں پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اُسے تمام صورت حال بتائی، جس کی زیادہ تر تفصیل اُسے پہلے ہی معلوم تھی۔ اس نے ہمیں تسلی دی۔ ”ہاں، یہ خبر مجھے تک پہنچ چکی ہے، لیکن تم لوگ فکر نہ کرو۔ آج یہ رات یہیں ہمارے ہاسٹل میں گزار سکتا ہے اور صبح ہم سب اسے عیسائی طلبہ کے جھوم کے ساتھ یونیورسٹی کیسپس بھی پہنچا دیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب عیسائی طلبہ اس بات پر سخت حیران ہیں کہ ایک مسلم لڑکے کی گرفتاری کے لیے پوری نیویارک پولیس اور ایجنسیاں اس قدر بے تاب کیوں ہیں، کہیں یہ کسی ”سچ“ کا خوف تو نہیں ہے۔“ ہم چپ رہے، وہ تینوں پولیس سے کچھ دیر کی اجازت لے کر اندر آئے تھے، لہذا اُن کا جلدی واپس لوٹنا ضروری تھا۔ جارج نے دکھاوے کے لیے ایک لڑکے کو ان کی گاڑی میں بٹھادیا، تاکہ واپسی پر پولیس والے انہیں روکیں بھی تو چوتھا فرد، جسے لینے وہ ہاسٹل آئے تھے، ان کے ساتھ موجود ہو۔ جاتے ہوئے جم اور ایرک نے خوب ہنسنے لگے۔ ”اپنا خیال رکھنا یا! ہم صبح ہوتے ہی لوٹ آئیں گے۔ سویرا ہونے میں بس چند گھنٹے ہی باقی ہیں۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”کاش! ہمارے مقدر کا سویرا اتنا قریب ہوتا، مجھے تو ابھی مزید شام اترنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔“ میری بات سن کر ان سے مزید وہاں رکا نہ گیا اور افسردہ سے گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گئے۔

جارج نے مجھے ایک خالی کمرے میں پہنچا دیا، جہاں میں تمام رات آتش دان کی راکھ کرید کر کھڑکی سے باہر گرتی برف کا نظارہ کرتا رہا۔ برفیلے موسم کی صبح نہایت دودھیا ہوتی ہے، جیسے آسمان سے ٹوڑکی برسات ہو رہی ہو۔ برف کی قلعی پورے ماحول کو اس قدر پاکیزہ کر دیتی ہے، جیسے کائنات پر کبھی کسی کے گناہ کا ایک سیاہ دھبہ بھی نہ لگا ہو۔ یہ اُجلا پن اور دودھیا اُجالا انسان کی روح تک پُر نور کر دیتا ہے۔ میں بھی اپنی روح کو اسی سفیدے سے اُجال رہا تھا، جب جارج نے کیسپس جانے کے لیے میرے دروازے پر دستک دی۔ میرے کمرے کے باہر تقریباً ایک سو سے زائد عیسائی طلبہ کا جھوم تھا، جو اپنی آڑ میں مجھے کیسپس کے آڈیٹوریم تک لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے جارج کا نم پلکوں کے ساتھ شکر یہ ادا کیا، تو اس نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ ”یہ میرا فرض تھا مسلم کاؤنسلر..... کیوں کہ ہر مذہب، اُس کے ماننے والوں کے لیے ”مقدس“ ہوتا ہے اور یہ ہم نے تم ہی سے سیکھا ہے۔“ ہم لوگ عیسائی ہاسٹل سے باہر نکلے تو کیسپس کے آس پاس پولیس اور سادہ لباس والوں کی کافی نفری بکھری نظر آئی۔ کچھ ہی دیر میں شمعوں کے گروپ کے لڑکے بھی عیسائی لڑکوں سے آن لے اور جھوم بڑھتا چلا گیا۔ پولیس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ایک مسلمان کاؤنسلر کی حفاظت کے لیے اتنے یہودی اور عیسائی طلبہ جمع ہوں گے۔ کیوں کہ مسلمان طلبہ کو تو باقاعدہ تلاشی اور شناختی کارڈ چیک کرنے کے بعد اندر جانے کی اجازت دی جا رہی تھی، جب کہ یہودی اور عیسائی طلبہ کو محض تعارف کے بعد داخلے کی اجازت تھی۔ میں تین ساڑھے تین سو طلبہ کے گھیرے میں اطمینان سے آڈیٹوریم تک پہنچ گیا۔ ایرک، جم اور جینی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پنا وقت ضائع کیے اسی چہل پہل کے درمیان مجھے اسٹیج کے پردے کے پیچھے ایک کشادہ سے کمرے میں پہنچا دیا، جہاں عام حالات میں یونیورسٹی کے تھیٹر کی ریہرسل ہوا کرتی تھی۔ لکڑی کے چکے تختوں کے فرش والا یہ طویل کمرہ اس وقت سُنان تھا۔ مجھے نکتوں کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی، کیوں کہ اگر بلال کی گرفتاری کے وقت نکٹ اُس کی جیب میں تھے، تو تب ہم یقیناً ایک بڑی مشکل کا شکار ہو چکے تھے۔ میں ایک کھڑکی کے قریب کھڑا ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک کسی کے قدموں کی ہلکی آواز نے چونکا دیا۔ بے خیالی میں نظر اٹھائی تو نظریں وہی جمی رہ گئیں۔ یہ کمرہ انگریزی کے حروف ڈی کی طرز پر بنا ہوا تھا اور ڈی کے آدھے دائرے والے حصے میں بیرونی دالان کی طرف نکلتی مستطیل شیشے کی کھڑکیاں چُٹی ہوئی تھیں، جن سے باہر کا برفیلا اُجالا چھن کر اندر آ رہا تھا۔ میں نے اُسی دودھیا روشنی کے ایک مستطیل ٹکڑے میں پُر واکو کھڑے دیکھا۔ ہاں، وہ پُر وانی تھی۔ کھڑکی سے چھن کر اندر آتا نور بھی اُس کے چہرے کی زردی کم نہیں کر پایا تھا یا شاید نور بھی اس کے چہرے کو چھوتے ہی ”زرد رنگ“ ہو جاتا ہوگا۔ وہ ملبے سے لباس میں ملبوس خود بھی کوئی زرد گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر دھیرے سے اُس کے پگھڑی لب ہلے ”آج آج.....“ میں جلدی سے اس کی جانب بڑھا۔ ”پُر واکو! تم..... یہاں، اس وقت.....؟“ وہ مسکرائی۔ ”ہاں، ویسے تو آج شام کو اسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی، لیکن میں ڈاکٹرز سے ضد کر کے صبح ہی وہاں سے چلی آئی“، ”لیکن تمہیں یوں اسپتال سے سیدھا یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں سچ سچ پریشان ہو گیا۔ پُر واکو نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”نہیں آج، آج ہماری زندگیوں کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ آج میں آرام کیسے کر سکتی ہوں اور تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ناں، ہم آج کا دن خیریت سے گزر جانے کے بعد شام کو وہ سپر زریسٹورنٹ میں ملیں گے،



جہاں ہمیں آج صرف اپنی باتیں کرنی ہیں۔ تم جانتے ہو آیان، تمہارے اس وعدے نے مجھے اتنی جلدی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔“ میں نے چونک کر پُروا کی معصوم مسکراہٹ کو دیکھا۔ شاید اُسے باہر کسی نے میری گرفتاری کے لیے جاری مہم کے بارے میں ابھی تک اطلاع نہیں دی تھی۔ اتنے میں احر تیز قدم اٹھاتا پردے کے پیچھے آ پہنچا۔ ”شکر ہے، تم خیریت سے یہاں تک پہنچ گئے۔ چلو جلدی کرو۔ راہ داری میں نکلنے کی گنتی شروع ہونے والی ہے۔“ پُروا نے سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کی جانب دیکھا۔ احر میری مشکل سمجھ گیا اور پُروا سے بولا ”تمہیں صنم کبیر تمام تفصیل بتا دے گی۔ وہ باہر راہ داری میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ چلو، اب دیر نہ کرو۔“ احر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے گم صنم سی کھڑی پُروا کا نازک ہاتھ چند لمحوں کے لیے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”ہاں، مجھے اپنا ہر وعدہ یاد ہے۔ اور اگر تم جسمانی فاصلوں کو بے معنی سمجھو تو جان لو گی کہ آج اس پل، اس لمحے کے بعد میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہر دن کی ڈولی اٹھنے سے لے کر ہر رات کا گھونگھٹ سُر کتنے تک۔ ہر کنواری صبح سے ہر سہاگن شام تک۔ آیان، پُروا کے ساتھ رہے گا۔“ پُروا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”کیا بات ہے آیان، تم مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں رہے۔ تمہارے لہجے میں اتنا یقین اور اتنا درد میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا، بولو ناں۔ کیا بات ہے؟“ میں کچھ بول نہیں پایا۔ بس، اُسے دیکھتا رہا اور وہ بھی چپ چاپ میری آنکھوں میں اُن دیکھے لفظوں کی تحریر پڑھتی رہی اور پھر صنم کبیر کی آواز ہمیں واپس حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ ”آیان، سب لڑکے باہر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے صنم کبیر کے قریب سے گزرتے ہوئے دھیرے سے اُسے کہا۔ ”اس کا خیال رکھنا.....“

ہم تینوں باہر راہ داری میں نکلے تو لڑکوں نے مجھے دیکھ کر زوردار نعرے لگائے۔ احر کے ہاتھوں میں نکت کی گڈی دیکھ کر میرے سینے سے اطمینان کی ایک لمبی سی سانس باہر نکلی۔ گویا بال نے گرفتاری سے پہلے تمام نکت احر کے حوالے کر دیے تھے۔ کچھ ہی دیر میں یونیورسٹی کی طرف سے مدعو شدہ مہمان ہال میں پہنچے گئے۔ پولیس ابھی تک میری کیسپس کی راہ داری میں موجودگی سے بے خبر تھی۔ انتظامیہ کی طرف سے یونیورسٹی کے برسر کو گیٹ پر نکلنے کی گنتی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا، لیکن تمام طالب علم ابھی تک میرے اشارے کے منتظر تھے، کچھ ہی دیر میں ڈین بھی چند ”مہمانانِ خصوصی“ کے ساتھ راہ داری میں پہنچ گیا۔ مجھے دروازے کے قریب کھڑے دیکھ کر اسے حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا، لیکن وہ اپنے تاثرات چھپانا خوب جانتا تھا۔ اس نے لڑکوں کو مخاطب کیا۔ ”تم سب باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر چلو، تقریب کا وقت ہونے والا ہے۔“ ڈین ہماری بات سُنے بغیر اندر چلا گیا۔ صنم کبیر نے پریشانی سے فرہادی کی جانب دیکھا۔ ”اُس آخری نکت کا کچھ پتا چلا.....؟ ہم اس نکت کی غیر موجودگی میں پورے ہال پر اپنا حق ثابت نہیں کر سکتے۔ اگر ایک نشست بھی کسی اور کے پاس رہی تو وہ لوگ یہ سیمینار منعقد کروانے کا قانونی اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔“ فرہاد نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں، ہم وہ آخری نکت نہیں ڈھونڈ پائے۔“ میں نے راہ داری کے باہر میدان میں کھڑے تمام مسلم، یہودی اور عیسائی طلبہ کے چہروں پر نظر دوڑائی، لیکن اُن سب نے بھی سر جھکا دیا۔ میں نے صبر کھو دیا۔ ”آخر وہ آخری نکت کیا کہاں.....؟“ اچانک راہ داری کے آخری سرے سے ایک آواز گونجی۔ ”آخری نکت میرے پاس ہے آیان۔“ ہم سب چونک کر پلٹے۔ راہ داری کے اندھیرے گوشے سے روشنی میں قدم رکھنے والا کوئی اور نہیں، میرا بھائی بسام تھا۔ چند لمحے کے لیے وقت تھم سا گیا۔ بسام چل کر میرے قریب آیا اور نکت میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ”یہ میں نے آفسر فورڈ کے کہنے پر خرید رکھا تھا، لیکن کل رات جب انہوں نے تمہاری تلاش میں ہمارے گھر پر چھاپہ مارا اور اُن کی دیکھا دیکھی پورے نیویارک کے میڈیا نے تمام رات تمہارے نام کے ساتھ دہشت گرد کا لیبل لگا کر خبریں نشر کیں، تو مجھے تمہاری ایک بات یاد آتی گئی۔ تم نے ٹھیک کہا تھا آیان، امریکا صرف امریکیوں کا ہے۔ امریکن مسلمانوں کا نہیں اور آج بسام احمد، تمہارا بڑا بھائی مذہب کی اس جنگ میں تمہارے ساتھ صف آراء ہونے کے لیے یہاں کھڑا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے مذہب کی توہین نہیں کرنے دینا میرے بھائی، چاہے کچھ ہو جائے۔ اپنی جان لڑا دینا آیان، مگر قدم پیچھے نہ ہٹانا..... ہماری لاج رکھ لینا بھیا.....“ بولتے بولتے بسام رو ہانسا ہو گیا اور جب میں نے اسے کھینچ کر گلے سے لگایا، تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں بھی رو پڑا اور وہاں موجود کئی اور آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے بسام کو تھپک تھپک کر خاموش کروایا اور ٹھیک اُسی وقت آفسر فورڈ کی آواز میرے عقب میں گونجی۔ ”واہ کیا بات ہے، اس دور میں دو بھائیوں کے ملن سے بڑھیا نظارہ بھلا اور کیا ہوگا۔ آیان تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے میرے پاس، کل رات سے تم نے پوری نیویارک پولیس کی کافی پریڈ کروالی۔ اب چلو، میرے ساتھ۔“ فورڈ کی بات سن کر طلبہ نے غیر محسوس طور پر میرے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔ میں نے چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈال کر فورڈ کی جانب دیکھا۔ ”کیسپس میں اس وقت تین ہزار طلبہ ہیں اور یہ سب میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ نیویارک کی سڑکوں پر نکلنے کے لیے..... کیا تمہیں اب بھی یقین ہے کہ تم میری مرضی کے خلاف مجھے یہاں سے گرفتار کر کے لے جاسکتے ہو.....؟“ فورڈ نے غور سے اُس پاس دیکھا۔ ”میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں، ایسی کوئی صورت حال پیدا مت کرنا، جو آگے چل کر عدالت میں تمہارے کیس کو مزید بگاڑ دے۔ اگر طلبہ نے تمہاری گرفتاری میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو ہمیں عدالت کو یہ یقین دلانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی کہ تم باقاعدہ تربیت یافتہ اور حالات کو اپنے حق میں استعمال کرنا خوب جانتے ہو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑو۔“ فورڈ، بسام کی جانب مُڑا۔ ”اور تم.....؟ تم بھی اس کے ساتھ مل گئے، میں تو تمہیں کافی حقیقت پسند لڑکا سمجھتا تھا۔“ بسام نے تلخی سے جواب دیا۔ ”ہاں..... کل رات تک میں بھی خود کو یہی الزام دیتا تھا، لیکن تم نے میری آنکھیں کھول دیں مسٹر فورڈ۔ میں نے آج تک تم لوگوں کا ساتھ صرف اس شرط پر دیا کہ تم نے بدلے میں مجھ سے آیان کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ اگر میں تم لوگوں کی مدد کروں گا، تو تم لوگ میرے بھائی پر کوئی آنچ نہیں آنے دو گے، لیکن کل رات مجھے تمہارا اتمام کھیل سمجھ میں آ گیا۔ کیوں آفسر فورڈ، کن انتہا پسندوں کی بات کر رہے ہو تم؟ اگر آیان کے سیل پر آنے والی جنونی گروپ کی کا لڑکا ریکارڈ تمہارے پاس محفوظ ہے، تو آیان سے پہلے تم نے ان کو گرفتار کیوں نہیں کیا اور صرف ایک فون کال ریسیو کرنے پر پورے نیویارک کی پولیس حرکت میں آ گئی، لیکن اس پورے ڈرامے کے مرکزی کردار وہ فون کال کرنے والے تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں، آخر کیوں.....؟ بس اتنی ہی تحقیقات کر سکتی ہے تمہاری سی آئی اے اور کیا تم نے خود مجھ سے تین بار ایسے ان جان نمبرز پر کال کرنے کی درخواست نہیں کی تھی، جن پر تمہیں انتہا پسندوں کے ہونے کا شبہ تھا؟ کون جانے کہ حافظ کلیل اور آیان کو آنے والی فون کالز بھی تم جیسے کسی سی آئی اے کے افسر کے کہنے پر ہی کی گئی ہوں۔“ بسام کی بات سن کر ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ ہم سب کی نظریں فورڈ پر جم گئیں۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔ ”ان سب باتوں کا فیصلہ اب عدالت میں ہوگا۔ میں تمہیں آخری وارنٹک دے رہا ہوں آیان۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ تم پہلے ہی اپنا کیس بہت بگاڑ چکے ہو۔ مزید کوئی حماقت نہ کرنا۔“ میں دو قدم بڑھا کر فورڈ کے بالکل مقابل کھڑا ہو گیا۔ اُس کے آس پاس کھڑے پولیس والوں نے کسی ناخوش گوار صورت حال کے پیش نظر باقاعدہ پوزیشن لے لی۔ ”تمہیں میری گرفتاری کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا آفسر۔ تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ میرا کہیں غائب ہونے کا ارادہ نہیں ہے۔“ لڑکوں نے شدید نعرے بازی شروع کر دی تھی اور احر نے یونیورسٹی کے تمام گیٹ بند کرنے کی ہدایت کر دی۔ فورڈ کی توقع کے برعکس عیسائی اور یہودی لڑکے بھی مسلمان طلبہ کے ساتھ کھڑے دکھائی دیے، تو پہلی مرتبہ اس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے چپکتے نظر آئے۔ پُروا اور صنم نے راہ داری کی دوسری جانب لڑکیوں کی صف بندی کروائی تھی۔

اگلے ہی لمحے ڈین گھبراہٹا ہوا سا ہال سے باہر نکلا۔ ”یہ سب کیا ہنگامہ ہے، فورڈ..... تم پولیس والے کس مرض کی دوا ہو.....؟“ میں نے لڑکوں کو ہال میں چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈین اور انتظامیہ کے ارکان نے مزاحمت کی۔ ”تمہارے خلاف وارنٹ ہیں آیان..... تم ہال میں نہیں آ سکتے۔“ میں نے احر کے ہاتھ سے نکلنے کا بندل لے کر ڈین کو تھما دیا۔ ”یہ پورے تین ہزار نکت ہیں، ہال کی تمام نشستیں ہمارے پاس ہیں اور قاعدے کی رو سے ہم آپ سب کو ہال سے باہر نکال کر اسے باقاعدہ سیل کروا سکتے ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کے ”معزز“ مہمانوں کے سامنے آپ لوگوں کی سبکی کروانا ہمارا مقصد نہیں، لہذا بہتر ہے کہ ہم ہال کے اندر چل کر بات کریں۔“ ہمارے ہاتھ میں تین ہزار نکت دیکھ کر ڈین کا پورا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس نے بے چارگی سے فورڈ کی جانب دیکھا۔ فورڈ نے اسے نظروں ہی نظروں میں قتل رکھنے کا اشارہ کیا اور کچھ ہی دیر میں ہال طلبہ سے بھر گیا۔ ڈینش این جی او والے بڑے پروجیکٹر اور باقاعدہ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے چند لمحے طلبہ کے سیٹوں پر بیٹھنے کا انتظار کیا اور پھر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ فورڈ اور پولیس والے ہال کے دروازوں پر ٹپک گئے۔ این جی او والوں نے پریشانی سے ڈین کی طرف دیکھا۔ میں نے اوپر چڑھ کر وہ بڑی اسکرین نیچے گرا دی، جس پر اُن کافروں نے وہ متنازعہ خاکے دکھانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اسکرین زوردار آواز سے نیچے گر کر ٹوٹی تو ہال میں طلبہ کے نعروں کا شور گونج اٹھا۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ ”ہمیں کسی بھی مذہب کی توہین برداشت نہیں۔ اپنے لیے ہر ایک کا مذہب ”مقدس“ ہے۔ ڈین اپنا سر پکڑے اگلی قطار میں لاچار بیٹھا تھا اور این جی او کے سربراہان اس پر برس رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ نیویارک کا میڈیا لہجہ بہ لہجہ یہ تمام کارروائی براہ راست نشر کر رہا تھا۔ اسٹیج فلڈش لائٹس کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے ڈینش این جی او کے سربراہ پر نظر ڈالی۔ ”شاید آپ سب کو یہ بات جان کر مایوسی ہو کہ یونیورسٹی کے طلبہ کی مرضی کے مطابق آج یہاں کوئی سیمینار نہیں ہوگا۔ نہ ہی کسی قسم کے خاکے دکھائے جائیں گے۔ بحیثیت مسلم کاؤنسلر، اس وقت



میرے پاس یہ طاقت بھی موجود ہے کہ میں یونی ورسی انتظامیہ سمیت آپ سب کو پانچ منٹ کے اندر ہال سے بے دخل کروادوں، لیکن ہم مسلمانوں کو رواداری اور تہذیب کا درس ماں کی گود ہی سے مل جاتا ہے، لہذا باوجود اس کے کہ آپ سب یہاں میرے عظیم مذہب کی توہین کے لیے جمع ہوئے ہیں، میں آپ کو بے عزت کر کے یہاں سے نہیں نکالوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس ہال میں چند عیسائی اور یہودی علماء بھی موجود ہیں۔ وہ جنہیں ہمیں مذہب کی عظمت کا درس دینا چاہیے تھا، وہ خود اس قماشے کا حصہ بنے ہیں، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری نئی نسل نے اس مقدس سرحد کو پار نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں عیسائی اور یہودی کاؤنسلر کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دینا چاہتا ہوں، تاکہ وہ یہاں میرے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس میڈیا کے ذریعے تمام دنیا کو یہ پیغام دے سکیں کہ ہماری نئی نسل، ہر مذہب کے تقدس کو سمجھتی ہے اور اسے پامال کرنے والوں کے خلاف یکجا ہو کر لڑنے کو تیار ہے۔“ جارج اور شمعون اسٹیج پر چڑھ آئے اور ہال ایک بار پھر نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ میں نے عیسائی اور یہودی علماء کی طرف دیکھا۔ ”آپ لوگوں میں سے اگر کوئی اسٹیج پر آ کر بات کرنا چاہتا ہے، تو ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے۔ یہ پیش کش ڈینش لوگوں کے لیے بھی ہے، جو دبے سٹرگاڑ کے یہ خا کے یہاں دکھانا چاہتے تھے۔ کسی کے پاس کوئی دلیل، کوئی جواز ہے، اس مذہبی تعصب اور بے حرمتی کا، تو وہ یہاں اسٹیج پر آ جائے۔“ ہال میں کوئی بل چل نہیں ہوئی۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے ایک معزز مہمان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دوں۔“ ڈین، انتظامیہ اور این جی او والوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے مائیک میں زور سے کہا ”ایک، جم، انہیں لے آؤ۔“ اور پھر اسٹیج کے پیچھے سے وہ دونوں شیخ الکریم کو لیے برآمد ہوئے، جو آج صبح کی فلائٹ سے میری خاص درخواست پر نیویارک پہنچے تھے۔

عامر بن حبیب نے ان کی نیویارک آمد و رفت کا پورا خرچہ خود برداشت کیا تھا اور ہم نے آخری لمحے تک اس بات کو اس لیے خفیہ رکھا تھا کہ کہیں آخری وقت پر انہیں ایئر پورٹ ہی سے واپس نہ بھیج دیا جائے۔ مسلم طلبہ کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ شیخ ان کے درمیان موجود ہیں۔ فورڈ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ شیخ نے مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہال کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ”السلام علیکم..... میرا مذہب ہر بات کا آغاز ہمیشہ سلامتی کی دعا سے کرتا ہے۔ کیا آپ لوگوں میں سے کوئی یہاں اسٹیج پر آ کر باقاعدہ مجھ سے مناظرہ کرنا چاہے گا۔ کوئی ہے، جو اس حرکت کا کوئی جواز، کوئی توجیہ پیش کر سکے؟“ ڈینش این جی او کا سر براہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ”ہم صرف اپنی آزادی اظہار کا حق استعمال کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، لیکن ہمیں یہ حق استعمال کرنے سے روکا جا رہا ہے۔“ شیخ دیرے سے مسکرائے۔ ”بات اگر صرف آزادی اظہار کی ہے، تو پھر اس پروگرام کا اتنا مزہ کٹ رکھ کر غریب مسلم طلبہ کو ان کے اظہار کی آزادی سے کیوں محروم رکھا جا رہا تھا۔ کیا آپ کے یہاں بولنے کی آزادی پر بھی لکٹ لگایا جاتا ہے؟ بہر حال، ان بچوں نے باقاعدہ قانونی طریقے سے اس آزادی اظہار کی قیمت ادا کر کے یہ حق آپ سے چھینا ہے، لیکن میں پھر بھی آپ کو بولنے کی اجازت دیتا ہوں۔ صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دیں۔ آپ کا تعلق کس مذہب سے ہے؟ عیسائی، یہودی، یا کسی اور فرقے سے؟“ این جی او کا سر براہ گڑبڑا سا گیا۔ ”ہم مذہبی شناخت کے بل پر کسی بھی برتاؤ کو تعصب سمجھتے ہیں۔“ شیخ الکریم نے ہال کی جانب دیکھا۔ ”سنا آپ لوگوں نے۔ یہ اپنے مذہب کی شناخت تک کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا کوئی دین ہی نہیں ہے۔ ان کا مذہب صرف پیسا ہے۔ آج مسلمان کم زور قوم ہے، تو یہ ہمارے نبی کا (نعوذ باللہ) تسخراڑانے کے لیے یہ خاکے بچ رہے ہیں۔ کل اگر ان کو کہیں سے زیادہ پیسے ملے تو یہ یہود و نصاریٰ کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ یہ کیا طرفہ قماش ہے بھائی۔ پہلے کوئی مذہب تو چن لو، اپنے اختیار کے لیے، تاکہ تم سے اُسی مذہب کی زبان اور دلیل سے بات کی جاسکے۔ ایک لادین سے اب میں کیا بات کروں؟ تم تو نہ عیسائی کو مانتے ہو، نہ موسیٰ کو، نہ داؤد کو، نہ سلیمان کو، نہ بدھ مت کے حامی ہو، نہ کسی گرو گرنٹھ کے پیروکار۔ اسماعیلی ہونہ ابراہیمی، آدم سے ہو یا ابلیس سے؟ کہاں سے تمہارا سر تلاش کر کے میں تم سے بات کی ابتدا کروں؟ اور اگر ان میں سے کسی کے بھی نہیں ہو، تو پھر تم صرف ایک بوسیدہ جسم ہو، بنا روح کے ایک مریض جسم، جس کے اندر ایک بیمار ذہن چل رہا ہے۔ اب تم جیسے مردوں سے بھلا کیا بات کروں؟“ ہال پر سناٹا طاری تھا۔ این جی او کا سر براہ تملمانے کے باوجود شیخ الکریم کی کسی بات کا جواب نہیں دے پایا۔ شیخ نے مسلمان طلبہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”جانتے ہو، ان مسلم طلبہ کی تعداد اس یونی ورسی میں کتنی ہے؟ صرف تین سو تیرہ، لیکن یہ تین سو تیرہ کا ہندسہ ہمارے مذہب کی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ کبھی موقع ملے، تو غزوہ بدر کے جاں نثاروں کی تعداد کسی مسلم اسکالر سے پوچھ لینا اور آج قدرت نے یہ خدمت یہاں کے تین سو تیرہ طلبہ کے حوالے کر رکھی تھی، جسے انہوں نے خوب نبھایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سیمینار کی ناکامی کے بعد بھی تم لوگ کہیں نہ کہیں یہ مذموم حرکت دہرانے کی کوشش ضرور کرو گے، لیکن یاد رکھنا کہ دنیا میں ہر جگہ ایسے تین سو تیرہ مجاہد تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ملیں گے۔ اگر مسلمان دہشت گرد اور جنونی ہوتے، تو آج یہاں سے اس ڈینش این جی او کا کوئی بھی فرد زندہ واپس باہر نہیں جاسکتا تھا، لیکن آج پھر میں اس میڈیا کے ذریعے تمام دنیا کو پیغام دینا چاہوں گا کہ ہم سے زیادہ مہذب اور روادار کوئی دوسرا نہیں۔ ہم اپنی روح کے قاتلوں کو بھی برداشت کرنا اور ان سے بات کر کے مسئلہ حل کرنا جانتے ہیں، لیکن ہمیں دیوار سے لگانے کی کوششیں اب ترک کرنا ہوں گی۔ و مایانا لا بلانغ.....“ شیخ نے بات ختم کی، تو ہال تالیوں کی گونج سے پھٹنے لگا۔

باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی اور شیخ نے بڑے دالان کے برقیے میدان ہی میں ظہر کی نماز کی جماعت کھڑی کروانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر نیویارک کے میڈیا نے یہ نظارہ بھی اپنی ٹی وی اسکرین کے ذریعے پورے امریکا کو دکھایا کہ کس طرح ہماری داغ دار جبینوں نے سفید کوری اور پاکیزہ برف پر بوسہ دے کر اپنے مقدس بھی اجلا لیے۔ ڈینش این جی او والے ناکام و نامراد یونی ورسی سے واپس لوٹ رہے تھے۔ ہم نے سلام پھیرا تو ہم سب ہی کے آنسو برف پر گر کر گرمی بن چکے تھے۔ فورڈ میرے انتظار میں ہوشیار کھڑا تھا اور اس نے مزید نفری بھی منگوائی تھی۔ لڑکے بے حد مشتعل تھے، لیکن میں نے ان سب کو میدان کی برقی فضا میں یکجا کیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وقت ہم ایک اعلیٰ ظرف دشمن کا برتاؤ کریں۔ یہ لوگ مجھے لیے بنا، یہاں سے نہیں جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میرے دوست اور دیگر طلبہ پر بھی کسی جنون کا الزام لگے۔ تم لوگوں کے پاس احتجاج کے اور بہت ذرائع موجود ہیں اور ابھی ہمیں ایک لمبی عدالتی جنگ بھی لڑنی ہے، لہذا اپنی پوری طاقت اُس وقت کے لیے بچا کر رکھو اور مجھے ہنتے چہروں کے ساتھ یہاں سے رخصت کرو۔“ وہ سب مزید افسردہ ہو گئے۔ میں نے سب سے پہلے شیخ الکریم سے اجازت طلب کی۔ ”میرے لیے دعا کیجیے گا، ابھی جنگ کی ابتداء ہے۔ میں اس کے اختتام تک ثابت قدم رہوں، اس کے لیے مجھے آپ کی دعاؤں اور رہنمائی کی ضرورت رہے گی۔“ انہوں نے مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ اسی طرح سُرخ روادار کامیاب رہو، جیسے تم آج رہے ہو۔“ ان کے بعد میں نے شمعون اور جارج کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔ ”پاگل ہوئے ہو کیا؟ آج تم نے ہمیں زندگی کا ایک نیا نظریہ دیا ہے۔ تمہارا شکریہ آیان۔“ پھر ایک، جینی، جم اور صنم کبیر قطار میں کھڑے تھے۔ ”دیکھو، کوئی نہیں روئے گا، کیوں کہ اگر میں رو پڑا تو تم سب ہی جانتے ہو کہ پھر مجھے چپ کرنا مشکل ہو جائے گا اور یہ بات بھی کسی سے چھپی نہیں ہے کہ میں روتے ہوئے بہت بُرا لگتا ہوں۔“ وہ سب مسکرا دیے اور سب نے مجھے اپنے اپنے طریقے سے رخصت کیا۔ ان سب کے بعد بسام اپنی بھیگی پلکیں پونچھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور میری فکر نہ کرنا۔ یاد ہے نا، ہم بچپن میں مٹی کو ستانے کے لیے کیا کہا کرتے تھے کہ جو ہمارے کھٹارا اپارٹمنٹ میں رہ لے، وہ دنیا کی کسی جیل میں بھی گزارہ کر سکتا ہے، تو یہ نیویارک کی جیل بھلا میرا کیا بگاڑ لے گی۔“ بسام روتے روتے مسکرا دیا۔ ”جلدی واپس آنا یا..... تم جانتے ہو، میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔“ میں اس کے بال سہلا کر آگے بڑھا اور تمام مسلم گروپ سے ملتا ہوا حرکت کرنے لگا۔ وہ سر جھکائے پریشان کھڑا تھا، میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”ہمت کرو، اب آگے تم ہی کو مسلم کاؤنسلر کی ذمہ داریاں نبھانا ہوں گی۔ گروپ کو یکسر نہ دینا۔“ برف باری تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ دُور کھڑے آفیسر فورڈ نے چلا کر کہا ”جلدی کرو مسلم کاؤنسلر..... ہمیں دیر ہو رہی ہے..... مجھے یقین ہے کہ نیویارک کی عدالت تمہیں کم از کم عمر قید کی سزا ضرور دے گی، تب تمہارے پاس جیل میں بہت سال ہوں گے، ان ملاقاتوں کے لیے.....“ میں نے اُس کی طرف دیکھا ”ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو، لیکن تم نے آج یہاں ایک آیان کو گرفتار کر کے مستقبل کے تین بڑا آیان پیدا کر دیے ہیں۔ بڑا گھانے کا سودا کیا تم نے مسٹر فورڈ۔“ سب سے آخر میں پُروا کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں پر جم رہے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی ”تم تو بڑے وعدہ خلاف نکلے آیان احمد۔ تم نے مجھے آج کیسے وسوسہ زلے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھو، شام بھی قریب آ رہی ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیے بتا ہی چلے جاؤ گے کیا.....؟“ میرا دل اندر سے کٹ کٹ گیا۔ ”میں نے آج تم سے ایک اور وعدہ بھی تو کیا تھا، ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ۔ اس فانی جسم کی حدوں سے آگے نکل کر روح کے ملاپ کا وعدہ۔ اور یقین کرو، میں یہ نیا وعدہ کبھی نہیں توڑوں گا۔“ پُروا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تمہاری ہر بات پر یقین کرتی ہوں آیان۔ اور میں جانتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن تم اپنا پچھلا وعدہ بھی ضرور پورا کرو گے۔ میں آج کے بعد اپنی زندگی کی ہر شام اُسی کیسے میں کھڑکی والی میز پر تمہارا انتظار کرتے ہتاؤں گی۔ جب تک تم واپس نہیں آ جاتے اور تب تک وہاں جتنے بھی محبت کرنے والے آ کر ملیں گے، دراصل وہ ہماری ہی وفا کی تجدید ہوگی۔ ہم اپنی نسل کے کل کے لیے اپنا آج قربان کر رہے ہیں آیان۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت ہماری یہ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جانے دے گی۔“

فورڈ کے اشارے پر پولیس کی گاڑیاں آگے بڑھ آئیں اور ایک پولیس افسر نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک کار کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ میرے دائیں بائیں دو پولیس والے بیٹھ گئے۔ فورڈ نے اگلی سیٹ سنبھال لی۔ لڑکے برقیے میدان میں پولیس کی کاروں کے ساتھ دوڑنے لگے۔ سب میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ دُور برقیے میدان میں بسام اور دیگر لڑکے اپنی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے اور ان سب سے الگ پُروا دم صم کی کھڑی، دُور جاتی کار کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ برف کا ایک گالا اس کی پلکوں میں انک کر اسی کے آنسوؤں کا حصہ بن گیا۔ کاریں تیزی سے برف کا میدان پار کر رہی تھیں اور رفتہ رفتہ میرے عقب میں دھند بڑھتی جا رہی تھی، میں نے آخری بار پلٹ کر ان سب کی طرف دیکھا اور پھر رفتہ رفتہ وہ سب نیویارک کے گھر کے کا حصہ بن گئے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور میرے دل نے کہا۔ ”الوداع..... اے میرے دوستو..... الوداع میری درس گاہ..... اے میرے ہم نفس..... الوداع.....“ (ختم شد)